حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۳

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیرنگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ

خطباتِ حکیم الاسلامؒ

جلد — ۳

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر - کراچی - پاکستان

معرفت باری تعالیٰ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿ اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ج فَاَخْرَجْنَـا بِـہٖ ثَـمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَاط وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ م بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْـوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ o وَمِـنَ الـنَّـاسِ وَالـدَّوَآبِّ وَالْاَنْـعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ ط اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُاط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

بجواب سپاس...... بزرگان محترم! ابھی آپ حضرات کے سامنے میرے ایک محترم بھائی نے دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے بزرگوں کی نسبت، نیز خود میرے متعلق جو کلمات ارشاد فرمائے (اس کے بارے میں عرض ہے کہ)۔ جہاں تک دارالعلوم اور اس کے بزرگوں کا تعلق ہے، یہاں تک یہ کلمات بالکل صحیح اور حق ہیں۔ دارالعلوم بھی بڑی جگہ ہے، اور وہاں کے اکابر و اساتذہ بھی بڑے لوگ ہیں، بڑے ہی تھے، بڑے ہی اب بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک انہوں نے میرے متعلق فرمایا یہ ان کا ایک حسن ظن اور نیک گمان ہے۔ خود میرے اندر کوئی ایسی اہلیت وصلاحیت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ان بزرگوں کے جیسے یہ لوگ خوشہ چین اور وہاں کے فاضل ہیں، اسی طرح کا میں بھی وہاں کا ایک فاضل اور خوشہ چین ہوں۔

دارالعلوم کی ترقی غیبی قوت کی مرہونِ منت ہے...... جہاں تک دارالعلوم کی ترقیات کا تعلق ہے تو اس پینتیس سالہ خدمت کے دوران ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ دارالعلوم کو چلانے والی کوئی غیبی طاقت ہے۔ یہ محض ایک تہمت ہے کہ فلاں مہتمم ہے۔ اس نے کوئی خدمت کی یا ترقی دی۔ یہ محض ایک راستہ اور وسیلہ کی بات ہے۔ ورنہ اس دارالعلوم کو بنانے اور چلانے والی ایک غیبی طاقت ہے، تہمت کے طور پر نام آجاتا ہے کہ فلاں مہتمم یا منتظم ہے۔ اس نے یہ کیا اور وہ کیا۔ حالانکہ اس نے جو کچھ واقع ہوا، وہ سبھی کچھ من جانب اللہ ہے۔

① پارہ: ۲۲ سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷-۲۸۔

کارِ زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　　مصلحت را تہمتے برآ ہوئے تو بستہ اند

فارسی کا شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے اور حقیقتاً محبوب حقیقی حق تعالیٰ ہیں۔کہ ’’تیری زلفوں کا اثر ہے کہ مشک میں سیاہی بھی اور خوشبو بھی پیدا ہوگئی۔تہمت کے طور پر نام رکھ دیا گیا۔کہ مشک ہرن کے اندر پیدا ہوتا ہے‘‘۔ہرن بے چاری کی کیا مجال تھی کہ مشک پیدا کرے۔اس کے اندر خون بھرا ہوا تھا۔خون جما کر سیاہ کر کے خوشبو پیدا کر دینا،اے اللہ! یہ تیرا کام ہے۔ہرن کا کام نہیں ہے۔نام ہرن کا لگ گیا کہ اس میں خون جم کر مشک بن گیا۔بنانے والا تو ہے۔ہرن بنانے والا نہیں ہے۔اسے یہ بھی خبر نہیں کہ میرے اندر کوئی خون بھرا ہوا ہے۔یہ بھی اسے پتہ نہیں کہ خون میں خوشبو کس طرح پیدا کی جا رہی ہے۔جب ہرن سے خوشبو نکلی،لوگوں نے کہہ دیا،ہرن میں سے خوشبو نکلی،حالانکہ ہرن بے چارے کو خبر بھی نہیں ہے کہ کہاں سے خون آیا ہے؟ کس طرح سیاہ ہوا؟ کس طرح اس میں خوشبو پیدا ہوئی؟

تو کہنے والے نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی مہتمم ہے۔اس کے زمانے میں ترقی ہوئی۔اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کس طرح ترقی ہوئی۔کس طرح سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔یہ محض ایک غیبی طاقت ہے جو چلا رہی ہے۔یہ تہمت کی بات ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔

حقیقت میں ایسے مخلص بزرگوں نے اس کی بنیاد رکھی کہ ان کے اخلاص کی برکت سے آج تک دارالعلوم چل رہا ہے۔تہمت ہم پر آ رہی ہے۔بلکہ ہماری برائی دارالعلوم کے سائے کے اندر دبی ہوئی ہے۔اصل خیر اس کی ہے۔چلانے والے نے اس زور سے پہیئے کو لڑھکایا تھا کہ وہ آج تک لڑھکتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ہمارا کام اس کو چلانا نہیں ہے۔ہم تو خود اس کے ساتھ لگے ہوئے اپنا کام بنا رہے ہیں۔ہمیں دین اور علم حاصل ہو رہا ہے۔یہ دارالعلوم کا طفیل ہے،نہ کہ دارالعلوم کو ہم بنا رہے ہیں اور نہ اسے چلا رہے ہیں۔اس کو چلانے والے نے ترقی دی ہے وہ غیبی طاقت ہے،جو چلا رہی ہے اور ان اہل اللہ کی برکتیں،جنہوں نے اخلاص پر اس کی بنیاد قائم کی،وہ چلا رہی ہیں۔

دارالعلوم کی روح معرفت خداوندی ہے......کس طرح سے انہوں نے بنیاد قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عارف باللہ تھے۔اللہ کی معرفت،اس کے کمالات کا جاننا اور اس کی پہچان ان کے قلوب کے اندر تھی۔اس معرفت اور پہچان کا ثمرہ تھا کہ انہوں نے دارالعلوم کو قائم کیا اور ان کی برکت سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔تو دارالعلوم کی اصل روح معرفت خداوندی ہے جس کے وہ لوگ حامل تھے جو ان کے اندر موجود تھی۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ’’رَأسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰہِ‘‘ ’’سب سے بڑا علم اللہ کی پہچان ہے‘‘۔

آپ پہاڑوں اور زمین کو پہچان لیں،اپنے گھر کو پہچان لیں،دنیا کے مور،تیتر کو پہچان لیں تو عارف نہیں کہا جائے گا۔اگر اللہ کی ذات وصفات کو پہچان لیں تو آپ کو عارف کامل اور عالم کہا جائے گا۔یہ بزرگ عارف باللہ تھے۔انہیں اللہ کی شان جلال و جمال کی پہچان تھی۔اس کی برکت تھی جو اتنا بڑا کام کر گئے کہ آج مشرق و مغرب

میں اس کا فیض پہنچ رہا ہے۔ساؤتھ افریقہ، ہندوستان سے آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں بھی ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ان کی برکت کا ظہور ہے اوران کی برکت معرفت الٰہی کے تابع تھی۔اس لئے اصل بنیادی چیز جو دارالعلوم کو چلا رہی ہے وہ معرفت خداوندی ہے۔غرض سب سے بڑا علم عالَم میں اللہ کی پہچان ہے اس کے لئے قرآن اترا،اسی کے لئے حدیثیں آئیں اسی کے لئے علماء کی جدوجہد ہے کہ اللہ کی پہچان حاصل ہو جائے۔

انسان خدا کو دلائل سے نہیں فطرت کے دباؤ سے مانتا ہے...... حق تعالیٰ کو پہچاننے کے طریقے قرآن کریم میں بیسیوں ذکر کئے گئے ہیں۔لیکن سارے طریقوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کی کچھ نشانیاں انسان کے اندر موجود ہیں، کچھ نشانیاں کائنات میں باہر موجود ہیں۔ جو ان کو پہچان لیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تعمیر کو دیکھ کر معمار پہچانا جاتا ہے۔لکھے ہوئے کو دیکھ کر لکھنے والا پہچانا جاتا ہے۔شعر کو دیکھ کر شاعر کی پہچان ہو جاتی ہے۔تو اتنی بڑی کائنات اور اتنی بڑی نشانیاں،انہیں دیکھ کر خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بنانے والا کوئی بہت بڑا ہے اور بڑی عظیم الشان ذات ہے۔جس نے اتنی بڑی کائنات بنا کر رکھ دی۔یہ کائنات از خود نہیں بنی۔ بلکہ ایک حکیم نے بنائی ہے جو اسے چلا رہا ہے۔ بہت سے دہریوں نے انکار کیا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کائنات از خود بن گئی۔ یہ بالکل جہالت ہے اور فطرت کے خلاف ہے۔دلیل سے آدمی اللہ کو نہیں پہچانتا۔ بلکہ دل پر ایک دباؤ ہے کہ مجبور ہو کر ماننا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ذات۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو اموی خلیفہ تھا۔اس کے دربار میں ایک دہریہ آیا، جو خدا کی ذات کا انکار کرتا تھا۔اس نے کہا میں نہیں مانتا کہ خدا موجود ہے۔ یہ کائنات طبعی رفتار سے خود بنی ہے اور خود ہی چل رہی ہے،لوگ مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں وغیرہ۔ یہ سب ایک طبعی کارخانہ ہے۔کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ یہ اس کا دعویٰ تھا اور اس نے چیلنج کیا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو میرے مقابلے میں لایا جائے۔تاکہ میں اس سے بحث کروں،لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اپنی طاقتوں کو خواہ مخواہ ایک غیبی طاقت کے تابع کر دیا ہے۔ جو سارے جہان کو چلا رہی ہے۔تو اس کے زمانے میں سب سے بڑے عالم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔مہدی نے امام صاحبؒ کے پاس آدمی بھیجا۔رات کا وقت تھا۔رات ہی کو خلیفہ کا دربار منعقد ہوتا تھا۔آدمی بھیجا کہ وہ آ کر اس دہریے سے بحث کریں اور اسے سمجھائیں اور راہ راست پر لائیں۔

چنانچہ آدمی پہنچا بغداد میں ایک بہت بڑا دریا ہے اسے دجلہ کہتے ہیں۔اس کے ایک جانب شاہی محلات تھے۔ایک جانب شہر،امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ شہر میں رہتے تھے۔اس لئے دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا۔اس آدمی نے کہا اصل میں دربار میں ایک دہریہ آ گیا ہے اور وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے، کائنات خود بخود چل رہی ہے۔آپ کو مناظرہ کے لئے بلایا گیا ہے۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا آپ جا کے کہہ دیں کہ میں آ رہا ہوں۔وہ آدمی واپس گیا اور کہا امام صاحب کو میں نے خبر کر دی ہے اور آپ آنے والے ہیں۔

اب دربار لگا ہوا ہے، خلیفہ، امراء، وزراء بیٹھے ہوئے ہیں اور دہریہ بھی بیٹھا ہوا ہے۔ امام صاحب کا انتظار ہے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں آ رہے۔ رات کے بارہ بج گئے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ندارد۔ دہریے کی بن آئی، اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ڈر گئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ کوئی بڑا فلسفی آیا ہے۔ میں اس سے نمٹ نہیں سکوں گا، اس واسطے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اور آپ یقین رکھیں وہ نہیں آئیں گے۔ میرے مقابلے میں کوئی نہیں آ سکتا۔ اب خلیفہ بھی متامل ہے۔ درباری بھی حیران ہیں اور دہریہ بیٹھا ہوا شیخی دکھا رہا ہے۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہنچے، دربار میں حاضر ہوئے خلیفۂ وقت نے تعظیم کی، جیسے علماء ربانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آئے؟ آدمی رات کے آٹھ بجے بھیجا گیا تھا۔ اب رات کا ایک بجا ہے۔ آخر اتنی تاخیر کی کیا وجہ پیش آئی؟ شاہی حکم تھا۔ اس کی تعمیل جلد ہونی چاہئے تھی نہ یہ کہ اس میں اتنی دیر لگائی جائے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک عجیب وغریب حادثہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے دیر لگی اور عمر بھر میں میں نے ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کیسا قصہ پیش آیا۔ اس شد ومد سے بیان کیا کہ سارا دربار حیران ہو گیا کہ کیا حادثہ پیش آ گیا فرمایا: بس عجیب وغریب ہی واقعہ تھا اور خود مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا قصہ تھا؟ جب سارے دربار کو خوب شوق دلایا اور سب سر تا پا شوق بن گئے۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین نے کہا کہ فرمایئے کیا قصہ پیش آیا؟ فرمایا: قصہ یہ پیش آیا جب میں شاہی محل میں اترنے کے لئے چلا ہوں تو دریا بیچ میں تھا دریا کے کنارے پر جو پہنچا تو اندھیری رات تھی، نہ کوئی ملاح تھا نہ کشتی تھی، آنے کا کوئی راستہ نہ تھا، میں حیران تھا کہ دریا کو کس طرح پار کروں۔ اس کشش وپنج میں کھڑا تھا کہ میں نے یہ حادثہ دیکھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود لکڑی کے نہایت عمدہ بنے بنائے تختے نکلنے شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ میں تحیر سے دیکھ رہا تھا کہ یا اللہ! دریا میں سے موتی نکل سکتا ہے، مچھلی نکل سکتی ہے۔ مگر یہ بنے بنائے تختے کہاں سے آئے؟ ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ اس سے زیادہ عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ تختے خود بخود جڑنے شروع ہوئے۔ جڑتے جڑتے کشتی کی صورت ہو گئی میں نے کہا یا اللہ! یہ کس طرح سے کشتی بن گئی آخر انہیں کون جوڑ رہا ہے کہ اوپر نیچے خود بخود تختے لگے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی میں اس حیرت میں تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے پیتل کی کیلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑ جڑا کے بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ میں حیرت میں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ تختے جو جڑے ہوئے تھے انکی درجوں سے پانی اندر گھس رہا تھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود ایک روغن نکلنا شروع ہوا اور ان درجوں میں وہ بھرنا شروع ہوا جس سے پانی اندر گھسنا بند ہو گیا۔

ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنی شروع ہوئی۔ اور کنارے پر آ کر ایسے جھک

گئی، گویا مجھے سوار کرنا چاہتی ہے، میں بھی بیٹھ گیا وہ خود بخود چلی مجھے لے کر روانہ ہوگئی۔ دریا کی دھار پر پہنچی پانی ادھر کو جارہا تھا کشتی خود بخود ادھر کو جارہی تھی۔ کیونکہ شاہی محلات ادھر کو تھے۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ! آخر پانی کے بہاؤ کے خلاف کون اس کو لے جارہا ہے؟ یہاں تک کہ شاہی محل کے قریب کنارے پر پہنچ گئی اور آکر جھک کر پھر کنارے پر کھڑی ہوگئی کہ میں اتر جاؤں، تو میں اتر گیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشتی غائب بھی ہوگئی۔ گھنٹہ بھر اس کنارے اور گھنٹہ بھر اس کنارے پر سوچتا رہا کہ یہ کیا قصہ تھا؟

یہ سانحہ تھا جس کی وجہ سے تحیر میں کئی گھنٹے لگ گئے اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا ماجرا تھا؟ اور میں امیر المومنین سے معافی چاہتا ہوں کہ آٹھ بجے بلایا گیا اور میں ایک بجے پہنچا ہوں۔ دہریے نے کہا، امام صاحب! میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بڑے عالم ہیں، بڑے دانش منداور فاضل آدمی ہیں۔ مگر بچوں کی سی باتیں کررہے ہیں۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ پانی میں سے خود بخود تختے نکل آئیں، خود ہی جڑنے لگیں، خود کیلیں ٹھک جائیں، خود ہی روغن لگ جائے، خود آکے کشتی اپنے آپ کو جھکا دے، آپ اس پر بیٹھ جائیں اور خود ہی لے کے چل دے، خود ہی وہ کنارے پر پہنچا دے۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے دانش مند، فاضل اور عالم ہیں۔ امام آپ کا لقب ہے اور باتیں کررہے ہیں آپ نادانوں اور بچوں جیسی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بخود بن گئی، کوئی کیلیں ٹھونکنے والا نہیں، خود بخود ٹھک گئیں کوئی روغن بھرنے والا نہیں، خود ہی بھر گیا کوئی چلانے والا ملاح نہیں، خود ہی چل پڑی۔ کوئی سمجھانے والا نہیں، خود ہی سمجھ گئی کہ مجھے شاہی محل کے اوپر جانا ہے۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟

امام صاحب نے فرمایا اچھا! بات نادانی اور بے وقوفی کی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! فرمایا: ایک کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہ سکے، بغیر چلانے والے کے چل نہ سکے، بغیر کیلیں ٹھونکنے والے کے اس کی کیلیں ٹھک نہ سکیں، اور یہ اتنا بڑا جہان جس کی چھت آسمان ہے، جس کا فرش زمین ہے، جس کی فضا میں لاکھوں جانور ہیں۔ یہ خود بخود بن گیا، خود ہی چل رہا ہے سورج بھی، چاند بھی خود ہی چل رہے ہیں۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ ایک معمولی کشتی جسے انسان بنا سکتا ہے۔ یہ تو بغیر بنانے والے کے نہ بنے اور اتنا بڑا جہان جو انسان کے بس میں نہیں وہ خود بخود بن جائے تو تمہاری عقل بچوں جیسی ہے یا میری عقل بچوں جیسی ہے؟ میں نادان ہوں یا تم نادان ہو؟

مناظرہ ختم ہوگیا اور بحث تام ہوگئی اور دہریہ اپنا سا منہ لے کر واپس ہوگیا اب کیا بحث کرے جو اس کی بنیاد تھی وہ ساری ختم ہوگئی۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا وجود اور اس کی پہچان دلائل کی محتاج نہیں ہے بلکہ قلب کے اندر خود بخود فطرت کہتی ہے کہ اس جہان کا ہے کوئی بنانے والا انسان کے قلب پر فطرت کا دباؤ ہے۔ ایک بچہ اور غیر مسلم وہ قلب میں اس چیز کا دباؤ محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس نے کسی کالج میں نہیں پڑھا، کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ مگر دل میں دباؤ محسوس کرتا ہے۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں تمنائیں کرتے ہیں اور ہزاروں کام کرتے ہیں لیکن کامیابی سو میں سے ایک میں ہوتی ہے۔ ننانوے میں ناکامی ہوتی ہے۔ تو کون سا انسان چاہتا ہے کہ میں ناکام ہو جاؤں؟ کون چاہتا ہے کہ میں دوکان پر بیٹھوں اور مجھے خسارہ ہو؟ نفع ہی کی خاطر بیٹھتا ہے۔ لیکن بہت سی جگہ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ خسارہ دینے والا اور خلاف مرضی چلانے والا کون ہے؟

انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، بیس بیس برس گزر جاتے ہیں، دوائیں کرتا ہے دعائیں کراتا ہے، نہیں ہوتی، بعضے چاہتے ہیں کہ ہمارے اولاد نہ ہو، بلکہ برتھ کنٹرول کا سسٹم جاری کرتے ہیں کہ اولاد بند ہو جائے اور جب سے برتھ کنٹرول کی دوائیں شروع کیں، جب سے اولاد زیادہ پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ غرض آدمی چاہتا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ہوتی چلی جا رہی ہے، چاہتا ہے کہ ہو مگر بیس بیس برس گزر جاتے ہیں نہیں ہوتی۔ ایک چاہتا ہے کہ نفع ہو، مگر خسارہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک کو لاکھوں روپے کا نفع ہو رہا ہے۔

آخر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ سب سے برتر مخلوق انسان ہے۔ جب اس کا کیا ہوا پورا نہیں ہوتا تو گدھے اور گھوڑے تو اس سے نیچے کی چیز ہیں، درخت اور پتھر اس سے نیچے کی چیز ہیں۔ جب انسان اپنے ارادے میں عاجز ہے تو اور چیزوں کا کیا کہنا؟ جب برتر مخلوق بھی عاجز ہے۔ تو ضرور کوئی قوی اور طاقت ور ذات موجود ہے۔ کوئی اوپر کی طاقت ہے جو انہیں چلا رہی ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہو، مگر نہیں ہوتیں، گھٹتا بھی ہے، پریشان بھی ہوتا ہے۔ لیکن لاکھ پریشان ہو جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں موت کا اندیشہ ہوتا ہے تو دوائیں کرتے ہیں، غذائیں کھاتے ہیں، تفریح کرتے ہیں آب و ہوا بدلتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو بادشاہ، نواب لکھ پتی سب مجبور ہیں۔ اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچا کرتی تو امیر آدمی ایک نہ مرتا سارے بے چارے غریب مرا کرتے، جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ ہوتا اور بادشاہ تو مرنے کا نام ہی نہ لیتا خزانے کا منہ کھول دیا کرتا کچھ ملک الموت کو، کچھ انکے فرشتوں کو رشوت دے دی اور اپنی جان بچالی تو دولت مند کوئی نہ مرتا۔ لیکن سب مرتے ہیں، چاہتا کوئی نہیں، پھر مرتے ہیں۔ پھر آخر کون ہے جو موت دینے والا ہے؟ کون ہے جو مرضی کے خلاف زندگی چھیننے والا ہے؟ اپنی مرضی سے ہم دنیا میں آئے بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جائیں گے بھی نہیں۔ جب آنا ہوتا ہے تو آنے پر مجبور ہیں، جب جانے کا وقت آتا ہے تو جانے پر مجبور ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ مجبور کے لئے کوئی نہ کوئی جابر ہونا چاہئے جو جبر کر رہا ہے اور اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔

ہم مخلوق ہیں۔ خود ہم نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا جب مخلوق ہیں تو مخلوق ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی خالق ہو جس نے ہمیں مخلوق بنایا ورنہ ہم خود خالق بنیں، مقہور ہیں تو قاہر کی خبر ملتی ہے۔ مرزوق ہیں تو کسی رازق کا پتہ چلتا ہے۔ تو ہر ہر قدم پر انسان اللہ کو اور اسکی شانوں کو پہچاننے پر مجبور ہے اور اس کو دلائل سے نہیں پہچانتا بلکہ اس کی ہستی

میں واقعات وحوادث ہیں جو اس کو ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔

عقل سے خدا کو مانا جاتا تو فلاسفر عارفین کاملین ہوتے...... باقی دلائل تو ہم خود واقعات سے بنا لیتے ہیں۔ دلائل پر خدا کا وجود موقوف نہیں ہے۔ اگر دلائل پر موقوف ہوتا، تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں، وہی خدا سے بعید ہیں اس لئے معرفت باری تعالیٰ کا دارومدار عقل اور دلائل پر نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکے وجود پر سو دلیلیں قائم کی تھیں، بڑی پکی اور فلسفیانہ مضبوط دلیلیں تھیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ کیونکہ سو دلیلیں میں نے ایمان کے اوپر قائم کی ہیں۔ بلکہ بے پڑھا لکھا آتا تو اسے حقارت سے دیکھتے کہ اس کا ایمان کیا ہے؟ ایمان تو میرا ہے کہ میں نے دلیلوں کے زور سے اللہ کو ایک سمجھا ہے۔ ان جاہلوں کو پتہ ہی کچھ نہیں۔ یہ تو محض تقلیدی طور پر مانتے ہیں۔

ایک دفعہ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کھیت پر چلے جا رہے تھے۔ کھیت کا ایک کاشت کار سامنے آ گیا کاشت کار بیچارہ بے پڑھا لکھا، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ کون ہو؟ اس نے کہا مسلمان ہوں۔ پوچھا، مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا جو یہ کہے کہ اللہ ایک اور رسول برحق، آخرت حق، وہ مسلمان ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مسلمان تو ہے۔ مگر تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے؟ دیہاتی نے کہا۔ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تو کوئی دہریہ آ گیا ہے۔ لاٹھی لے کے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے ہو لیا کہ ٹھہر جا تجھے بتلاؤں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے آگے اور دیہاتی پیچھے پیچھے کہا کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگتا ہے؟ ارے مسلمان نے خدا کو دل کے یقین سے پہچانا ہے نہ کہ دلیل سے، دلائل کے پیر لکڑی کے ہوتے ہیں لکڑی آگ میں بھی جل جاتی ہے، پانی میں بھی بہہ جاتی ہے۔ ہوا میں بھی اڑ جاتی ہے۔ تو دلیلوں پر خدا کا وجود نہیں خدا کا وجود دل کے یقین پر ہے اور یقین اللہ ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے کہ میں ہوں اور میری شانیں برحق ہیں۔

قرآن کریم نے مشاہدات وواقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے...... اسی واسطے قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے خدا کے وجود کو نکالو اس چیز کو دیکھو اور اس سے خدا کو سمجھو۔ اسی کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مجھے یاد آیا ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: میں نے شہتوت کے پتے سے پہچانا اس طرح کہ شہتوت کا پتہ بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نکلنا شروع ہو جاتا ہے، ابریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو ایک پتہ ہے کہیں مینگنی نکلی، کہیں مشک نکلا، کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت ایک کام کر سکتی ہے، دس کام نہیں کر سکتی

اس کی طبیعت کے اوپر کوئی بنانے والا ہے کہ کبھی یہ بنادیا، کبھی وہ بنادیا میں نے اس حقیر سے پتے سے خدا کے وجود کو سمجھا۔ اگر آدمی سمجھنا چاہے تو ایک پتے سے خدا کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیھم السلام ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں، رات دن معجزے دکھلائے ابوجہل کو نہیں سمجھنا تھا، مرتے دم تک نہیں سمجھا ابولہب کو نہیں ماننا تھا، آخر تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبر نے عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے۔ جس نے مانا، تو کوئی صدیق بنا، کوئی فاروق بنا۔ جس نے نہیں مانا کوئی ابوجہل رہ گیا، کوئی ابولہب رہ گیا۔ معلوم ہوا جب آدمی نہیں ماننے پر آتا تو پیغمبر بھی نہیں منوا سکتے اور ماننے پہ آتا ہے تو شہتوت کے پتے سے خدا کو پہنچان لے۔

امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا: ہاں الحمد للہ اس نے کہا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ فرمایا، جو اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اس نے کہا، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے۔ اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر یہ ارشاد فرماتے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا وہ جاہل نہ سمجھ سکتا۔ اسی کے انداز پر اسے سمجھایا فرمایا میں جو خدا کے وجود کو سمجھا ہوں ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں۔ میں نے دنیا میں ایک محل دیکھا کہ وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں نہ کہیں درز، نہ سوراخ، نہ کوئی روشن دان، کچھ بھی نہیں۔ اس محل کے اندر ایک سونے کا محل بنا ہوا ہے۔ اس میں بھی کوئی در دیوار اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ دو محل بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں نہ کوئی اندر کی چیز باہر جا سکتی ہے اور نہ باہر سے اندر جا سکے حتیٰ کہ ہوا کا بھی گزر نہیں، ایک محل باہر ہے اور دوسرا اس کے اندر ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک جاندار نکلا پیدا ہوتے ہی بچہ نادان ہوتا ہے۔ مگر اس نے وہ کام شروع کیا جو تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اس سے میں سمجھا کہ اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے جس نے اسے اندر تیار کر دیا ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ خدا کی ذات ہے۔

لوگوں نے عرض کیا حضرت! یہ چاندی کا محل جسے آپ دیکھ کے آئے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا اور چاندی کے محل میں سونے کا ایک اور محل ہو یہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ آخر آپ اس محل کو دیکھنے کس دنیا میں گئے تھے۔ فرمایا یہ تمہارے ہاں بھی موجود ہے۔ لوگوں نے کہا ہم نے تو نہیں دیکھا فرمایا، تم آنکھ بند کر لو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ یہ تو تمہارے گھر میں بھی موجود ہے۔

فرمایا: کیا تم نے کبھی انڈا نہیں دیکھا؟ وہ چاندی کا ایک محل ہے اس میں جو زردی ہے۔ وہ سونے کا محل ہے، کوئی دروازہ نہیں نہ اندر کی چیز باہر آئے، نہ باہر کی چیز اندر آئے۔ مرغی لے کر اسے بیٹھ گئی اچانک اکیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا، اور اس بچے نے وہی کام کرنے شروع کیے۔ حالانکہ نہ وہ کسی اسکول میں گیا، کوئی ڈگری اس نے نہیں پائی، ماں سے تربیت اس نے نہیں پائی۔ مگر جس طرح اماں دانہ چگتی ہے، وہ بھی چگنے لگا، جس طرح وہ بولتی ہے، اسی لغت میں اس نے بھی کلام کرنا شروع کر دیا۔

تو انسان کے بچے کو جب تک مکتب میں نہ بٹھائیں مادری زبان کی بھی جب تک کتاب نہیں پڑھے گا۔ وہ ادیب وشاعر نہیں بنے گا اور دوسری زبانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ خود مادری اور ملکی زبان جب تک اس کو کتابی صورت میں نہ پڑھے، پڑھا لکھا نہیں سمجھا جا سکتا تو ایک انسان بغیر سیکھے زبان نہ بولے اور سیکھنے کے لئے اس کو بیسیوں ملکوں کا سفر کرنا پڑے کہیں جاکے دوسری زبان سے واقف ہو۔ اور یہ سونے چاندی کے محل میں سے ایک بچہ کڑ کڑ کرتا ہوا نکلا اور اس نے وہی کام کرنا شروع کیا، جو اس کی ماں کر رہی ہے۔

گویا وہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ اس محل میں آخر اس کو کس نے پڑھایا لکھایا ہے، کس نے اس کو سمجھایا کہ تو نے اس طرح بولنا ہے اور کس نے وہ طریقہ بتلایا کہ انڈے سے باہر نکلتے ہی دانہ چگنا شروع کر دینا یہ تعلیم کس نے دی؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا۔ ﴿رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ ① ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس میں ہدایت ڈال دی کہ تو یہ کام کر''۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ علم کی بات الگ ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانے کی خواہش، سونے کی خواہش۔ یہ بلا کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے۔ جس نے دل میں راہنمائی کی ہے اور وہ وہی اللہ کی ذات ہے۔ جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ دل میں آتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے

اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے کہ

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

دل میں تو ہر انسان کے ہے کہ بے شک کوئی جابر ہستی ہے۔ جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ سمجھنا چاہے تو اس کی ذات بڑی بلند و بالا ہے۔ ہماری سمجھ کے احاطے میں نہیں آ سکتی ہے تو اکبر کہتا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ نہیں آتا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

تو جو دل میں آ جائے، سمجھ میں نہ آئے۔ بس خدا کی ذات کی یہی پہچان ہے۔ ورنہ جو چیز دل میں آتی ہے۔ پہلے آدمی اسے سمجھ جاتا ہے۔ ایک خیال ہمارے دل میں آیا پہلے ہم اس کو سمجھ گئے تو ایک نظریہ ہمارے دل میں پیدا ہوا، ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کا وجود دل میں آتا ہے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کیا ہے۔ انسان عاجز ہے مگر ماننے پر مجبور ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے..... بالکل اسی طرح سے جیسے آپ موجود ہیں اور آپ کے اندر روح بھی موجود ہے۔ بدن کی تربیت اندر روح ہی کر رہی ہے۔ یہ بدن کے اوپر جو سرخی اور چہرے کے اوپر ترو تازگی ہے، یہ روح ہی کا اثر ہے۔ اگر روح نکال دی جائے تو بدن مرجھا کر، کملا کر، پژمردہ ہو کر

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰۔

تین دن کے اندر مٹی میں مل جاتا ہے۔ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آگ آگ میں مل جاتی ہے۔ تمام شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کو روح نے جوڑ رکھا ہے۔ لیکن آج تک آپ نے روح کو دیکھا نہیں مگر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ضرور ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی کس طرح سے ہے؟ آج تک آپ نے اپنی روح پر کوئی دلیل قائم نہیں کی، کہ کوئی فلسفی یوں کہے کہ یا تو دلیل سے بتاؤ میرے اندر روح ہے۔ ورنہ میں نہیں مانتا کہ میرے اندر روح ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا ایک بھی دلیل نہ ہو۔ آپ ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر نہیں مانتے پھر آپ کو زندہ کہنا مشکل ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ میں مردہ ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ زندہ ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟ کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ ہر شخص موجود ہے، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ میں روح موجود ہے؟ دلیل تو نہیں۔ ہم کہیں گے آپ نے کبھی روح کو دیکھا؟ جواب یہ ہوگا کہ کبھی نہیں روح کی شکل وصورت کیسی ہے؟ معلوم نہیں۔ مگر ہے ضرور۔ تو دلیل ایک نہیں، دیکھا بھی نہیں پھر روح موجود ہے۔ تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ آدمی اسے بلا دلیل مانتا ہے اور خدا کی ذات کو نہ مانے، یہ حیرت کی بات ہے؟

جب ہمارا بدن بغیر روح کے نہیں ٹھہر سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے، جس کے پیر زمین ہے۔ یہ اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے۔ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے۔ وہ چلا نہیں رہی اور تدبیر نہیں کر رہی؟ غرض جس طرح سے آپ روح کے ماننے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح سے پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی کے بدن کے اندر گھسایا جائے کہ بھئی ذرا دیکھ کر آؤ روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے۔ دل میں یا دماغ میں ہاتھ پیر میں، اس کا مقام کہاں ہے؟ پھر اس سے پوچھو کہ بھئی کیا دیکھا؟ وہ یوں کہے گا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، روح کا جلوہ نظر آتا ہے مگر اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ روح وہاں بیٹھی ہے یا یہاں بیٹھی ہے۔ جہاں جہاں بھی بدن موجود ہے وہیں وہیں روح موجود ہے۔ حتیٰ کہ بال، ناخن، آنکھ میں بھی موجود ہے۔

اور جس طرح ہمارے بدن میں ہماری روح ہے۔ جو سمت وجہت سے بھی پاک ہے اور اشارے سے بھی بری ہے اس طرح سے کائنات کی روح اعظم اللہ رب العزت کی طرف بھی اشارہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں یا وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سمت وجہت سے بری اور اشارہ سے بری مگر کائنات کے ذرے ذرے میں ان کا جلوہ موجود ہے۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ① ”تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تمہارے ساتھ ہے۔“ ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ ② تم ایک جگہ تین ہو تو چوتھا خدا موجود ہے اور اگر پانچ ہو تو چھٹا خدا

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۴۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۷۔

موجود ہے۔ زیادہ ہو یا کم، مگر خدا وہاں موجود ہے اور پھر بھی اشارے سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہے اللہ میاں۔ اس لئے کہ اتنے لطیف ہیں کہ بدن سے بھی پاک ہیں، صورت سے بھی پاک ہیں۔ تو جب ان کی بنائی ہوئی ایک مخلوق یہ شان رکھتی ہے کہ اس کو اشارے سے نہیں بتا سکتے کہ یہ ہے تو اللہ کی ذات تو کہیں بڑی و بالا ہے۔ روح کی آج تک آپ نے شکل دیکھی؟ نہیں دیکھی ہوگی اور آپ کہتے ہیں کہ روح کی کوئی شکل نہیں۔ اللہ رب العزت بھی شکل سے بری و بالا ہیں۔ روح کا آپ نے کبھی رنگ دیکھا؟ کہ زرد یا کالی ہے؟ یہ گورے کالے کا فرق جو ہے، یہ تو بدن سے چلتا ہے روح سے نہیں چلتا۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت پر نہیں...... اسی لئے جو روحانی لوگ ہیں، ان کے ہاں کالے گورے کا فرق کوئی نہیں، وہاں تو روح کی چمک اور نورانیت دیکھی جاتی ہے۔ چمڑی کسی کی کالی ہو یا سفید ہو۔ یہ اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ وہ انسان خطا پرست ہوگا جو حقیقت کو چھوڑ کر محض چمڑی کو دیکھے حقیقت پسند انسان کی نظر کبھی چمڑی کے اوپر نہیں ہوتی کبھی صورت پر نہیں ہوتی وہ سیرت کو دیکھتا ہے

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سیاہ فام ہیں، موٹے موٹے ہونٹ ہیں کوئی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے۔ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے اجلاء صحابہ جو قریش کے سردار تھے، انہوں نے کہا، ''بِلَالٌ سَيِّدُنَا وَمَوْلَانَا'' ① بلال رضی اللہ عنہ ہمارے سردار اور آقا ہیں۔ ان کے لئے سب کی بیٹیاں حاضر ہیں۔ اگر وہاں کالے اور گورے کا فرق ہوتا تو گورے رنگ کا کوئی بیٹی دینا پسند نہ کرتا۔ مگر اسلام نے یہ سارے فرق مٹا دیئے اسلام کہتا ہے کہ صورت کو نہ دیکھو، سیرت اور حقیقت کو دیکھو شکل وصورت اور رنگوں کو مت دیکھو یہ تو آنی جانی اور اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ یہ ظاہری شکلیں چندروزہ ہیں۔ اصل سیرت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے۔ اور صورت کو آپ کتنا ہی بنالیں مگر صورت بگڑنے کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بنتی نہیں، یہ بگڑتی ہی ہے۔ اللہ بھلا کرے بخار کا۔ تین دن بخار آجائے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو رنگ وروغن، غذائیں کھا کے مہینوں میں پیدا کیا تھا۔ بخار نے تین دن میں ختم کر دیا۔ اور بخار بھی نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں، بڑھاپا آ کے ساری صورت کو چوق موق کر دیتا ہے نہ رنگ رہتا ہے نہ سفیدی۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں موت آ کے ساری صورت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اس لئے صورت بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے آپ کہاں تک بنائیں گے؟ کہاں تک اس کی خدمت کریں گے؟ جتنی خدمت کریں گے جب بگڑنے پہ آئے گی بیماری بگاڑ دے گی کوئی فکر لگ گیا اس سے بگڑ جائے گی بڑھاپا بگاڑ دے گا، موت بگاڑ دے گی اس لئے جو صورت بگڑنے کیلئے پیدا ہوئی اس کے بنانے سنوارنے میں وقت لگانا، وقت ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ تھی اور بہت سے مرید اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے اور شیخ ان

---

① تفسير ظلال القرآن، پارہ: ۳۰، سورة عبس، ج: ۷، ص: ۴۶۱.

کی تربیت کرتے تھے۔ایک شخص نیا مرید آیا اور بیعت ہوگیا۔اس نے اللہ اللہ کرنی شروع کی۔ابھی اللہ اللہ نے دل میں اثر نہیں کیا تھا۔بالکل نو آموز اور مبتدی تھا۔وہ بھی اپنے ذکر وشغل میں لگا۔شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ ان کے گھر سے کھانا پکا ہوا آتا تھا۔گھر میں ایک باندی تھی۔وہ کھانا ہر ہر حجرے میں بانٹ جاتی تھی۔یہ جو نئے مرید پہنچے تو معمول کے مطابق باندی انہیں کھانا دینے آئی۔باندی ذرا قبول صورت تھی۔ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق ومحبت کا جذبہ پیدا ہوا۔اب جب وہ آتی،تو کھانا رکھ لیتے مگر اسے گھورنا شروع کرتے۔شیخ کو پتہ چل گیا کہ سیکھنے تو اللہ اللہ آئے ہیں اور باندی سے عشق بازی اور آنکھ لڑانا شروع کردی۔انہوں نے علاج کیا۔مگر اہل اللہ کے ہاں علاج زبان سے نہیں ہوتا،وہ تو ڈھنگ ایسا ڈالتے ہیں کہ خود بخود علاج ہوجائے۔شیخ نے جب دیکھا کہ اس آدمی کے اندر عشق پورا اثر کرگیا ہے اور بجائے اللہ اللہ کرنے کے یہ باندی باندی پکارتا ہے،بجائے اللہ کے مشاہدہ کرنے کے باندی کی صورت میں الجھ گیا ہے،اس کا علاج کرنا چاہئے۔علاج یہ کیا کہ کسی ڈاکٹر سے دست آور دوا منگوائی اور اس باندی کو کھلادی اس کو دست آنے شروع ہوئے،تو اس کے لئے ایک جگہ مقرر کردی کہ یہاں بیٹھ کے استنجاء سے فارغ ہو۔صبح سے شام تک اس کو خوب دست آئے اور شام کو یہ کیفیت ہوگئی کہ ناک پکڑیں تو اس کا دم نکلے نہ رنگ رہا،نہ روغن رہا۔ہڈی کو اس کا چمڑا لگ گیا۔اس کی صورت بالکل بھیانک ہوگئی۔اس کے بعد اس سے کہا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے جا اور جو وہ معاملہ کرے مجھے اطلاع کرنا وہ کھانا لے کے پہنچی چلا جاتا نہیں تھا۔پاؤں لرز رہے ہیں زرد رنگ،ہڈیاں نکلی ہوئیں،صورت اس کی بری ہوگئی۔اب وہ کھانا لے کر آئی۔یا تو یہ صاحب انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے کہ باندی آئے تو اسے گھوروں اب جو آئی اور اس کی شکل دیکھی۔تو انہیں بڑی نفرت ہوئی۔منہ پھیر کے کہا رکھ دے کھانا۔چلی جا جلدی یہاں سے۔وہ بے چاری چلی گئی۔شیخ نے پوچھا،اس نے کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا حضرت! آج تو یہ معاملہ کیا کہ دیکھنا تو بجائے خود ہے۔اس نے تو نفرت سے منہ پھیر کے مجھے کہا کہ جا جلدی یہاں سے،رکھ دے کھانا۔میری طرف دیکھا بھی نہیں۔فرمایا،''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' علاج ہوگیا۔

شیخ تشریف لائے،انہوں نے اس مرید سے کہا،ذرا میرے ساتھ تشریف لایئے ان کی انگلی پکڑی اور وہ جو قدمچہ تھا،جہاں باندی فارغ ہوئی تھی۔نجاست اس میں بھری ہوئی تھی فرمایا۔یہ آپ کا معشوق ہے۔اسے اٹھا کے لے جایئے اور بڑی حفاظت سے رکھئے اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔آپ کو پاخانہ سے محبت تھی۔جب تک یہ باندی میں تھا آپ کو عشق رہا۔جب یہ نکل گیا،آپ کا عشق ختم ہوگیا تو باندی سے عشق نہیں تھا،اس گندگی سے تھا۔اس اپنے معشوق کو لے جایئے اور صندوق میں بڑی حفاظت سے رکھئے اور اس کی زیارت کیا کیجئے اس دن مرید کی سمجھ میں آیا کہ:

عشق صورت عاقبت ننگے بود

صورتیں عشق کے لئے نہیں ہیں،سیرت عشق کے لئے ہے۔صورت تو بگڑنے والی چیز ہے،صورت درحقیقت ایک گندگی ہے۔گندگی جب تک رہتی ہے صورت باقی ہے۔یہ نکل جائے تو صورت ختم ہوجاتی ہے لیکن

سیرت ہر حالت میں موجود ہے۔ اگر اچھی سیرت علم اور کمال ہو تو دنیا میں رہے گا جب با کمال، قبر میں جائے گا جب با کمال، حشر میں پہنچے گا جب با کمال اور صورت یہاں کہیں بھی ساتھ نہیں ہوگی۔ سیرت ہی سیرت انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے انسان کا یہ فرض ہے کہ اپنی سیرت بنانے کی فکر کرے نہ کہ صورت بنانے کی فکر میں رات دن لگا رہے۔ یہ تو بگڑنے والی ہے۔ ایک نہ ایک دن بگڑے گی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک تابعی ہیں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ یہ غلام تھے اور حبشی تھے، سیاہ رنگ تھے، صورت اچھی نہیں تھی۔ لیکن علم اتنا بڑا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ’’مَـا رَأَیْـتُ اَفْـضَـلَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ ‘‘ ① ’’میں نے اپنی عمر میں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی شخص عالم، افضل، برتر اور کامل نہیں پایا‘‘ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس کی تعریف کریں سمجھ لیجئے وہ شخص کس درجے کا ہوگا، کس درجے کا عالم ہوگا، تو علم اتنا بڑا کہ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے عاشق اور صورت کالی کلوٹی۔ اس لئے اسلام نے صورت پر مدار نہیں رکھا سیرت پر مدار رکھا ہے کہ اندرونی حقیقت درست ہونی چاہئے۔

انسان سیرت سے اشرف المخلوقات ہے صورت سے نہیں...... اور بھائی صورت کا تو یہ ہے کہ صورت ہمیشہ فتنوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے اور عزت و بلندی پیدا کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ ہم اور آپ خوبصورت نہیں ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی۔ قرآن کریم میں موجود ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ نے حسن و جمال کو پیدا کیا، تو آدھا حسن پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا تو کتنے بڑے حسین و جمیل تھے۔

مصر کی بیگمات جب جمع ہوئیں اور ان کی صورت مبارک دیکھی تو کہا۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ② یہ کوئی انسان بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ اتنا حسن و جمال تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام جہاں جہاں مصیبتوں میں گرفتار ہوئے صورت کی خوبصورتی نے انہیں گرفتار کرایا، کنعان کے کنویں میں ڈالے گئے، حسن و جمال سبب بنا، بھائیوں نے حسد کیا اور کنویں میں ڈال دیا۔ قافلہ نکال کے لے گیا اس نے مصر کے بازار میں بیچ دیا۔ غلام بنے تو صورت کی وجہ سے بنے۔ زلیخا عاشق ہوگئی اور اس کی وجہ سے نو برس جیل میں رہنا پڑا۔ ان سب کا باعث صورت کی خوبصورتی تھی اور جب مصر کی سلطنت کا وقت آیا خود فرمایا ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ③ اے بادشاہ مصر! ملک میرے سپرد کر، میں انتظام کر کے ملک چلا کے دکھاؤں گا زمین کے خزانے میرے حوالے کر۔ اس کی یہ وجہ بیان نہیں کی ’’اِنِّیْ حَسِيْنٌ جَمِيْلٌ‘‘۔ مصر کی سلطنت میرے سپرد کردے، اس واسطے کہ میں بہت خوبصورت ہوں، بلکہ یہ فرمایا، ﴿اِنِّیْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ ④ ’’اس

① علل الترمذی، ج: ١٢، ص: ٤٩٢. ② پارہ: ١٢، سورۃ یوسف، الآیۃ: ٣١.

③ پارہ: ١٣، سورۃ یوسف، الآیۃ: ٥٥. ④ پارہ: ١٣، سورۃ یوسف، الآیۃ: ٥٥.

واسطے کہ میں علم والا ہوں' مجھ میں ملک چلانے کی قوت وصلاحیت موجود ہے۔غرض جب فتنے میں پڑنے کا وقت آیا تو صورت اس کا باعث بنی اور جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو سیرت آگے بڑھی تو سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔صورت ترقی ورفعت اور بلندی کا باعث نہیں ہے۔

جیسے آپ خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت پھرتے ہیں۔مور کتنا خوبصورت ہے،اس کے اوپر کیسے عمدہ عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے۔کئی کئی رنگ اس کے پروں کے اندر ہوتے ہیں۔کتنا حسین وجمیل ہوتا ہے بہت سے درندے بھی ایسے ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔شیر کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کھال ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے بہت اعلیٰ قسم کا کمبل اوڑھ کر آیا ہے۔رنگ الگ ہوتے ہیں نقش الگ ہوتے ہیں۔آپ تو نقل اتار کے ایسا کمبل بناتے ہیں۔اس کے پاس قدرت کا بنا ہوا موجود ہے تو جانوروں کی کیسی عمدہ عمدہ کھالیں، پرندوں کے کیسے عمدہ عمدہ رنگ،ان سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ اگر خوبصورتی باعث ترقی ہوتی۔تو انہیں اشرف المخلوقات بنا دیا جاتا۔یہ آخر آپ ہی کو کیوں دعویٰ ہے؟اور آپ ہی کے بہت سے بھائی بند ہیں۔صورت کے لحاظ سے کم رتبہ ہیں۔لیکن تقویٰ وطہارت کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی کوئی بھی تعریف نہ کرتا عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تعریف نہ کرتے اس لئے کہ صورت کالی کلوٹی تھی لیکن سیرت سامنے تھی۔اس لئے ان کی بڑی عظمت وبڑائی کی جاتی تھی۔معلوم ہوا صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔سیرت سے آدمی آدمی بنتا ہے۔خوب کہا ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ

گر بصورت آدمی انساں بدے   احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

اگر صورت کی وجہ سے آدمی آدمی بنتا،تو ابوجہل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ایک درجے کے ہی ہوتے، کیونکہ اس کی صورت بھی آدمیوں جیسی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل بھی انسانوں جیسی ہے۔لیکن سیرت دیکھی جاتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت عرش سے اوپر پہنچی ہوئی ہے اور ابوجہل کی سیرت تحت الثریٰ کے اندر پہنچی ہوئی ہے۔سیرتوں کے لحاظ سے زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔صورت کے لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں اس لئے کہتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے   احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

ز بروں چوں گور کافر پر حلل   وز اندروں قہر خدائے عزوجل

باہر سے دیکھو تو ایک کافر کی قبر کو دیکھو۔اس کے نقش ونگار بنے ہیں۔اس پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، پھول پڑے ہوئے ہیں اور اندر جا کے دیکھو تو عذاب خداوندی بھرا ہوا ہے۔تو صورت اگر اچھی ہو،مگر اندر اخلاق اچھے نہ ہوں،علم کا کمال نہ ہو،معرفت الٰہی نہ ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کافر کی قبر اس کے اوپر اچھی اچھی چادریں پڑی ہوئیں

ہیں۔ اندر خدا کا قہر پڑا ہوا ہے۔ اس لئے آدمی سیرت سے آدمی بنتا ہے۔ صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔

اہل سیرت کو ہی تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے ...... دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں مل کر خاک ہو گئے کوئی جاننے والا بھی نہیں۔ لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں۔ آج تک ان کے نام کے ساتھ آپ عظمت کے الفاظ بولتے ہیں۔ عظمت سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے ہیں۔ صحابہ کرام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''رضی اللہ عنہم اجمعین'' کہتے ہیں۔ اولیاء کا ذکر آتا ہے آپ ''رحمتہ اللہ علیہم اجمعین'' کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی صورتیں موجود نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی کالا تھا، کوئی گورا تھا، کوئی زرد رنگ کا تھا، کوئی سرخ رنگ کا تھا تو رنگ کا کوئی پتہ نہیں۔ لیکن نام لینے میں آپ آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سیرت سامنے ہے۔ ان کا علم وکمال سامنے ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا نام آجائے، عقیدت سے آپ گردن جھکا دیں گے، ان بزرگوں کی شان میں اگر کوئی ادنیٰ گستاخی کرے، آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ہم یہ گستاخی نہیں سن سکتے، محبت وعظمت آج تک قلوب میں موجود ہے۔ حالانکہ وہ ہستیاں سامنے نہیں ہیں۔ ان کی سیرت اور علم وفضل ہی ہمارے سامنے ہے۔

صاحب! سیرت ہی خلافت خداوندی کا مستحق ہے ...... اس لئے اصل بنانے کی چیز علم ومعرفت اور اخلاق وکمالات الٰہیہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں تشریف لائے، وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے انبیاء کا یہ موضوع نہیں ہے۔ وہ سیرت بنانے کے لئے آئے ہیں کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو، دلوں کے اندر محبت الٰہیہ پیدا کرو انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بننے کے لئے آیا ہے۔ خلیفہ وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے اوصاف آجائیں ایک شاعر اسی کو خلیفہ بنائے گا جس کے اندر شعر کہنے کا مادہ آجائے ایک بڑھئی اس کو خلیفہ بنائے گا جو بڑھئی کے فن کے اندر ماہر ہو۔ ایک میاں جی جو لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کراتا ہے۔ لڑکوں میں سے اس کو خلیفہ بنائے گا جو قرآن مجید کا حافظ ہوگا۔ اللہ میاں اپنا خلیفہ اس کو بنائیں گے۔ جس میں اللہ میاں کے اخلاق پیدا ہو جائیں گے، اللہ کے علوم وکمالات پیدا ہو جائیں گے۔ اللہ میاں کی نیابت وخلافت شکلوں پر نہیں ہے وہ سیرت پر ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے گا وہ خلیفہ اور نائب الٰہی بن جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین کی عظمت آپ کے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ ان کی صورتوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ آج بھی اگر آپ کسی عالم سے محبت رکھتے ہیں یا اس کی عظمت کرتے ہیں یا اس کو سر پر بٹھاتے ہیں، اس کے چہرے مہرے کی وجہ سے نہیں بٹھاتے یہ جان کر کہ اس کے اندر علم کا مادہ موجود ہے، اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اور علم یہ درحقیقت اللہ کی چیز ہے کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں نہ علم ہے، نہ اخلاقی کمالات ہیں۔ یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔ نونو برس محنت کرتے ہیں۔ جب آدمی عالم بن کے آتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کیلئے خانقاہیں بنتی ہیں، شیوخ کے ہاں رہتے ہیں۔ مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن کوئی مدرسہ ایسا بھی قائم ہوا ہے۔ جس میں جہالت بھی سکھلائی جاتی ہو اور آپ بچے کو داخل کر دیں کہ صاحب اس کو جاہل بنادو۔ یا دنیا میں کوئی خانقاہ ایسی ہے کہ آپ بچے کو وہاں داخل کر کے کہیں کہ صاحب! ذرا اسے بداخلاق بنا دیجئے ہم آپ کو تنخواہ دیں گے۔ بداخلاقی کے لئے کوئی خانقاہ نہیں اس لئے کہ بداخلاق تو پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ حاصل کرنے کی چیز علم ہے نہ کہ جہالت وہ تو پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت اٹھانی چاہئے علم واخلاق پیدا کرنے کے لئے نہ کہ صورت بنانے کے لئے نہ کھال کو اجلا کرنے کے لئے یہ چیزیں تو من جانب اللہ جسے ملتی ہیں مل جاتی ہیں۔

انسانوں کا جوہر ایک ہے تفوق بلحاظ سیرت ہے جو امر اختیاری ہے......اسی واسطے قرآن کریم نے ایک اصول ارشاد فرمایا ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (۱) اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام ان دو سے ساری اولاد چلی۔ سب کے سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی سانولا، کوئی اجلا، کوئی سیاہ فام، کوئی سفید فام۔ یہ آدم کی اولاد ہیں۔ خاندان اور قبیلے ہم نے بنائے تاکہ دنیا میں پہچان سکو، کہ یہ فلاں کی اولاد ہے، یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ تاکہ احکام جاری ہو سکیں کہ یہ فلاں کی اولاد ہے۔ لہٰذا میراث کا یہ مستحق ہے، دوسرا نہیں۔ وراثت اسے ملے گی، دوسرے کو نہیں ملے گی۔ تو خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔ خاندان اس لئے نہیں ہیں کہ تم شیخیاں بناؤ کہ میں شیوخ میں سے ہوں اور میں سادات میں سے ہوں اور یہ نیچ ہے، میں اونچ ہوں (مراد اعلیٰ وادنیٰ)، اسلام نے ان سب چیزوں کو مٹا دیا۔

فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔ ہاں اونچ نیچ تم میں ہے۔ مگر یہ اختیاری ہے جس کا جی چاہے نیچ بن جائے۔ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (۲) ''جو تم میں زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے ہاں زیادہ باعظمت ہے''۔ جس میں تقویٰ اور طہارت کم ہے وہ اللہ کے ہاں کم وقعت ہے اور تقویٰ حاصل کرنا یہ انسان کا اختیاری فعل ہے۔ تو متقی بن کے جس کا جی چاہے باعزت بن جائے فاسق وفاجر بن کے جس کا جی چاہے ذلیل بن جائے۔ خلقی طور پر جوہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اونچا ہے، کسی کا جوہر نیچا ہے۔ فرمایا: ''اَنْتُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ'' (۳) تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا، لہٰذا تم سب کا جوہر مٹی ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی انسان سونے

---

(۱) پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔ (۲) پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔

(۳) السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۳، ص: ۳۲۰، رقم: ۴۴۵۲۔ حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۱ ص: ۱۱۶ رقم: ۵۱۱۶۔

سے بنا ہے، کوئی مٹی سے بنا ہے اور کوئی لوہے سے بنا ہے اور کوئی پیتل سے، لہٰذا ان کے اندر فرق ہے۔ بلکہ سب مشت خاک ہیں۔ جب ہمارے باپ ہی خاک سے پیدا کئے گئے تو ہم میں چاندی کہاں سے آ جاتی ہے۔ اور مٹی کا کام کیا ہے؟ مٹی جتنا نیچے رہے گی با عظمت رہے گی۔ جتنا اونچا اڑے گی ذلیل ہوگی اگر مٹی اوپر چڑھ کے آنکھوں میں پڑی، تو آپ لعنت بھیجیں گے۔ کپڑوں پر پڑی تو دامن جھٹکیں گے کہ کمبخت کہاں سے آ گئی جب تک جوتیوں میں پامال رہے گی با عظمت رہے گی اور جہاں اس نے اوپر اڑنا شروع کیا، لوگوں نے لعنت بھیجنا شروع کی۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہے...... اس لئے آدمی بھی وہ بہتر ہے جس میں خاکساری عجز و نیاز اور تواضع ہو۔ جو بڑا بنے گا اور ابھر کر شیخی لگائے گا، تو یہ ایسا ہے جیسے مٹی آنکھ میں پڑ گئی۔ تو لوگ لعنت بھیجیں گے جو ابھرے گا اسے پست کر دیں گے، جو شیخی بگھارے گا اسے نیچا دکھایا جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ۔ ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ'' (1) ''جو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اللہ اس کو بلند کرتا ہے'' اور جو خود بلند ہوتا ہے اسے پٹخ دیتا ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست ‌ ‌ ‌ ‌ اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو خود ابھرتا ہے اسے پٹخ دیتے ہیں اور جو خود گر جاتا ہے اسے ابھار دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے، نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے شیخی بگھارے اور یوں کہے کہ یا اللہ! میں نے نماز پڑھی میں نے روزہ رکھا، گویا میں نے بہت بڑا کام کیا۔ معاذ اللہ: میں نے گویا آپ کے اوپر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کام کیا؟ طاقت تیرے اندر ہم نے دی، ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا، اسباب ہم نے مہیا کئے تو نے کیا کیا؟ اور اگر بندہ نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے سب کچھ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ جتنا میں نے کیا، تیرا فضل و کرم تھا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں تھی۔ تو نے سب کچھ کیا۔ غرض جو یوں کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا اسے بلند کرتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا اور جو یوں کہتا کہ میں نے کیا۔ تو میں کے گلے چھری پھیر دی جاتی ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا یہ تو سب کچھ ہمارا کیا ہوا ہے۔ اصل چیز انسان میں یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میں عاجز ہوں اور ہے بھی بات یہی۔

اس لئے کہ اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ان کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اگر آپ ان کا شکر ادا کریں گے تو وہ بے شمار اور بے حد نہیں ہو سکتا۔ آپ خود محدود ہیں دماغ محدود ہے، عقل اور طاقت محدود ہے۔ محدود ہو اور لامحدود افعال کیسے انجام دے دے؟ تو نعمتیں لامحدود ہیں اور شکر محدود ہے۔ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ آدمی شکر ادا کر کے یوں کہے اے اللہ! میں عاجز ہوں، میں شکر ادا نہیں کر سکتا تیری نعمتیں بے شمار ہیں

---

(1) المصنف لابن ابی شیبہ ج: ۸، ص: ۱۷۹، رقم: ۹۔ حدیث حسن ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب لا فضل لاحد علی احد ج: ۳ص: ۴۰۴۔

اور میرے اندر طاقت کی کمی ہے۔ تو عاجز ہونے کا اظہار کرنا، اپنے عجز کو مان لینا اللہ کے ہاں یہی پسند ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ۔ ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① ''اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو'' داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! بے شک میرا فرض ہے میں شکر ادا کروں گا۔ کیونکہ جب آپ کا حکم ہے میں تعمیل کروں گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا شکر ادا کروں تو کس طرح کروں؟

اس واسطے کہ جب نعمتوں پر شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے، تو توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس کا شکر ادا کروں گا۔ تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، پھر وہ ایک نعمت ہوگئی۔ تو پہلے اس کا شکر ادا کروں تو ہر شکر سے پہلے شکر نکلتا ہے اس لئے میں تو شکر کی ابتداء نہیں کر سکتا۔ شکر کروں تو کس طرح کروں میں تو بالکل عاجز ہوں میرے بس میں نہیں ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔

اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو شکر ادا کرنے سے عاجز ہے۔ تو یہی شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنا عجز مان لو، اپنی ناتوانی تسلیم کر و کون ہے جو ہمارا شکر ادا کرے اور ہماری طاعت کا حق ادا کر دے، فرض ادا کر کے یہ کہنا کہ کچھ نہیں ہوسکا۔ بس یہی ادائیگی شکر ہے کہ اپنی ہار مان لو۔ اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا اور یہ تواضع نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا فضل اگر دستگیری نہ کرے تو ہماری نجات بھی نہیں ہوسکتی عمل بھی قبول نہیں ہوسکتا۔ یہ ہماری نمازیں ان کے اندر کیا رکھا ہے؟ وسوسے بھرے ہوئے، خیالات بھرے ہوئے۔ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی ہیں یا اولیاء اللہ کی۔ مگر یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ وہ قبول کرلے اور اپنے فضل و کرم سے قبول کرتے ہیں ہمارے عمل کے اندر کوئی جان نہیں ہے۔

مدارِ نجات فضل خداوندی ہے...... اور نجات بھی فضل سے ہے حدیث میں ہے کہ۔ ''لَنْ يُّنْجِيَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهٗ'' ''تم میں سے کسی کو بھی تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ کا فضل نہ ہو''۔ ②

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے اس میں پچھلی امتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک عابد تھا جو رات دن اللہ کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر بہرحال جب آدمی دنیا میں رہتا ہے تو کھانے پکانے کی بھی ضرورت ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بھی ہے، رشتہ دار بھی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان میں بھی مشغولی ہوتی ہے۔ اس عابد کو یہ بھی ناگوار تھا کہ اتنی دیر بھی بیوی بچوں میں کیوں لگے؟ یہ وقت بھی اللہ ہی کی عبادت میں لگنا چاہئے تو اس نے یہ کیا کہ بیوی، بچے، رشتہ دار، مال، جائیداد کو ترک کر کے سمندر کے بیچ میں

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳.

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ، ج: ۲۰ ص: ۹۹ رقم: ۵۹۸۲.

ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا کہ بس اب میں فارغ ہوگیا ہوں اور چوبیس گھنٹے اللہ کے ذکر میں مشغول رہوں گا۔ اس زمانے میں یہ چیز جائز تھی۔ اسلام نے اس چیز کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن پچھلی امتوں میں رہبانیت یعنی گوشہ گیری کرنا اور پہاڑوں پر چلا جانا، یہ جائز تھا۔ یہ بھی پہنچ گیا اور ایسی جگہ پہنچا کوئی آدمی وہاں نہ پہنچ سکے۔ سمندر اور اس کے بیچ میں ایک ٹیلہ تھا۔ اس پر جا کے بیٹھ گیا اور ایک چھپر ڈال لیا اللہ نے فضل کیا۔ اسی پہاڑ کے ٹیلے پر ایک انار کا درخت اُگ آیا اور اس پر میٹھے انار لگنے لگے اور اسی کڑوے پانی کے اندر اس پہاڑ میں سے اللہ نے ایک چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھا لیا، ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے نماز میں مشغول نہ رات کو سونا نہ دن کو کہیں جانا۔ دن بھر نماز، رات بھر نماز پانچ سو برس اس نے اسی طرح گزارے۔ اور یہ عبادت بھی خالص اس لئے کہ وہاں دکھلاوا کس کو ہوتا۔ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہرت اور نام آوری مقصود نہیں تھی۔ وہاں کون نام سننے والا تھا۔ تن تنہا یہ بندہ اور اس کا خدا۔ تو خالص عبادت اور پانچ سو برس۔

پانچ سو برس گزر کر جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے نماز پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں موت دیجئے اور میرے اس بدن کو سجدے کی حالت میں قیامت تک محفوظ رکھئے تاکہ قیامت تک میں تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں کم سے کم سجدہ کرنے والے کی صورت ہی بنی رہے۔ تو میری لاش سجدے کے حالت میں قیامت تک محفوظ رہے۔ یہ دعا قبول ہوگئی۔ اور حدیث میں ہے کہ اس کو عین سجدے کی حالت میں موت آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج تک اس کی لاش سجدے میں محفوظ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں اس کی پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے! میں نے اپنے فضل و کرم سے تجھے بخشا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطاء کیا۔ تو ابدالاباد تک کے لئے اب چین میں رہ۔ اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ۔ یہ میرا مقبول بندہ ہے۔ میں نے اس کو اپنے فضل و کرم سے نجات دی۔

اس عابد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی۔ بیوی، بچے، رشتہ داروں اور مال و دولت میں نے چھوڑا اور اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا کم سے کم میری تسلی کے لئے کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دے دی۔ تو نے گھر بار چھوڑا تھا۔ تیرے اس عمل کے طفیل نجات دے دی۔ تو ذرا میرا دل خوش ہو جاتا کہ میرے عمل کی کچھ قدر کی اتنی میں نے محنت کی، ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا گویا میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ ایک وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کی کھٹک کو جانتے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① ”سینوں میں جو خیالات ہیں ان کو بھی جانتے ہیں“۔

اس لئے ملائکہ سے فرمایا، جنت کی بجائے اس عابد کو جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۴۔

لیکن اتنی دور جہنم سے کھڑا کرو جہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، اس کو وہاں پہنچایا گیا، وہاں جو جہنم کی ایک لو اور لپٹ آئی ہے تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہوگیا اس کو کانٹے چبھنے لگے اور پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ جہنم کا ایک جھونکا لگتے ہی اس کی ساری روح خشک ہوگئی۔ حدیث میں ہے ہے کہ ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اسے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا خدا کے لئے مجھے پانی دے۔

جواب یہ ملا، آواز آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے، مگر اس کی قیمت ہے۔ اس عابد نے پوچھا کیا قیمت ہے؟ کہ پانچ سو برس کی عبادت جو خالص کی ہو۔ وہ اگر قیمت میں ادا کردی جائے تو یہ پانی کا کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ اور وہ جلدی سے پیش کردی کٹورا لے کر پیا تو کچھ دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ اس عابد کو لوٹا کے لاؤ اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے، تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم چھوٹ گئے۔ تو نے پانچ سو برس عبادت کی تھی۔ اس کی قیمت ایک کٹورا پانی تجھے مل گئی اور وہ قیمت تو نے خود تجویز کی۔ ہم نے نہیں کی تو نے ہی کہا کہ میں پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں اور کٹورا خریدتا ہوں۔ اس لئے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے ہم ادا ہوئے۔ معاملہ برابر سرابر ہوگیا۔

اب ان لاکھوں کٹوروں پانی کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا اور وہ جو دنیا میں تو نے لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں۔ ایک ایک دانے کا حساب دے ان کے بدلے میں کتنے سجدے، کتنے رکوع کیے کتنی عبادتیں کیں؟ اور دانہ پانی تو الگ ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھتا تھا، ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا ہے؟ اور نگاہ تو الگ ہے۔ یہ جو تو سانس لیتا تھا۔ جس کے ذریعے زندگی قائم تھی۔ ایک ایک سانس کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو بدن میں ہم نے جان دی تھی۔ جس نے پانچ سو برس زندگی رکھی اور تو نے عبادت کی۔ اس طاقت کا حساب دے۔ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا اور ہواؤں کو تیری طرف متوجہ کیا جس سے تو سانس لیتا تھا۔ اور جو ہم نے اپنے سورج کو گرمی بخشی جس نے تجھ تک گرمی پہنچائی، جس سے تیرا بدن قائم رہا۔ ان سب چیزوں کا حساب دے۔ ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے جو فائدہ اٹھایا، اب سب کا حساب دے۔ کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

عابد بے چارہ تھرا گیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ! بے شک نجات تیرے فضل ہی سے ہوتی ہے۔

بندے کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی تو کل قیمت یہ ہے کہ پانچ سو برس کے عمل کے بدلے ایک کٹورا پانی مل گیا۔ اور وہ بھی آپ نے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ یوں فرماتے کہ کٹورا اسے ملے گا۔ جس نے ایک لاکھ برس عبادت کی ہے۔ میں تو اس سے بھی محروم رہ جاتا۔ تو نے قیمت اتنی رکھی جو میں ادا کر سکا یہ بھی تیرا ہی فضل ہے۔ اس لئے نجات فضل سے ہوتی ہے، عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل علامت فضل ہے...... مگر بھئی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے ہی نماز تو صفر اور گھر بیٹھ گئے کہ جب نجات فضل سے ہوگی، پھر عمل کی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر فضل ہونا ہوگا، ہو جائے گا اور جس پر نہیں ہوگا نہیں ہوگا ہم کیوں محنت اٹھائیں؟ یہ خیال مت کرنا۔ بے شک فضل سے ہی نجات ہوگی لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ ہم پر فضل متوجہ ہے بھی یا نہیں؟۔ اس کی علامت عمل ہے۔ عمل جو کر رہے ہیں وہ اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہے عمل کو چھوڑ دینا اس کی علامت ہوگی کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔ دنیا میں جب فضل متوجہ ہوتا ہے، تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتیوں کی صورت میں صلہ ملے گا یہاں بھی فضل، وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل کا نہیں ایمان کا صلہ ہے...... البتہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو کہ جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے جس سے ایمان پہچان لیا جائے ورنہ اصل میں ایمان کا بدلہ جنت ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صراف کی دوکان پر جائیں اور ایک ہزار روپے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپیہ دیا، اس نے سونا دے دیا اور آپ لے کے چلے آئے۔ پہلے اسے پرکھتے ہیں کہ اصل بھی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک پتھر ہوتا ہے، اس پر گھسا کر دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر سفید چمک دار لکیریں پڑیں، یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے تو آپ ہزار روپے دیدیں گے، سونا لے لیں گے اور اگر میلی اور ٹیالے رنگ کی لکریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوٹا ہے۔ آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صراف کو ہزار روپیہ دیا۔ یہ ہزار روپیہ کیا ان لکیروں کی قیمت تھی۔ جو پتھر پر کھینچی گئیں یا سونے کی قیمت ہے؟۔ یہ سونے کی قیمت تھی، لکیروں کی نہیں تھی۔ وہ تو علامت تھیں، جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت جو ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں۔ عمل کی لکیریں ہوں گی جن سے ایمان کے کھرے کھوٹے ہونے کو پرکھا جائے گا عمل اچھے ہیں، تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان بھی اچھا تھا۔ لہٰذا اس ایمان کی قیمت جنت ادا کر دی جائے گی۔ اگر عمل برے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان میں کمی تھی، کھوٹ تھا۔ لہٰذا بدلہ پورا نہیں مل سکتا اس لئے بدلہ جو ملے گا وہ عمل کا نہیں، ایمان کا ملے گا ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا، تو میں نے اور آپ نے پچاس برس مثلاً عمل کیا۔ تو بس پچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے پکڑ کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہوگیا۔ جنت میں جو آپ ابدالآباد رہیں گے یہ عمل کا بدلہ نہیں اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا۔ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا۔ اور جب آدمی مرتا ہے تو یہ عزم لے کے جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں گا، تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو ایماندار ہی ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایمان چونکہ ابدی چیز ہے۔ اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا عمل ابدی چیز نہیں ہے۔ اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں۔ ظاہر میں بے شک عمل سے جنت ملی، مگر ایمان نہ ہو، کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی معلوم ہوا عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ہو، تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی۔ لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے۔ اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں ہے، بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے، ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بنانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت..... اس کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو منوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں اور وہ دلائل فلسفیانہ نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی چیزیں پیش کی ہیں کہ ان میں غور کرو، تاکہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ یہ جو آیت میں نے پڑھی یہ بھی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا: ﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ ① ''اے مخاطب! تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا''۔

پانی کی طبیعت یہ ہے کے نیچے کی طرف جائے۔ اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا پانی نیچے سے ابلنا چاہئے۔ زبردستی آپ نکالتے ہیں۔ ورنہ اسے نیچے جانا چاہئے۔ یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا کہ وہاں سے پانی کو گرانا شروع کیا۔ تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کو نہ ہم بادلوں پر لے کر گئے نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ کوئی بڑی ذات ہے جس کے حکم سے وہاں پہنچ گیا اور طبیعت کے خلاف اسے وہاں جانے پر مجبور کیا۔ اس لئے اللہ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔

پانی آ کر زمین میں جذب ہوا، پھر زمین سے پھل، غلے، ترکاریاں اور سبزیاں اگنا شروع ہوئیں۔ ﴿فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا﴾ ② ہم نے اس کے ذریعے پھل نکالے، ان پھلوں کے نکالنے والا کون ہے؟

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷.

کاشت کار نے اگر بیج ڈال بھی دیا، تو منوں مٹی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے کونپل کو نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی؟ یا ہمارے آباؤ اجداد نکالنے گئے تھے؟ کاشت کار زیادہ سے زیادہ بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ خبر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ زمین کے اندر اس بیج کو توڑنا پھوڑنا، اس میں سے کونپل بنا کے نکال دینا، یہ اللہ ہی کا کام ہے۔ پھر یہ کونپل ایسی نرم و نازک چیز ہے کہ آدمی اسے انگلیوں سے مسل دے، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن طاقت وراتنی ہے کہ زمین کو پھاڑ کر نکل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کر دی کہ وہ منوں مٹی کو چیر پھاڑ کر اوپر آ گئی۔ جب کہ اس کی طبیعت نیچے جانے کی تھی۔ گھاس کو آپ اوپر کو اچھالئے اوپر نہیں جائے گی نیچے کو آئے گی۔ یہ اس کی طبیعت کے خلاف نیچے سے اوپر کی طرف چڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کو نیچے اتارنا، اوپر چڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا کہ بیج پھٹا، اس میں سے کونپل نکلی۔ منوں مٹی کے اندر سے اس نے زمین کو چاک کیا اور اوپر آ کے اپنا چہرہ دکھلایا کہ میں آ گئی ہوں۔ یہ سارے کام کرنے والے، بجز حق تعالیٰ کے اور کون ہیں؟

اور آگے دلیل یہ بیان کی کہ۔ ﴿مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا﴾ ① ہر پھل کے رنگ الگ سیب دیکھو اور رنگ، آم دیکھو اور رنگ، انگور دیکھو اور رنگ بلکہ اب تو ہر نوع کے اندر خدا جانے کتنی اقسام اور کتنے رنگ ہیں۔ سیب کی بہت سی اقسام اور بہت الوان۔ اس طرح آم کی بے شمار اقسام۔ انگور کی بھی اقسام ہیں رنگ بھی مختلف ہیں۔ حالانکہ جنس ایک ہے اور مزے مختلف ہیں۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ② حالانکہ سب کی اصل زمین ہے۔ زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں اور رنگ سب کے مختلف۔ اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلا کرتی ہے۔ یہ مختلف رفتار سے کام کوئی پھل، کوئی پھول، کوئی، پیلا، کوئی نیلا، کوئی سرخ، کوئی کالا۔ یہ بجز حق تعالیٰ کے کون کر سکتا ہے؟ اور فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ یہ سلسلہ صرف پھلوں ہی کا نہیں بلکہ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ﴾ ③ پہاڑوں کو دیکھو تو کوئی سفید، کوئی نیلے رنگ کا، کوئی کالے رنگ کا، کوئی سبز و سرخ رنگ کا۔

یہ جو بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے آیت پڑھی۔ وہ آج کے سفر سے یاد تازہ ہوئی پہاڑوں کے بیچ میں سے نکل کر آ رہے تھے کہ کوئی پہاڑ نیلے رنگ کا سامنے آ گیا، کسی میں سرخی جھلک رہی ہے، کسی میں گلابی رنگ، کسی میں کالی مٹی، کسی میں سے کوئلہ نکل رہا ہے۔ تو پہاڑوں کے اتنے مختلف رنگ۔ اگر یہ پہاڑ کی خاصیت ہوتی تو ایک ہی رنگ کے پہاڑ بنتے۔ یہ رنگ کیسے پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فاعلِ مختار ہے۔ جو ان کے اندر اپنی مرضی سے رنگ بھرتا ہے۔ خود پہاڑ اپنی طبیعت سے پیدا نہیں کرتے۔ پھر کالے بھی معمولی رنگ کے نہیں، بلکہ فرمایا،

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷. ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴.

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷.

﴿وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ﴾ ① گاڑھے رنگ کے کالے اَسْوَدٌ غَارِبٌ اسے کہتے ہیں، جس کے اندر بڑی گہری سیاہی ہو، دولفظ ہیں، غَرَابِيْبُ اور سُوْدٌ یعنی انتہا کی سیاہی۔ تو پہاڑوں سے کوئلہ نکلتا ہے۔ جو انتہائی سیاہی ہے۔

پھر فرماتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو تو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے رنگ کے، تتر ون میں سیاہ رنگ کے، چین اور جاپان میں زرد اور پیلے رنگ کے۔ ہندوستان میں دیکھو تو بوقلموں۔ کہیں کالے، گورے، سب گڈ مڈ مختلف رنگوں کے انسان ملیں گے۔ اگر انسان کی طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کچھ کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھرنے والا موجود ہے، کوئی خالق موجود ہے۔ جیسا اس نے چاہا ویسا کر دیا۔ اور فرماتے ہیں انسانوں ہی کی کیا بات ہے۔ چوپایوں کو دیکھو، ان میں بھی رنگ مختلف ہیں۔ ہزاروں چوپائے مختلف رنگ کے ہیں۔ شیر زرد رنگ کا، ہرن سیاہ رنگ کا، ہرنی پیلے رنگ کی، بگلا سفید، کوا سیاہ، تیتر سبز، مور ست رنگا، ہر جانور درندے، چرندے، پرندے سب کے رنگ الگ اور رنگوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اسی طرح ایک ہی نوع میں مختلف رنگ ہیں۔ گائے میں سفید رنگ کی بھی کالی بھی، سرخ رنگ کی بھی اور سفید بھی اور چت کبری بھی ہوتی ہے۔ بکریوں اور اونٹوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر یہ حیوانی طبیعت کا تقاضا تھا، ایک رنگ ہوتا۔ یہ دس رنگ کیوں ہیں؟ پہاڑ کی طبیعت کا تقاضا ایک رنگ کا تھا، یہ پچاس رنگ کیوں ہیں؟ بجز اس کے کہ اس کو مانا جائے کہ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنے والی ذات وہ ہے، جس کو ہمہ قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ جس کو جیسا چاہے رنگ دے دے۔ جس کو جیسا چاہے بنا دے۔ تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ پھر انسانوں میں اختلاف ہے، چہرے کا اختلاف، صورتوں کا اختلاف۔ یعنی کروڑوں انسان آج بھی موجود ہیں۔ اربوں گزر گئے ہیں، اربوں آنے والے ہیں۔ ایک کا نقشہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اللہ کا اتنالا محدود عمل ہے کہ ہر انسان کی شکل جدا کر دی۔

پھر فرق پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کی ناک وہاں لگا دیتے، کسی کے یہاں لگا دیتے، کسی کے کان آگے ہوتے، کسی کے کان پیچھے ہوتے۔ کان، ناک وہیں ہیں جہاں ہونے چاہئیں، آنکھیں وہیں ہیں۔ اس کے باوجود فرق موجود ہے۔ غرض رنگوں کا اختلاف الگ، صورتوں اور نقشوں کا اختلاف الگ ہے۔ پھر زبانوں کا اختلاف الگ ہے۔ ایک جانور مثلاً طوطا ہے۔ اس کو دیکھیں عرب کا ہو، ہندوستان کا ہو، ترکستان کا ہو، کسی ملک کا ہو اس کی زبان ایک ہی ہوگی یا بلبل ہے ہندو کا ہو، سندھی کا ہو، ایک ہی بول بولے گا۔ مرغ ہے وہ بھی ایک طرح بولے گا۔ لیکن انسان ہے کہ بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ مشرق، امریکہ، افریقہ، ہندوستان، انگلستان، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ سب کی الگ الگ زبان ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اس وقت اصولی طور پر ایک سو بیس

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔

زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ ہر صوبے کی زبان الگ الگ ہے۔ پنجابی، سندھی، مدراسی، مراد آبادی، بلوچستانی وغیرہ۔ ہر ایک کی زبان الگ۔

پھر ہر زبان میں فرق ہے۔ دہلی والوں کی اردو اور ہے، لکھنو والوں کی اور ہے، بہار کی اور طرح کی، یوپی کی اور طرح کی۔ انسان عجب چیز ہے کہ زبانوں کا اختلاف بے حد و بے حساب ہے۔ دنیا کی زبانیں گنیں تو ہزاروں کی تعداد نکلے گی۔ اگر انسان کی جبلّت کا تقاضا عربی وغیرہ تھا۔ سارے انسانوں کی ایک ہی زبان ہوتی۔ یہ کسی کی عربی، کسی کی ترکی۔ بتلانے والے نے بتلایا۔ یہ میری قدرت ہے کہ میں قلوب کو ہدایت دیتا ہوں کہ اس طرح بولو تم تھوڑا ہی زبانیں سکھلاتے ہو۔ ماں کے پیٹ سے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ماں باپ ایک ایک لفظ تھوڑا ہی سکھلاتے ہیں۔ وہ خود ہی بولتا ہوا اٹھتا ہے تو یہ کون ہے جو اندر تعلیم دیتا ہے غرض اختلاف اَلسنہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی مستقل دلیل ہے۔

اس لئے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ ① اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی بناوٹ ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ مگر ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ② اس میں قدرت کی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، جو یہ سوچ بچار کرتے ہیں کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف یہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی ایک مستقل دلیل ہے۔ زبان، صورت، رنگ، پہاڑ، جانور، ہر ہر چیز میں اختلاف ہے۔ ایک ہی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ انسان اگر کچھ بنانے بیٹھے گا۔ تو وہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ ایک رنگ کی چیز ہو۔ وہ بھی یہ چاہے گا کہ دس قسم کی چیزیں ہوں۔ یہ دس جذبات کس نے پیدا کر دیئے طبیعت کا تقاضا تھا کہ ایک ہی وضع کی چیز بنانا۔ ایک کا لباس ایسا ہو، ایک کا ایسا۔ قومیں روز ایک سے ایک فیشن نکالتی رہتی ہیں۔ آج جو فیشن ہے وہ کل پرانا ہو جائے گا۔ کل اور فیشن آ جائے گا۔ اگلے دن اور خدا جانے سو برس میں کتنے فیشن بن چکے ہیں، کتنے بدل چکے ہیں۔ آخر انسان میں اگر یہ جبلّت اور طبیعت کا تقاضا ہے تو وہ ایک شکل پر آتی۔ ہر چیز میں اختلاف ہے، عقلوں میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف پیدا کرنے والے اللہ ہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کا تقاضا نہیں۔ کسی فاعل مختار کے ارادے، کا یہ فعل ہے۔ اس نے جیسا ارادہ کیا ویسا بنا دیا۔ اس لئے اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو اپنے کو دیکھ لے، جب پہچان جائے گا۔ پہاڑ پہ نگا ڈالے تو پہچان جائے گا۔ غرض جس چیز پہ نگاہ ڈالے گا، اللہ کا وجود اس سے نمایاں ہوگا۔ اور اگر فکر نہ کرے تو انبیاء بھی تعلیم دیں جب بھی نہیں مانے گا اور ماننا چاہے تو اللہ نے ایک ایک چیز کو واعظ و مبلغ اور مذکر بنا دیا۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

بہر حال یہ آیت میں نے اس لئے تلاوت کی تھی کہ اس آیت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں ایسی بیان کی ہیں، جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا بھی سمجھ جائے۔ قرآن کریم سارے انسانوں کے لئے کتاب ہے۔ اس میں ایسے دلائل ہونے چاہییں، جس کو عوام وخواص یکساں سمجھ سکیں اور اگر فلسفیوں کی طرح شکل اول بنائی جاتی، مقدمات لگائے جاتے اور صغریٰ و کبریٰ ملتا، پھر نتیجہ نکلتا۔ تو بے چارہ گنوار دیہاتی ان کو کیا سمجھتا؟ اس لئے ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ سکے۔

بہر حال یہ آیت میں نے پڑھی تھی اس کے متعلق چند باتیں میں نے عرض کیں اللہ تعالیٰ ہمیں فہم سلیم عطا فرما دے۔ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں بھلائی مقدر فرمائے۔ اپنی معرفت اور پہچان کی، علم وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔ حق تعالیٰ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمادے۔ دین کو ہمارا شعار بنائے۔ دنیا و آخرت دونوں ہماری درست فرمادے۔ آخرت میں بلاحساب ہمیں جنت میں داخل فرمادے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور معیت نصیب فرمادے۔ آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

ذکر اللہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ:.......... فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ، وَلَذِکْرُاللّٰہِ اَکْبَرُ ، وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

بزرگانِ محترم!...... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت آپ حضرات کے سامنے میں نے تلاوت کی۔ اس وقت پوری آیت کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے صرف ایک جز کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور وہ درحقیقت ساری شریعت کی روح ہے۔ اور وہ جز ﴿وَلَذِکْرُاللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ② ہے۔ ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ نماز آدمی کو بے حیائی کی باتوں سے بچاتی ہے برائیوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔ نماز فحش اور منکرات سے کس طرح بچاتی ہے؟ اس وقت اس کے بارے میں کلام نہیں کرنا بلکہ ﴿وَلَذِکْرُاللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ③ کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں۔

اعمالِ شرعیہ کی روح...... اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرُ اللہ ہی سب سے زیادہ اعمال میں افضل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔ بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے تو ذکرُ اللہ ہی کی وجہ سے مقبول ہوتا ہے۔ اگر نماز میں ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی نہ ہو۔ (۲۸۔ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) نماز بے روح رہ جائے گی، روزے میں ذکرُ اللہ نہ ہو روزہ بے روح رہ جائے گا، زکوٰۃ میں ذکر اللہ نہ ہو زکوٰۃ بے روح ہو جاتی ہے۔ سارے اعمالِ شرعیہ کی روح فی الحقیقت ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ اس لئے اس پر کلام کرنا گویا ساری شریعت پر اور شریعت کے سارے احکام پر کلام کرنا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

زندگی روح سے ہے محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ بدن کے اندر روح نہ ہو۔ روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مُردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے۔ بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں۔ یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے اسے جلد سے جلد اپنے سے دور کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا تعلق اور محبت درحقیقت بدن سے نہیں بلکہ بدن کے اندر جو روح سمائی ہوئی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے کسی شے کے لئے بقا نہیں ہے۔

جس طرح سے ان مادی چیزوں میں روح سے ہی بقا ہے۔ اسی طرح سے اعمالِ شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکرُ اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کے مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔ اگر نماز میں یادِ خداوندی کی بجائے غفلت آ جائے، نماز ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ① ”نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے“۔ جب ذکر نہ رہا، روح نماز ختم ہو گئی۔ اب محض ایک اُٹھک بیٹھک یا ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر و قیمت عنداللہ نہیں ہو گی۔ اس طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر، تلاوت اور تراویح نہ ہو تو روزہ بھی ایک فاقہ ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ نیت کے سچے اور اس میں یادِ خداوندی ہونے سے روزہ زندہ ہو جاتا ہے اس کو عبادت کہتے ہیں یہ روح نکل جائے عبادت کی بجائے عادت ہو جاتی ہے۔ تو عادت اور عبادت میں فرق یہی ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کی یاد نہیں ہوتی اگر یاد ہوتی بھی ہے تو اپنے نفس کی ہوتی ہے۔ اگر بلا نیت کے سارا دن کھانا نہ کھائیں، پانی نہ پئیں، بیوی کی طرف رخ کر کے بھی نہ دیکھیں۔ اسے فاقہ کہیں گے اور نیت کے ساتھ اور یادِ خداوندی کے ساتھ کریں تو اسی کو روزہ کہیں گے۔ اگر حج میں ذکرُ اللہ نہ ہو اور نیت صحیح نہ ہو تو حج نہیں بلکہ سیر و سیاحت ہے۔ اگر اسی میں سچی نیت آ جائے۔ وہ حج بن جاتا ہے تو عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یادِ حق ہے۔ جس سے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حاصل یہ نکلا جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس طرح سے پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے گی۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی عبادت نہیں رہے گی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ“ ② قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی۔ جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان آخر الزمان، ج: ۱، ص: ۳۵۴، رقم: ۲۱۱۔

قیامت قائم کر دی جائے گی۔

قیامت کے معنی درحقیقت عالم کی موت کے ہیں۔ جیسا کہ مرنے کے بعد بدن پھول پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمانوں کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔ زمینیں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، پہاڑ گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں، سارا کارخانہ گڑبڑ اور درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قیامت ہے۔ تو حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے جب ایک بھی نہیں رہے گا۔ جبھی عالم کو موت آ جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی روح ذکرُ اللہ ہے۔ تو پوری دنیا کی زندگی اور روح درحقیقت یادِ خداوندی ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکرُ اللہ سے زندگی ہے ...... یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے ایک ایک جز میں زندگی کے آثار ذکرُ اللہ سے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ جب تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تو وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر جاتا ہے جہاں پانی ٹھہرا تو چند دن کے بعد خراب ہو جاتا ہے، میل کچیل بڑھ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی میں میل کچیل قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے بہتا ہوا پانی تھوڑا ہو یا زیادہ، اس سے وضو جائز ہے۔ اگر اس میں کوئی گندگی بھی گر جائے اس کی پاکی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس میں تسبیح اور ذکرُ اللہ جاری ہے۔ وہ اسے ناپاک نہیں ہونے دیتا اور ٹھہرا ہوا پانی اگر مقدار میں کم ہے اور اس میں کوئی گندگی گر جائے وہ پورا پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس سے وضو وغیرہ نہیں کر سکتے۔ گندگی کیوں پھیلی؟ اس لئے کہ اس کے اندر وہ روح ختم ہو گئی۔ تو چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہی اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ درخت کی ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح بند ہوئی جب ہی اس پر زردی آتی ہے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہی جلانے کے قابل بن جاتی ہیں۔ گویا جہاں ان سے ذکر کی روح نکلی تو پھر اسے جلا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے حدیث میں فرمایا گیا کہ نیا کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے جہاں اس کی تسبیح بند ہوئی جبھی اس پر میل کچیل آنا شروع ہو جاتا ہے اور تسبیح ختم ہوتے ہی جہاں وہ میلا بنا، پھر پہننے کے قابل نہیں رہا، آپ اسے اُتار کر دھوبی کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ جب تک دُھل کر نہ آئے آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ اسے بدن کے قریب بھی کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے کی صفائی اور ستھرائی ذکرُ اللہ سے قائم ہے۔ ذکر کے بند ہوتے ہی اس میں میل کچیل آنا شروع ہو جاتی ہے۔

انسان کی صفائی بھی فی الحقیقت یادِ خداوندی سے ہے۔ جب اس میں ذکر اور یادِ حق باقی نہیں رہے۔ تب انسان کے قلب میں میل کچیل گندگی اور نجاست آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں یادِ الٰہی ختم ہوئی انسان میلا ہو جاتا ہے اور میلا انسان میلے کپڑے کی طرح ہے۔ وہ دھکے دینے کے قابل ہو جاتا ہے اسے کوئی اہل اللہ میں سے پسند نہیں کرتا۔ روح کے اندر جتنا ذکر زیادہ رہے گا، اتنی صفائی زیادہ رہے گی جتنا ذکر کم ہو جائے گا۔ اتنی ہی کدورت

پیدا ہوگی۔ جتنی کدورت اور ظلمت پیدا ہوگی۔ گناہ معصیت اور نافرمانی کرنے کے جذبات پیدا ہوں گے۔ شرک وبدعت کے جذبات اُبھریں گے جب تک ذکر قائم ہے اور روح کے اندر تازگی ہے، بدن تازہ ہے۔ نفس کے اندر صفائی ہے تو نورانیت پیدا ہوتی ہے اس سے نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جز ہو وہ جبھی تک زندہ ہے جب تک اس میں یادِ خداوندی ہے۔ ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔

زراعت وتجارت سے نہیں دنیا دیانت سے قائم ہے...... دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مثلاً ایک کاشتکار کا دعویٰ ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے اس واسطے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے۔ میں غلہ اُگاتا ہوں، گیہوں، چاول اور چنا سب میری بدولت اُگتا ہے میں اگر اگانا چھوڑ دوں۔ کھانے کو کچھ نہ ملے تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ دنیا کی زندگی میرے دم سے ہے۔

اگر کاشت کار اور زمیندار دنیا میں نہ ہوں تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ تاجر نے آ کر کہا کہ دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے، اس لئے کہ تو تو کچی اجناس اُگاتا ہے۔ ان جنسوں کو اگر میں بنا سنوار کر دکانوں پر نہ سجاؤں۔ کپڑا، غلہ اور پھل، پھول سپلائی نہ کروں۔ دنیا بھوکی مر جائے گی۔ تو میری بدولت دنیا قائم ہے، نہ کہ تیری بدولت۔ تو نے غلے کا انبار لگا دیا۔ مگر ڈھیر سے کیا ہوتا ہے۔ بکے گا تو میری دکان پر آ کر۔ تو نے روئی اُگا دی۔ لیکن روئی کے گالے اگر پڑے رہیں تو کیا ہوتا ہے؟ کپڑا بنا کر میں نے اپنی دکان پر رکھا تو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ تیرا دعویٰ غلط ہے۔ ان دونوں کے بالمقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط کہتے ہو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ اس لئے کہ میں نے دنیا کا نظام قائم کر کے اس میں امن قائم کر رکھا ہے۔ اگر میں امن قائم نہ کروں، وہ آپا دھاپی پڑے کہ کاشت کار تاجر کو ختم کر دے اور تاجر کاشتکار کو، سرمایہ دار مزدور کو مار ڈالے اور مزدور سرمایہ دار کو۔ تاجر کاشتکار کے اور کاشت کار تاجر کی دکان پر ڈاکے مارے۔ دنیا ساری گڑبڑ ہو جائے۔

میں نے اپنے عدل وانصاف سے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ میں کرسی سیاست پر بیٹھ کر دنیا کو تھام رہا ہوں تو کاشت کار، تاجر اور زمیندار نہیں سنبھال رہا میں سنبھال رہا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سارے غلط کہتے ہو، دنیا کو سنبھالنے والا تو ہمارا نام لینے والا ہے۔ جو ہماری یاد میں مصروف ہے۔ اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ نہ کہ تاجر، کاشت کار، زمیندار اور سیاسی آدمی نے۔ ہم نے اور ہمارے نام لینے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ غور کریں تو اللہ ہی کا دعویٰ سچا ہے۔ باقی سب کے دعوے غلط ہیں۔ اگر ایک دیندار کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے تو اس نے کب تک سنبھال رکھا ہے؟ اگر کاشت کار دیانت داری سے کام کرتا ہے نہ وہ دوسرے کی زمین پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ ایک انچ زمین دوسرے کی نہیں لینا چاہتا۔ جتنا غلہ اس کے ہاں اُگتا ہے۔ اسی کو وہ بازار میں لے جا کر بیچتا ہے۔ دوسروں کے غلے چرا کر اپنے غلے میں ملا کر نہیں لے جاتا۔

تو جب تک وہ دین و دیانت سے کام کر رہا ہے۔اس وقت تک اس کی زمینداری چل رہی ہے اور اگر بد دیانتی اور ظلم وستم پر آ جائے۔لوگوں کی زمینوں پر چھاپے مارے۔لوگوں کے غلوں میں اپنا غلہ ڈال کران کے غلے کھینچ لائے۔اگلے دن اس پر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔تو نہ اس کی کاشت کاری باقی رہے گی، نہ زمینداری نہ یہ دنیا کو سنبھال سکے گا۔تو معلوم ہوا کہ زمیندار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت کی وجہ سے، دیانتداری ہی اللہ کا ذکر ہے۔تو بات یہ نکل آئی کہ ذکر کرنے والے نے دنیا کو سنبھالا، دیانت دار نے سنبھالا، بددیانت نے نہیں سنبھالا۔

ایک تاجر اگر کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھالا۔وہ اس وقت صحیح ہے کہ وہ عدل وانصاف کے ساتھ تجارت کرتا ہو۔اصولِ تجارت کا پابند ہو۔اس کا جذبہ یہ ہو کہ نہ میرے گاہک کو نقصان پہنچے نہ مجھے۔وہ ایک منٹ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ یہ گاہک آ رہا ہے تو لاؤ اس کی کھال بھی اُتار لوں اور اس کو بالکل گھول کر کھا جاؤں۔یہ اس کا جذبہ نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ میرے ہاں سے یہ مال لے جائے تو میری بھی اس کے دل میں یاد رہے میں اس کو اچھی چیز دوں اتنی قیمت میں دوں جتنی مناسب ہے۔نہ غبن فاحش کروں، نہ بلیک مارکیٹنگ کروں۔بلکہ دیانت داری سے اُصولی طور پر واجبی قیمت وصول کروں۔جس کے اندر کوئی دَغا وغیرہ نہ ہو۔حدیث میں فرمایا گیا ہے۔''غَفَرَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ کَانَ سَھْلًا اِذَا اشْتَرٰی سَھْلًا وَبَاعَ سَھْلًا'' ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیانت دار تاجر کو دعا دی ہے اور فرمایا، اللہ اس شخص کی مغفرت وبخشش کرے جو سہولت کے ساتھ بیچتا اور خریدتا ہے۔انصاف کے ساتھ قیمت لگاتا ہے۔گاہکوں کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کرتا ہے۔تنگی اور سختی نہیں کرتا۔یہ نہیں ہے کہ جب مال خریدے تو قیمت کم سے کم لگائے کہ میں اسے لوٹ لوں اور جب بیچنے پہ آئے تو ساٹھ گنی لگائے کہ مجھے زیادہ ملے۔ہر صورت میں اپنا نفع چاہتا ہے۔ایسا نہیں ہے بلکہ بیچتے وقت اچھا مال دیتا ہے اور قیمت کفایت سے لیتا ہے اور خریدتے وقت کوئی کمی نہیں کرتا تاکہ بائع کو نقصان نہ پہنچے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے یہ تاجر کون ہے؟ یہ وہی ہے جو دین کو پیشِ نظر رکھ کر تجارت کر رہا ہے۔

تو تجارت نے دنیا کو نہیں سنبھالا درحقیقت تاجر کی دیانت داری نے سنبھالا۔اگر بددیانتی اور بے اصولی سے تجارت کرے ممکن ہے ابتدا میں کچھ بازار چل جائے اور کچھ فروغ ہو جائے۔لیکن پھر جو خسارہ پڑے گا تو راس المال کی بھی مصیبت آ جائے گی کہ وہ بھی باقی رہتا ہے یا نہیں۔تو اگر بددیانتی شامل حال ہے تو وہ دکان بھی نہیں سنبھلے گی، دنیا کیا سنبھلے گی؟ اس سے واضح ہو گیا کہ تاجر نے دنیا کو نہیں سنبھالا، اسکی دیانت داری نے سنبھالا ہے۔دیانت داری میں پھر ذکرُ اللہ آ جاتا ہے۔تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھال رہے ہیں نہ کہ کوئی اور۔نظامِ حکومت سیاست سے نہیں دیانت سے چلتا ہے......کرسی عدالت پر بیٹھنے والا جج یا کرسی پر بیٹھنے والا

① السنن للترمذی، ابواب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی استقراض البعیر، ج:۵، ۱۴۹، رقم: ۱۲۴۱.

حاکم، بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جب کہ عدل وانصاف قائم کرے اور اگر وہ ظلم وزیادتی کرتا ہے۔ پوری پبلک کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھتا اپنے اور پرائے کا فرق کرتا ہے وہ حکومت کو بھی تباہ کرے گا اور خود بھی تباہ ہوگا۔ لیکن اگر عدل سے کام لے رہا ہے جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿يَـآ اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا كُـوْنُـوْا قَـوّٰامِيْـنَ بِـالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْعَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! ''قَـوّٰام بِـالْقِسْطِ'' بنو یعنی عدل وانصاف سے فیصلے کرو، دیانت داری سے فیصلے کرو۔ اگر چہ دیانت داری سے تمہارے نفس کے خلاف فیصلہ ہو۔ تو اپنے اوپر برداشت کرو۔ مگر فیصلہ حق کا کرو۔ اگر چہ تمہاری اولاد پر بن جائے، مت پرواہ کرو۔ عدل سے کام لو''۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریح چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) ہیں کہ میری ایک ذرہ جو میں جنگ کے موقع پر سر پر رکھتا تھا وہ فلاں یہودی کے ہاں ہے۔ اس نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہ دینا نہیں چاہتا دعوی بالکل سچا تھا۔

قاضی شریح نے امیر المومنین کو عدالت میں طلب کیا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین ہیں۔ قاضی شریح ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور عدالت کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو یا خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ امیر المومنین ہیں۔ ان کے لئے تو کرسی بچھائی جائے اور غریب آدمی دعوی کر کے آئے تو وہ کٹہرے میں کھڑا ہو جب امیر المومنین مدعی بن کے آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا پڑے گا جہاں عام مدعی اور مدعیٰ علیہ کھڑے ہوں گے۔

تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سمن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہوں آپ مدعی ہیں اور یہودی سے کہا کہ تو مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے حاضر ہو۔ دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا کیا، یہودی بھی کھڑا اور امیر المومنین بھی کھڑے ہیں۔ امیر المومنین کے مقابلے میں یہودی کی کیا حیثیت تھی۔ مگر قاضی اور عادل حاکم کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں برابر کھڑے کئے گئے۔ قاضی شریح نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟

امیر المومنین نے فرمایا: دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری ذرہ پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے دیتا نہیں حالانکہ ذرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا کہ ان کی ذرہ نہیں ہے۔ یہ تو میری ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ یہودی کی واقعی ذرہ نہیں تھی۔ مگر قاضی شریح نے کہا کہ کوئی گواہ ہے؟

فرمایا جی ہاں تو ایک غلام کو پیش کیا اور ایک اپنے بیٹے حضرت حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو پیش کیا۔ قاضی نے فرمایا بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے اور دو گواہ کے بغیر دعوی ثابت نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور گواہ لاؤ۔ انہوں نے کہا اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، یہی دو گواہ تھے یا میرا بیٹا یا یہ میرا غلام۔ فرمایا، اگر گواہ ایک ہو تو آپ

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۳۵.

کے حق میں ڈگری نہیں دی جاسکتی، یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ذرہ اسی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطہ کا ثبوت مہیا نہیں ہوا، اس واسطے فیصلہ ان کے خلاف ہوا اس عدل کا اثر کیا ہوا؟ یہودی نے اسی وقت وہیں کھڑے ہو کر کہا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔'' سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور کہا جس دین کے اندر اتنا عدل و انصاف ہے کہ ایک امیر المؤمنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم ایک نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں وہ دین سچا ہے اور میں اس دین کی حقانیت کا قائل ہوتا ہوں اور علی الاعلان کہا کہ میرا دعویٰ غلط تھا، سچے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور ذرہ ان کو دے دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اب مجھے ذرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرہ کا تو ہی مالک ہے ذرہ بھی تو رکھ تیرا دین جب اسلام بن گیا تو میرے لئے سب کچھ ہو گیا۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی حقانیت کھلی یہودی کو دین نصیب ہو گیا ذرہ اس کو مل گئی اسلام کی عظمت واضح ہو گئی ایک سچائی سے کتنی برکات اور فائدے ظاہر ہوئے افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ، اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

تو اسلام یہ چاہتا ہے کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر دیانت داری سے فیصلہ کرو چاہے تمہارے خلاف فیصلہ ہو، چاہے تمہاری اولاد کے خلاف ہو، چاہے تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہو مگر عدل و انصاف ہونا چاہئے (اگر ایک حاکم اس عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مگر حاکم نے) نہیں اس کی دیانتداری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ تو وہی بات آ گئی کہ ذکر اللہ کرنے والے نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ عالم کو تھامنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ اگر تاجر اور کاشت کار دیانت چھوڑ دے اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے اگر بادشاہ وقت دیانت چھوڑ دے، یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔ اور اگر دین و دیانت سے کام لیں گے تو دنیا کو سنبھالنے والے بنیں گے تو دنیا کو دیانت ذکر اللہ اور یاد خداوندی سنبھالتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کی خلافت کا دور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب اور دبدبہ وہ ہے کہ ان کا نام سن کے دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جبلہ ابن ایہم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا، اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوا اور حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا، جب وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف میں مشغول تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت کے اندر طواف کرتے ہیں تو دھکے مکے بھی لگتے ہیں، ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا سب جانتے ہیں کہ سب اللہ کی یاد میں مشغول ہیں۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو نہ برا مانتے ہیں نہ مقابلہ کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تھا۔ وہ فزاری طواف کر رہا تھا۔ اس وقت جبلہ ابن ایہم بھی طواف میں

مشغول تھا۔ تو جبلہ ابن ایہم کی لنگی پر اس دیہاتی کا پیر پڑ گیا اور لنگی کھل گئی وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا۔ یہاں وہ مسلمان ہو کر غریب الوطن تھا۔ جذبات اس کے وہی شاہانہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ میری لنگی پر ایک دیہاتی کا پیر پڑ گیا، اور وہ کھل گئی ہے تو اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کے گرا۔ اس کے بعد اس نے لنگی درست کی اور پھر طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں جا کے دعویٰ کیا کہ اس نے ناحق میرے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پیر نہیں ڈالا تھا اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آدمی جان بوجھ کر پیر ڈالے۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑا ہی لے جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ میں اس کے اوپر پیر بدنیتی سے بھی نہیں ڈال سکتا تھا ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے مکے میں میرا پیر لگ گیا، تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی، مگر ارادی غلطی نہیں ہوئی، یہ مجھے تنبیہ کر دیتا، دھول جمانے کا کون سا موقع تھا۔ اس کا حق کیا تھا؟ یہ دعویٰ دائر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت سے جبلہ ابن ایہم کے نام سمن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو، وہ حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تو نے کیوں چپت مارا؟ اس نے کہا اس نے میری لنگی پر پیر ڈالا، فرمایا لنگی پر پیر ضرور پڑا۔ لیکن وہ موقع ایسا ہے کہ وہاں ارادے سے پاؤں کوئی نہیں ڈال سکتا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تم سے قصاص لیا جائے گا یا تو یہ دیہاتی تمہیں بھی اتنی زور سے دھول مارے گا یا پھر تم مالی طور پر فدیہ ادا کرو، اس نے جو چوٹ کھائی ہے اس کے بدلے میں کچھ مال دے دو، جبلہ نے کہا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر ہو گیا!!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اسلام میں سب برابر ہیں۔ یہاں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے خدا کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر برابر ہیں۔ ایک صف میں بادشاہ اور اس کے برابر میں غلام بھی کھڑا ہو گا وہاں کوئی فرق روا نہیں رکھا جا سکتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ـــــ نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں بندہ نواز تو اللہ ہیں، جو اپنے بندوں کو نوازتے ہیں۔ اس عدالت میں آ کر تو امیر المومنین اور دیہاتی سب برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں۔ اسے سخت ناگوار گزرا کہ اس دین کے اندر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکا جاتا ہے۔ وہ راتوں رات بھاگ گیا اور اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور بدستور پھر عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں کہ بادشاہ بھی ہمارا آ گیا اور اس کا قدیم دین بھی واپس آ گیا بہرحال اسلام نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایک صحابی قسطنطنیہ بلا ارادہ ہجرت، تجارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ جبلہ ابن ایہم کو خبر ہوئی کہ ایک صحابی آئے ہیں۔ آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا اور یہ بھی پہنچے اس نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں اسلام لے آیا تھا۔ لیکن وہ فزاری کے

ساتھ میرا مقدمہ ہوا تو میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر نہیں ہو سکتا، لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک نہ میرے دل کو سکھ ملا نہ چین، سچی بات وہی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ دین حق بھی وہی ہے اور سچا بھی وہی ہے اور میں اس پر نادم ہوں کہ میں مرتد ہوا گو مجھے ظاہری بادشاہت پھر مل گئی، لیکن میرے دل میں سکھ اور چین نہیں ہے۔ میرا اب جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام میں داخل ہو جاؤں، مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس واسطے میں اپنے وقار کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہوں کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں کہہ سکوں کہ بھئی اگر میں نے اسلام قبول کیا تو کوئی بری بات نہیں کہ فلاں نعمت بھی مجھے ملی اور وہ یہ ہے کہ اگر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی سے میری شادی کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں، تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں، یا میں ہی انکار کر دوں، مگر میرے لئے ایک حیلہ اور عذر بن جائے گا، میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹی دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے ان کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ میں پھر اسلام قبول کر لیتا ہوں۔ ①

ان صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا، میں امیر المومنین کے پاس جا کے ذکر کر دوں گا اور اس کے بعد میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سارا واقعہ ذکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اسلام کے مقابلہ میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہیں وعدہ کر لینا چاہئے تھا کہ ٹھیک ہے میرا وعدہ ہے'' ②

انہوں نے کہا، امیر المومنین! میں تو ڈر رہا تھا کہ میں کیسے وعدہ کروں؟ فرمایا نہیں فوراً جاؤ قسطنطنیہ کا سفر کرو اور کہو کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر۔

چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ ابن ایہم کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام نہیں تھا۔ خاتمہ ایمان پر نہیں ہونا تھا۔ صحابی رضی اللہ عنہم بے چارے واپس چلے آئے۔ تو میں نے یہ عرض کیا کہ حاکم عدالت جب بادشاہ اور غلام کو، فقیر اور حقیر کو، خادم اور اس کے آقا کو، کرسی عدالت پر بیٹھ کر ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ اصول اپنائے ہوئے ہے۔ تو یہی اصل دین و دیانت ہے۔ تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے۔ وہ امن جبھی تک قائم ہے جب تک دین و دیانت کے اصول کو برتے اور دین و دیانت کو برتنا فی الحقیقت یہی ذکر اللہ ہے۔ معلوم ہوا دنیا ذکر اللہ سے قائم ہے، سیاست سے قائم نہیں۔ زراعت سے قائم نہیں۔ دعویٰ اللہ ہی کا سچا رہا کہ دنیا کو تھامنے والے وہ ہیں جو اللہ اللہ کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔ جنہوں نے دعویٰ کیا خواہ وہ تاجر، کاشت کار، حکام یا سیاسی لوگ ہوں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ دنیا کو

① تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، ج: ۲، ص: ۱۶۴. ② مختصر تاریخ دمشق "ابن عساکر" ج: ۲، ص: ۲۵۳.

تھامنے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں...... ظاہر میں بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے ساتھ نہیں، مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اللہ کے ہاں مقبولیت ہے۔ قبولیت عنداللہ، یہ ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، جس کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر کہا ہے کہ۔

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم شہان بے کمرو خسروانِ بے کلاہ اند

یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہیں یہ اللہ کے عشاق ہیں۔ یہ عاشقان خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو اگرچہ ان کے کپڑے معمولی اور پھٹے پرانے ہوں انکے پاس کوئی کوٹھی بنگلہ نہیں ہے۔ جھونپڑوں میں رہتے ہیں، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں، اگرچہ سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں روپے کا پٹکا ان کی کمر پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدنوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک آدمی بادشاہ کی حکومت کے نیچے جبری طور پر ہوتا ہے۔ دل میں عظمت نہیں ہوتی دل میں لعنت بھیجتا ہے ویسے مجبور ہے۔ لیکن اللہ والوں کی حکومت دل پر ہوا کرتی ہے۔ تنہائی میں بھی ہوگا تو بے ادبی سے ان کا نام نہیں لے سکتا، تو حقیقی عظمت وہ ہے کہ خلوت میں جائے جب بھی دل میں بھری ہوئی ہو اور مجمع میں آئے جب بھی، بادشاہان دنیا کی عظمت بھرے مجمعوں میں تو ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کو خطرہ ہے کہ اگر میں نے کوئی گستاخی کی، تو پولیس آ کے گردن ناپ لے گی، جیل جانا پڑے گا اس ڈر کے مارے آدمی بادشاہ کی عزت کرتا ہے تنہائی میں آ کر اس پر لعنت کرتا ہے۔ لیکن اللہ والوں کی، سامنے بھی اور تنہا بیٹھ کے بھی گستاخی نہیں کرتا سمجھتا ہے کہ میری آخرت بگڑ جائے گی۔ اہل اللہ کی بادشاہت دنیا میں ان کی عدم موجودگی میں بھی قائم ہوتی ہے

ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ، دنیا میں بھی نہ ہوں پھر بھی تعظیم کی جاتی ہے۔ آج حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام آتا ہے، قلب جھک جاتا ہے آپ کہتے ہیں، رضی اللہ عنہ اللہ، ان سے راضی ہو آج امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے۔ تو آپ عقیدت سے گردن جھکا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے تو اتنی گرویدگی ہے کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر کوئی گستاخی کرے، تو آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس کو برداشت نہیں کریں گے حالانکہ آج دنیا میں دونوں نہیں ہیں۔ مگر عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ ان کی بادشاہت و عظمت تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہ عظمت کاہے کی ہے؟ ان میں سے کسی کے پاس دولت، تاج اور قباء شاہی نہیں تھی مقبولیت عنداللہ تھی خدا کے مقبول بندے تھے۔ اس کی برکات ان کے قلوب کے اندر موجود تھیں۔ اس عظمت کی

وجہ سے آج تک آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں، جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ، یہ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' (Preaching of Islam) لکھی ہے۔اسلامی تہذیب کے متعلق اس نے دور دکھلائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح سے پھیلا عرب، ہندوستان اور چین میں کیسے پھیلا اسلامی طور وطریقے اور آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں اور جانفشانیاں اور ان کی جدوجہد، ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔اس میں اس نے ایک لطیفہ لکھا وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی جو دنیا میں اور جگہ دکھلائی نہیں دی۔(وہ اسے نہیں دکھلائی دی ہوگی لیکن اور جگہ بھی ہے۔مگر اسے کم از کم ہندوستان ہی میں نظر آئی)۔وہ یہ ہے کہ جب میں اجمیر گیا، تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کا نام سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ ہے۔یعنی حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کو ہم امیر الہند، امام الہند اور سلطان الہند کہتے ہیں اس لیے کہ خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں آ کر اسلام کو پھیلایا اجمیر شریف میں چھپر کی ایک کٹی ڈال کر بیٹھ گئے۔ہندو، مسلم اور غیر مسلم انکے دربار میں حاضر ہوتے عقیدت سے بیٹھتے، ان کی زبان فیض ترجمان سے کلمات حقہ سنتے ان کی دیانت، ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے خود اسی آرنلڈ نے لکھا ہے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بلاواسطہ ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے۔ان کی تعداد الگ ہے یعنی ایک کروڑ ہے۔یعنی ایک کروڑ کے قریب افراد اسلام میں داخل ہوئے۔انہوں نے پھر آگے جتنوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا ان کی تعداد الگ ہے۔وہ کہتا ہے کہ میں نے اجمیر میں یہ انوکھا واقعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔لوگ قبر پر آتے ہیں تو ان کی حکومت قائم ہے۔

اور بعضے تو جاہل شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں عظمت سہی ان کے دلوں میں مگر جب خلاف شرع عظمت ہوگی، اللہ کے ہاں مقبول نہیں، بعضے سجدے اور طواف کرتے ہیں۔مقصد تعظیم تھا۔مگر انہوں نے اس کو غلط طریق پر جاری کیا۔ایک وہ ہیں کہ فاتحہ پڑھتے ہیں، استفاضہ کرتے ہیں اور پابند شرع بھی ہیں اصول شریعت کے متبع بھی ہیں۔تو اتباع شریعت اور عدم اتباع شریعت تو الگ رہا مگر عظمت لے کے سب جاتے ہیں۔حالانکہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں نہیں ہیں۔مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے کہ اگر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں تشریف رکھتے اور ہم جا کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اتنی ہی عظمت وہاں بھی کرتے، جتنی اب قبر پر جا کر کرتے ہیں۔تو اس کی حقیقت کیا چیز ہے؟ یہی کہ ان کی حکومت دلوں کے اوپر قائم ہے تو اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔دنیا کے بادشاہ بدنوں، پہاڑوں، پتھروں اور زمین کے بادشاہ ہوتے ہیں۔دلوں پر ان کی

عظمت وحکومت قائم نہیں ہوتی دل سے لوگ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے اور ہم آزاد ہو جائیں اور اللہ والوں کی نسبت دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت اور زیادہ مضبوط ہو جائے ان کی محبت میں اگر ہم فنا ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو گئے، ہماری دنیا بھی بن گئی، آخرت بھی بن گئی تو جامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم   شہان بے کمرو خسروانِ بے کلاہ اند

اللہ والوں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو یہ بے تاج بادشاہ ہیں، موجود ہوں تب بھی اور موجود نہ ہوں تب بھی ساری دنیا ان کی رعیت میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو عقیدت سے کہتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم ان پر درود وسلام پڑھتے ہیں۔ ان کے صحابہ کا نام آجائے تو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ان کے ائمہ کا نام آجائے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں۔ کسی ولی مومن کا نام آجائے مرحوم ومغفور کہتے ہیں۔ غرض دعاؤں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی محبت میں فنا ہوتے ہیں۔ تو بات یہ نکلی کہ ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں پر قائم کیوں ہے؟ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ یادِ حق نے ان کو اللہ سے ملا کر ایسا کر دیا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اللہ والوں کی یہ شان ہے کہ ''اِذَا رَاَوْا ذُكِرَ اللّٰهُ'' جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان لوگوں کا بھی ساتھ میں ذکر آتا ہے جب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی اللہ کا بھی ذکر آتا ہے گویا۔

خاصان خدا خدا نہ باشند   لیکن از خدا جدا نہ باشند

خاصان خدا خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے جب اللہ کا ذکر آئے گا تو اہل اللہ کا بھی ذکر ساتھ آئے گا اور جب اہل اللہ کا ذکر آئے تو خدا اور رسول کا بھی ذکر آئے گا ان کی عظمت دراصل اللہ سے ہے اسی ذکر سے آدم کی عظمت بھی قائم ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ ذکر اللہ ہی درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آجاتی ہے تو ان کی حکومت قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ کی محبت ذکر اللہ کی وجہ سے ہے۔

اہل اللہ دنیا کو کیوں لات مار دیتے ہیں؟...... آخر کوئی دولت تو ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کی دولت کو لات مار دیتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے دنیا کی وقعت، نہ اس کی شوکت کی وقعت، نہ تاج وتخت اور محلات کی وقعت کسی چیز کی بھی وقعت نہیں یہ جو ساری دنیا کو ٹھکرا دیتے ہیں، کوئی بڑی چیز ان کے پاس ہوتی ہے۔ جبھی تو ٹھکراتے ہیں معاذ اللہ: کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں کہ ساری دنیا کو لات ماردی بلکہ دنیا سے بڑھ کر سلطنت دی جاتی ہے۔ جب وہ آجاتی ہے تو پوری کی پوری دنیا ان کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہے دنیا کو ضرورت سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی عظمت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی چیز ان کے قلب میں موجود ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ ان کی خانقاہ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ذکر اللہ کرنے والے دس دس ہزار مہمان ایک ہی وقت میں خانقاہ میں ہوتے تھے اور لنگر کا کھانا تقسیم ہوتا تھا، حضرت شیخ سے بادشاہ

سنجر بھی بیعت تھا۔ سنجر خراسان کے اندر جو کہ ایک بہت بڑا ملک تھا۔ اس ملک کا ایک صوبہ تھا۔ جس کو نیمروز کہتے تھے۔ بادشاہ سنجر کی حکومت نیمروز میں بھی تھی۔ چونکہ حضرت شیخ کے ہاں مہمانداری ہزاروں کی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ شیخ کے گھر نہ جائیداد نہ دولت کس طرح مہمانوں کی مدارات کرتے ہوں گے اس نے نیمروز کا پورا صوبہ حضرت شیخ کے نام ہبہ کیا اور لکھ کر بھیجا کہ یہ پورا صوبہ میں آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرتا ہوں اس کی آمدنی لاکھوں روپے سال کی ہے مہمانداری میں سہولت ہوگی آپ کے ہاں دشواری ہوتی ہوگی اس واسطے یہ پورا صوبہ اور جائداد قبول فرمالیجئے۔

سبحان اللہ! حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب لکھا، تو وہ جو اس نے پرچہ لکھ کر بھیجا تھا اسی کاغذ پر حضرت نے بادشاہ سنجر کے نام جواب لکھ کر بھیجا اور دو شعر کا قطعہ لکھ دیا فرمایا ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ دردل بود اگر ہوس ملک سنجرم

حاصل اس کا یہ تھا کہ بادشاہ سنجر کا جو چتر ہے۔ ایک تو بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا تھا اور اس کے پیچھے ایک سیاہ قسم کا چتر لگاتے تھے تا کہ اس کی سیاہی میں بادشاہ کا سفید و سرخ چہرہ نظر آئے وہ گویا عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ سر پر تاج ہو اس کے پیچھے ایک چتر ہو اس میں سونے کا کام ہو وہ چتر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ تو حضرت شیخ نے لکھا کہ بادشاہ سنجر کا جو سیاہ چتر ہے میرے نصیب پر بھی اسی طرح سیاہی آجائے جیسے بادشاہ سنجر کے چتر کی سیاہی ہے اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ذرا بھی ہوس پیدا ہو تو میں بدنصیب اور سیاہ بخت بن جاؤں میرے دل میں کوئی ہوس نہیں۔ ہوس کیوں نہ آئے؟ اگلے شعر میں اس کا جواب دیا اور وجہ بیان کی ہے فرمایا:

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیم روز رابیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ لگا ہے۔ اس دن سے نیمروز کے صوبے کی میرے دل میں کوئی وقعت باقی نہیں ہے۔ نیم شب کا ملک کیا ہے؟ یعنی وہ جو میں رات کو اٹھ کر دو چھوٹی چھوٹی رکعات پڑھتا ہوں وہ سلطنت جو مجھے ملی ہے اس کے مقابلے میں نیمروز کا ملک میرے نزدیک جو کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا تو مجھے نیم شب کا ملک حاصل ہے۔ نیمروز کے ملک کی کیا ضرورت ہے؟ آدھی رات کی سلطنت مجھے حاصل ہے تو آدھے دن کی سلطنت مجھے درکار نہیں ہے:

خلیل آسا در ملک یقین زن ۔۔۔ نوائے لاأحب الأفلین زن

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے چاند اور سورج کو دیکھ کر فرمایا تھا، جب وہ غروب ہو گئے ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ ① یہ ابھی طلوع ہو کر غروب ہونے والے ہیں، ابھر کر گرنے والے ہیں مجھے ان سے کوئی محبت نہیں، مجھے اس ذات سے محبت ہے جو ہر وقت عروج، رفعت اور بلندی کے اوپر ہے۔ گم ہونے والی چیزوں سے مجھے محبت

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۶.

نہیں ہے اس لئے اہل اللہ کے ہاں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں یہ جو ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے پورے صوبے پر لات ماردی اور ٹھکرا دیا۔ فرمایا اگر میں دل میں ذرا بھی ہوس لاؤں تو بدنصیب بن جاؤں مجھے تیرے ملک سنجر کی ضرورت نہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ دوسرا ملک ان کے ہاتھ میں ہے۔ جو اس سے بڑا ہے تو جب وہ ہاتھ آ جائے تو چھوٹے ملک کی کیا ضرورت رہی؟

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت..... حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا جب وجد طاری ہوا اور معرفت الٰہی کا ایک نشہ ان پر طاری ہوا اور سکر میں گئے تو زبان سے نکلا "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے۔ مریدین بے چارے پریشان اور دم بخود۔ جب شیخ کو ہوش آیا اور افاقہ ہوا انہوں نے عرض کیا، حضرت! آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا فرمایا کفر کا کلمہ؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تم نے پھر سزا کیوں نہیں دی تم نے کفر کا کلمہ کیسے برداشت کیا اسی وقت سزا دینی چاہئے تھی پھر کبھی کفر کا کلمہ نکلے، فوراً سزا دو ایسا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے۔ فوراً اسے تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے مریدین بے چارے چپ ہو گئے شیخ پر دو چار دن بعد پھر وجد طاری ہوا پھر وہی کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" مریدین تیار کھڑے ہی تھے شیخ کا حکم تھا۔ کوڑے لے کر شیخ کے اوپر برسانے شروع کر دیئے مگر شیخ جس مقام پر تھے۔ وہ کوڑا ان پر تو نہ لگا جتنا مارا، وہ ان کی کمروں پر لگنا شروع ہوئے اب مارنے پر تو یوں مجبور کہ شیخ کا حکم ہے اور جتنا مار رہے ہیں خود پٹ رہے ہیں۔ سارے مریدین لہولہان ہو گئے اور شیخ کا کچھ نہ بگڑا۔ مارتے مارتے جب خود بھی تھک گئے اور ساروں کی کمروں سے خون جاری ہو گیا اتنے میں شیخ کو ہوش آیا تو دیکھا کہ سب آدھ مرے پڑے ہوئے ہیں تو پوچھا بھئی! تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ حضور! آپ کا حکم تھا کہ (ایسا کلمہ نکلنے پر مجھے مارنا) ہم مارنے کھڑے ہوئے تو پٹے تو ہم حضور پر؟ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ① فرمایا: آخر وہ کیا کلمہ ہے۔ جس کو تم کفر کا کلمہ کہتے ہو؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" فرمایا: نامعقولو! یہ کفر کا کلمہ کب ہے۔ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے۔ اب تم نہ سمجھو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ تم نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی لفظوں کو دیکھ لیا یہ تو عین کمال اور عین توحید کا کلمہ ہے۔ حضرت! آخر یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے کہ میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔ ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ② ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ③ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

فرمایا: اس کا مطلب سمجھ لو یہ بتلاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ اللہ کا ملک زمین، آسمان، پہاڑ،

---

① تفسیر حقی، تحت تفسیر سورة الملک، ج:۵، ص:۴۳۶. ② پارہ:۲۱ سورة العنکبوت، الآیة:۴۵.

③ پارہ:۱۰ سورة التوبة، الآیة:۷۲.

ستارے ہیں، میں ہوں تم ہو، یہ سب اللہ کا ملک ہیں اور میرا ملک کیا ہے؟ اللہ کی ذات وصفات، اسی میں میں سیر کرتا ہوں، اسی میں عروج کرتا ہوں رات دن اللہ کی ذات وصفات میں گھرا ہوا ہوں تو میرا ملک تو اللہ کی ذات ہے اور اللہ کا ملک میری ذات ہے۔ بتلاؤ پھر میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟ ① واقعی یہ بزرگ تو ایسے ہیں کہ ماریں اور مار کے رونے بھی نہ دیں یعنی خود جو کلمہ کہہ دیں وہ تو عین حق ہو جائے اور ہم حق بھی کہیں تو وہ بھی کفر بن جاتا ہے اب اس کا علاج کیا ہے؟ تو بظاہر یہ کلمہ کفر تھا۔ مگر شیخ نے بتایا کہ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے کہ ہمارا ملک اللہ کی ذات وصفات ہے۔ تو ہمارے ملک کے مقابلے میں سارے عالموں کی کیا حقیقت ہے؟ تو ملک میرا بڑا رہا۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جن کو یہ ملک ہاتھ آ جائے وہ اس ملک کا لالچ کیوں کریں گے؟ جنہیں یہ دولت وسلطنت ہاتھ آ جائے کہ اللہ کی ذات وصفات میں سیر کریں اور رات دن عروج کریں ذات وصفات کے عجائبات ان پر کھلیں، علوم وکمالات اور معارف نئے سے نئے کھلیں، وہ تو اس پورے جہاں کی طرف رخ نہیں کریں گے یہ دنیا تو دنیا ہے۔ وہ چاند اور سورج کو بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کی بھی کوئی عظمت نہیں ہے۔

اللہ کے نام کے بغیر بڑی سے بڑی مخلوق کوئی حقیقت نہیں رکھتی......اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین کی دعوت دینی شروع کی پورے عرب کے اندر آپ کی دشمنی پھیل گئی خود آپ کے عزیز واقرباء دشمن بن کے کھڑے ہوئے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کا دین پھیلانے والے تھے۔ کسی کی دوستی، دشمنی کی آپ کو کیا پرواہ تھی آپ دین پھیلاتے رہے اور ابوطالب تھے تو اپنے آبائی دین پر، مگر حمایت ومدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے۔ قوم کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، وہ جمع ہو کر ابوطالب کے پاس آئے اور کہا اے ابوطالب! تمہارے بھتیجے نے ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں ہمارے آبائی دین کو یہ ترک کرانا چاہتے ہیں اور نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا مگر ہم اس سے مجبور ہیں کہ تم ان کے حمایتی ہو تم ہمارے بڑے اور سردار ہو اس لئے ہم تمہیں واسطہ بناتے ہیں کہ تم اپنے بھتیجے سے ایک دفعہ ہماری طرف سے کھل کر بات کرلو کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟ جو وہ چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر خدا کے لئے اس کلمہ سے باز آ جائیں آپ ایک دفعہ ان پر حجت تمام کر دیں تا کہ ہم لوگ بھی آزاد ہو جائیں پھر جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے جو انکا جی چاہے گا وہ کریں گے اب تم آڑے آ جاتے ہو تمہاری وجہ سے ہم مجبور ہیں۔

ابوطالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! تیری قوم کے سردار سب کے سب جمع ہو کر میرے پاس آئے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ تمہاری قوم یہ کہتی ہے کہ اگر تمہارا مقصد دولت ہے، تو ہم پورے حجاز کی دولت سمیٹ کر ان کے قدموں میں لا کے ڈالے دیتے ہیں۔ آج سے وہ اس

① تفسیر حقی ،تحت تفسیر سورة الحشر، ج: ۱۵، ص: ۲۴۳.

دولت کے مالک اور ہم ان کے تابع اور اگر ان کا مقصد حسن و جمال ہے تو حجاز کی جتنی بیٹیاں ہیں، تو وہ سامنے کئے دیتے ہیں جتنی چاہیں وہ پسند کرلیں ہم ان کی خدمت میں پیش کردیں گے اور اگر وہ اقتدار و حکومت چاہتے ہیں تو ہم سارے مل کے آج سے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔ جو وہ چاہیں اس کے لئے ہم تیار ہیں دولت، اقتدار اور بیٹیاں حاضر ہیں۔ یہ لے لیں، مگر خدا کے لئے یہ کلمہ بلند نہ کریں، ہمارے بتوں کی توہین نہ کریں، اس سے باز آجائیں اور ہم سب چیزیں دینے کو تیار ہیں۔ ابو طالب نے کہا کہ میرے بھتیجے! تیری قوم یہ کہہ رہی ہے اور مجھے پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے چچا! آپ نے جو کہنا تھا کہہ چکے؟ کہا کہ ہاں کہہ چکا۔ فرمایا، اب میری سن لیجئے ''خدا کی قسم اگر میری قوم میرے دائیں ہاتھ پر سورج لا کے رکھ دے اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کے رکھ دے تب بھی میں یہ کلمہ نہیں چھوڑوں گا یا عالم میں اس کلمہ کو میں پھیلا کے رہوں گا یا اپنی جان قربان کردوں گا۔'' ①

اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا تو دنیا ہے چاند، سورج اور آسمان کی چمک دمک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکرا دیا یہ کلمہ جب تک میرے پاس ہے، نہ مجھے چاند عزیز ہے نہ سورج۔ معلوم ہوا یہ کلمہ چاند، سورج سے بھی زیادہ اونچی چیز ہے۔ یہ اللہ کا نام ہے۔ اللہ کے نام سے ہی تو عالم زندہ ہے چاند، سورج بے چارے کی حقیقت کیا ہے۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے۔ جس کے لفظ اس قسم کے ہیں کہ میں اس نام سے التجا کر رہا ہوں جو تو نے قرن شمس پر لکھا ہے۔ آفتاب کے اوپر جو آپ نے نام لکھا ہے جس کی وجہ سے آفتاب کو زندگی ملی ہے میں اس نام سے تیرے سے دعا کرتا ہوں تو چاند اور سورج کی زندگی اللہ کے نام سے ہے۔ عرش عظیم اگر زندہ ہے۔ تو اس کے پایوں پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسی نام سے وہ قائم ہے تو ذکر اللہ اور نام خداوندی سب سے اونچی چیز ہے۔ اس کے مقابلے میں سورج، چاند حتی کہ عرش و کرسی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ عرش و کرسی کی عظمت بھی تو اللہ ہی کے نام سے ہے۔ اگر اللہ میاں عرش و کرسی سے اپنے نام کو جدا کردیں تو ہزار عرش و کرسی ہوں، کوئی وقعت نہیں لیکن چونکہ اللہ کے نام سے لگ گئے ہیں، اس واسطے وہ باعظمت بن گئے۔

قلب محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ذکر اللہ کا خزانہ ہے...... اس سے اندازہ کیجئے کہ سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی اور لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی اس لئے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے اور ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

---

① فی ظلال القرآن للسید قطب المصری، ج:۷، ص: ۲۹۳، سورۃ القلم۔

② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

اللہ کے اسم مبارک کا وزن...... حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ میدان محشر میں ایک شخص حاضر ہوگا اور گناہوں کے ننانوے دفتر اسکے ساتھ ہوں گے یعنی اتنے گناہ کئے ہوں گے کہ ننانوے دفتر گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ایک ہی دفتر اتنا بڑا ہوگا کہ اسے پھیلایا جائے تو زمین و آسمان اس میں چھپ جائیں تو بقایا اٹھانوے دفتر کتنے بڑے ہوں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ جہانوں میں اس کی سمائی نہیں ہوگی۔ وہ میدان محشر میں حاضر ہوگا حق تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی وہ دفتر سامنے رکھے جائیں گے اور وہ دل میں یقین کئے ہوگا کہ میری نجات کی کوئی صورت نہیں ننانوے دفتر جو ہیں۔

تو یہ تیار ہے کہ حق تعالیٰ ابھی حکم دیں گے کہ اسے جہنم میں پہنچاؤ یہ اسی قابل ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے! یہ گناہ تونے کئے؟ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے کئے فرمائیں گے تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ کہے گا کہ اے اللہ! کوئی عذر نہیں، محض اپنی سیاہ بختی، شقاوت اور بدنصیبی سے میں نے یہ برے اعمال کئے۔ کوئی حجت میرے پاس نہیں میں نے اپنے نفس کی خواہشات پوری کی ہیں۔ لذات نفس میں گرفتار تھا۔ کسی حجت اور دلیل سے میں نے یہ گناہ نہیں کئے۔ اب اسے یقین ہے کہ ابھی حکم ہوگا کہ اچھا پھر جا جہنم میں۔ تیرا ٹھکانا ہمارے پاس نہیں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے، تیرے ان ننانوے دفتروں میں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ایک چھوٹی سی پرچی نکلے گی کہ ساری عمر میں اس نے نیکی کیا کی؟ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' یہ کلمہ پڑھا گویا بس مسلمان تھا۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھا، یہی ایک نیکی باقی کوئی اور نیکی اس کے پاس نہیں تو ننانوے دفتروں میں نیکی کی ایک چھوٹی سے پرچی پڑی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری ایک نیکی یہی ہے اور جا کر میزان عمل میں اپنا نامہ اعمال تلوا اور اپنی نگرانی میں تلوا وہ بندہ عرض کرے گا کہ اے اللہ آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔

''رَبِّ مَا هٰذِهِ الْبِطَاقَةُ؟'' اے اللہ! ان ننانوے دفتروں کے مقابلے میں یہ ذرا سی پرچی کیا حقیقت رکھتی ہے؟ میں تو جہنم کے قابل ہوں، مجھے جہنم میں بھیج دیجئے میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، نہیں ﴿لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ﴾ ① ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے۔ رتی رتی کا حساب ہوگا ان اعمال کو جاکے تلوا اور اپنی آنکھوں کے سامنے تلوا کبھی تجھے یہ خطرہ پیدا نہ ہو کہ میرے فرشتوں نے تیرے اوپر کوئی ظلم کر دیا یا ناپ تول میں کوئی کمی کر دی۔

یہ پھر عرض کرے گا، یا اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔ فرمائیں گے نہیں تلوا جاکے، یہ تلوائے گا تو ایک پلڑے میں ننانوے دفتر رکھے جائیں گے دوسرے پلڑے میں یہ پرچی رکھی جائے گی۔ جب تولیں گے تو ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے اور پرچی کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور تول میں غالب آجائے گا فرمائیں گے تیرے لئے

① پارہ: ۲۴، سورۃ المومن، الآیۃ: ۱۷.

جنت اور نجات ہے اور وجہ بیان فرمائیں گے۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ① اللہ کا ذکر سب سے وزنی چیز ہے تو لاکھوں برس کے گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کر لے اس توبہ کا وہ وزن ہے کہ لاکھوں برس گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کر لے اس توبہ کا جو وزن ہے وہ عالم کی کسی چیز کے اندر نہیں ہے۔ اس کو نجات دے دی جائے گی تو یہ ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ② کہ ایک ذرا سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آ گئی خدا جانے اس نے کس اخلاص سے یہ اللہ کا نام لیا ہوگا کہ اس اخلاص کے وزن نے ہر چیز کو ہلکا کر دیا۔ ③

حضورِ قلب سے ذکر میں وزن پیدا ہوتا ہے...... اصل میں وزن جو ہے وہ اخلاص کا ہوتا ہے۔ ہم رات دن اللہ اللہ کہتے جائیں لیکن غفلت کے ساتھ کریں۔ روح کے اندر بے داری اور دل میں خلوص نہ ہو، دنیا کے دکھلاوے کے لئے ہو، تو اللہ اللہ تو کیا مگر یہ اللہ اللہ ڈھانچہ ہے۔ اس میں روح نہیں ہے جس سے قدر و قیمت بڑھتی ہے اور وزن قائم ہوتا ہے۔ یہ وزن درحقیقت وہ یادِ حق ہے صرف اللہ اللہ کہہ دینا کافی نہیں۔ جب تک کہ لفظ اللہ کے ساتھ دل کی یاد بھی شامل نہ ہو زبان سے اللہ اللہ ہو اور دل میں غفلت بھری ہوئی ہو جس کو مولانا رومی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ

برزبان تسبیح ، درد دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر تو تسبیح جاری ہے، مگر دل میں گھربار کے خیال بھرے ہوئے ہیں۔ بات دوکان کی سوچ رہا ہے اور زبان پر اللہ اللہ جاری ہے یہ ذکر تو ہے مگر قلبی ذکر نہیں، زبانی ذکر ہے۔ تو جو زبان سے اللہ اللہ کہا جائے، دل ساتھ نہ ہو، وہ کافی نہیں وہ بلا روح ڈھانچہ ہے۔ وہ ڈھانچہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی کوئی وقعت نہیں کسی پہلوان کا لاشہ پڑا ہوا ہو اور بڑا ڈیل ڈول کا ہو مگر انتقال ہو چکا ہو اس کی کیا قدرت و قیمت ہے؟ اور ایک دق زدہ مریض ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں مگر زندہ ہے اس کی وقعت ہے اگر اسے کوئی قتل کر دے گا تو پھانسی چڑھے گا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب! یہ تو ایک منٹ میں خود ہی مرنے والا تھا۔

آپ مجھے کیوں پھانسی دیتے ہیں یہ مرتا ہی تھا میں نے لاٹھی ماری مر گیا۔ کہا جائے گا کہ جاندار کو مارا ہے۔ جان پر حملہ کیا اس لئے تجھ سے قصاص لیا جائے گا۔ اور پہلوان کی لاش پر پچاس لاٹھی مار دے کوئی قصاص نہیں اس لئے کہ اس میں جان ہی نہیں تھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں پتھر کی زیادہ قیمت ہے لاش کی کوئی قیمت نہیں۔ ایک پتھر آپ کا چند روپے میں بک جائے گا۔ اور لاش دس پیسے میں بھی نہیں بکے گی۔ اس واسطے کہ پتھر کو ستون بنائیں کھڑا کر کے عمارت بنائیں گے۔ اور لاش کو آپ کہاں کا ستون بنا دیں گے؟ وہ کسی کام کی نہیں وہ یا تو دفنائی جائے، یا جلائی جائے، یا بہائی جائے، اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ تو اصل میں قدر و قیمت جان سے ہوئی۔ اللہ اللہ کرنا،

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ السنن للترمذی، ابواب الایمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی من یموت وھو یشھد...... ج: ۹، ص: ۲۳۲، رقم: ۲۵۶۳۔

نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا ایک ڈھانچہ ہے۔ اس کی روح ذکر اللہ یعنی یادِ حق ہے۔ دل میں بےداری، تنبہ اور اللہ سے لگاؤ یہ روح ہے جب یادِ حق نہیں تو زبان سے کتنے ہی لفظ ادا کرلیں ان کی کوئی قیمت نہیں جب تک لفظ کے اندر معنی نہ ہوں معنی کی اصل میں قدر و قیمت ہے۔ تو قیامت کے دن ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① کا ظہور ہوگا کہ ایک اتنی سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آئے گی اس لئے کہ اس نے صرف لفظ اللہ نہیں کہا تھا بلکہ اللہ کہنے میں اس کا اخلاص اور قلب کا لگاؤ شامل تھا۔ تو ذکر کے معنی اللہ اللہ کہنے کے نہیں، ذکر کے معنی دل کے بیدار ہونے کے ہیں کہ یاد رکھی ہوئی ہو اس یاد سے کلمات جو نکل رہے ہوں وہ کلمات یادِ خداوندی کے اندر ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذکر اللہ کہلاتے ہیں۔ وہ جب دل میں ہوگا تو چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی کہے گا اس کی بھی قدر و قیمت ہوگی۔

الفاظ میں جذباتِ قلب سے تاثیر پیدا ہوتی ہے...... اللہ والوں کے چھوٹے جملوں میں بھی جو تاثیر ہوتی ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں ہوتی وہ لفظوں کے اندر معنی اور دل کی یاد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر ہوتی ہے۔ جو دلوں پر پڑتی ہے۔ ورنہ محض شاعری کی کیا تاثیر ہے کوئی بڑا اچھا فصیح و بلیغ کلام بول دے شاعروں سے بڑھ کر فصیح و بلیغ کون ہوگا۔ لیکن شاعر پچاس غزلیں پڑھ لیں اثر کچھ بھی نہیں ہوتا لوگ واہ واہ تو کر دیں گے لیکن آگے اس کا کوئی اثر نہیں لوگ دل میں کچھ نہیں لے کے جاتے اسلئے کہ اس کے اندر معنی نہیں ہیں محض لفاظی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شاعر کسی امیر کے ہاں گئے تھے۔ تو انہوں نے جا کے وہاں قصیدہ پڑھا اور شعر ہے ہی وہ جس میں جھوٹ زیادہ ہو اور سچ کم ہو اگر شعر کے اندر ساری سچی پکی باتیں ہوں، وہ شعر ہی کیا ہوا؟ تو جب تک اس میں مبالغے اور بہت سی باتیں جھوٹ نہ ہوں، شعر بنتا نہیں کسی نے کہا ہے کہ شعر کی تعریف کیا ہے کہ "اَحْسَنُهٗ اَكْذَبُهٗ" جو سب سے زیادہ جھوٹا شعر ہوگا وہ سب سے زیادہ عمدہ شعر ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہوگا تو لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ معنی اس کے اندر نہیں ہوتے۔ خیر وہ شاعر صاحب ایک لمبا چوڑا قصیدہ نواب کی شان میں لکھ کے لے گئے اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپ کا جو تختِ سلطنت ہے اس کا پایہ آسمان کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ اور آپ کی کلاہ تاج ہے اس کا کنگرا ساتویں آسمان تک پہنچا ہوا ہے، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ثریا بھی ماند ہے اور چاند کی کوئی روشنی ہی نہیں جو آپ کی آنکھوں میں چمک ہے اور آپکے ہاتھ میں جو قوت ہے تو بجلی بھی وہ کام نہیں کرسکتی، جو آپ کا ہاتھ کرے گا غرض ایران توران کی ہانکی۔

امیر صاحب بہت خوش ہوئے کہ اس نے بڑی تعریف کی تو قصیدہ سنتے ہی کہا کہ پرسوں آنا تمہیں ہم دو ہزار روپیہ انعام دیں گے یہ بہت خوش ہوگئے اور جاتے ہی پانچ سو روپے قرض بھی لے لئے اور گھر میں مرغا بھی پک رہا ہے اور لراس وغیرہ بھی خوب بنائے کہ پرسوں کو تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو قرضے کے ادا کر دیں گے تو ان میں سے پھر بھی باقی بچ جائیں گے مجھ سے زیادہ اب امیر کون ہوگا۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

چنانچہ وہ حسب وعدہ بڑی عمدہ شیروانی پہن کر وہاں پہنچ گئے، اب وہ امیر صاحب بیٹھے ہیں، نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے، انہوں نے سلام کہا، انہوں نے گردن بھی نہیں اٹھائی، تھوڑی دیر تو یہ بیٹھے اس کے بعد کھنکارنا شروع کیا، مگر امیر صاحب نے جب بھی کچھ نہیں سمجھا آخر یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضور میں حاضر ہوں۔ آپ کون ہیں؟ وہی جو پرسوں شاعر آیا، قصیدہ کہا تھا تو حضور نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دو ہزار دیں گے، میں اس وعدے کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، ارے بھائی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا تھا۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا تھا۔ نہ ان لفظوں کے کوئی معنی تھے نہ ان لفظوں کے کوئی معنی۔ جو قصیدہ تم نے کہا تھا اس کے لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں تھے اور ہم نے جو دو ہزار کے لفظ کہے تھے تو ان لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں۔ بڑے بے وقوف آدمی ہو تمہیں صلہ مل چکا۔ اس نے کہا حضور! میں تو پانچ سو روپے قرض بھی لے چکا ہوں اگر تم نے لئے تو جھک مارا۔ کس نے تم سے کہا تھا؟ معلوم ہوا تم بے وقوف بھی ہو شاعر نہ ہوتے، عقلمند تو ہوتے عقل کی کچھ تو قیمت ہوتی۔

تو حقیقت یہی ہے کہ لفظوں کی کوئی قدر قیمت نہیں ہوتی جب تک لفظوں کے اندر معنٰی نہ ہوں اور معنٰی کے اندر دلی جذبات نہ ہوں اس وقت تک لفظوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم جیسا کوئی اللہ اللہ کرے گا تو وہ محض زبان سے ہوگا، دل کی بیداری شامل نہیں ہوگی اور اللہ والے جو اللہ اللہ کرتے ہیں۔ تو دل کا ذکر، محبت و معرفت، لگاؤ نسبت اور تعلق اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس لئے جو لفظ نکلتے ہیں وہ قلوب کے اوپر تاثیر کرتے ہیں۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ جو سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے صاجزادے مولانا رکن الدین پڑھنے کے لئے دہلی گئے۔ اور آٹھ دس برس کے بعد بڑے اچھے عالم بن کے آئے۔ مریدین نے عرض کیا، حضرت! صاجزادے عالم بن کے آئے ہیں اگر وعظ کرا دیا جائے۔ فرمایا، ہاں بھئی! ضرور وعظ کہلاؤ جب علم پڑھا ہے تو علم کا اثر ظاہر ہو، دوسروں کو مسائل معلوم ہوں۔ صاجزادے کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ وعظ کہا تمام لوگ خوش ہوئے بہت سے مسائل بیان کئے لوگوں نے مسائل سیکھے، تعریف کی لیکن کوئی خاص اثر پیدا نہ ہوا کہ لوگ رونے لگے ہوں یا آپے سے باہر ہوئے ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں بس یہ ہوا کہ بہت اچھے صحیح مسئلے بیان کئے دل میں قدر و قیمت تھی۔

جب مولانا رکن الدین وعظ کر چکے، تو حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ منبر کے قریب کھڑے ہوئے ایک جملہ کہا، فرمایا، ''بھائی! رات عجیب بات پیش آئی، رکن الدین کی ماں نے فقیر کے لئے کھیر پکائی تھی، وہ کھیر پکا کے کھونٹے پہ رکھ دی، بلی آئی اور کھا کے چلی گئی فقیر محروم رہ گیا۔'' بس یہ کہنا تھا کہ ایک دم جو لوگوں پر گریہ طاری ہوا اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور مسجد میں ایک طوفان بپا ہو گیا اب اس میں آخر کیا چیز تھی؟ کھیر پکی رکھی تھی، بلی آئی وہ کھا گئی تو یہ کون سے حقائق و معارف تھے؟ مگر حقیقت میں وہ جو قلب کی تاثیرات تھیں ان تاثیرات نے ان الفاظ کو آلہ بنایا اور الفاظ نے کانوں کو کھٹکھٹایا اور دل کی تاثیر الفاظ کے راستے سے دل پر پڑی اور دلوں میں محبت الٰہی بھری اور

انہوں نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ تو یہ لفظوں کا اثر نہیں تھا۔ شیخ کے قلب کا اثر تھا۔ اصل میں اہل اللہ دل میں اثر ڈالتے ہیں۔ الفاظ محض ان کا آلہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی قیمت نہیں ہوتی۔ کسی اللہ والے کے پاس سے آپ قلب میں کوئی اثر لے کے جائیں کوئی آخرت کا دین کی عظمت ومحبت کا، وہ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا، وہ قلب کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اس کے قلب میں کوئی اثر نہ ہوتا وہ بہتر سے بہتر لفظ کہتا آپ اس سے کوئی بھی اثر نہ لیتے۔ لفظ تو اثر نہیں کرتے، وہ معانی کرتے ہیں تو معانی لفظوں کے اندر وہی ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ وہی تاثیر وتصرف ہے جس سے قلوب جگمگا اٹھتے ہیں۔ قلوب کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① سب سے زیادہ وزنی چیز، سب سے زیادہ پُر عظمت چیز وہ اللہ کی یاد ہے کہ دنیا و مافیہا اللہ کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یادِ حق دل میں آجائے تو بندہ عرشی ہو جاتا ہے...... جب بندے کے دل میں یہ یاد آجاتی ہے تو لاکھوں سلطنتیں ایک طرف اور یہ چیز ایک طرف، اس کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانداری بہت تھی اور مریدین کا ہجوم رہتا تھا۔ دو اڑھائی سو تک آدمی، ان کے مریدین میں سے نواب میر خاں جو ہندوستان میں ریاست ٹونک ہے، اس کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاں مہمانداری بہت ہے اور کوئی دولت، جاگیر، جائیداد ہے نہیں ہے تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک ضلع ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا کہ یہ میں آپ کو دیتا ہوں اس کی ہزاروں روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ مہمانوں کا خرچ چلے گا اور وہ پیتل کے پترے پہ لکھ کے بھیجا کہ یہ میں بنام حضرت شاہ غلام علی عطیہ دیتا ہوں۔ یہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ آپکے مرید نواب میر علی خاں ہیں۔ انہوں نے یہ پورا ضلع ہدیہ پیش کیا ہے۔ اس کی پشت پر شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ایک شعر لکھ کے بھیج دیا جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ شعر یہ تھا کہ:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ـــــ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے اور وہ آسمان سے آرہی ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ یہ اتنی استغناء اور اتنی بیداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دل کے اندر کوئی دولت جمع نہ ہو وہ دولت یہی ذکر اللہ کی تھی۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے تو ضلع، صوبہ، پوری دنیا کیا چیز ہے، ذکر اللہ کے سامنے چاند اور سورج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب وہ قلب میں آجاتا ہے تو بندہ پھر عرشی بن جاتا ہے عرش کے اوپر کی باتیں کرتا ہے نیچے کی نہیں کرتا تو یہ ہے وہ

①② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

ذکراللہ جو ساری شریعت اور کائنات کی روح ہے۔ اگر اس دنیا میں سے ذکر خداوندی نکل جائے، اسی دن قیامت آ جائے اور یہ خیمہ ختم کر دیا جائے اور اگر کسی کے قلب میں سے نکل جائے اسی دن ایمان و اسلام ختم ہے۔ کسی قوم میں سے نکل جائے، وہ قوم بھی بے عزت، اس کی آبرو اور عزت بھی ختم۔ تو ہر چیز میں دولت، عزت حکومت کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین و دیانت، یاد الٰہی اور یاد خداوندی شامل نہیں ہوتی اس وقت تک عالم میں کوئی چیز زندہ نہیں ہوتی کیونکہ سب چیزوں کی روح یہ ہے۔

ذکراللہ کا مظہر اتم...... اس کا سب سے بڑا مظہر اتم جس سے ذکر الٰہی ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ نماز تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سے پہلے فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① نماز فحش سے، بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے بچاتی ہے، جو شریعت میں گناہ ہیں۔ ان سب چیزوں سے نماز بچاتی ہے اور آگے بطور دلیل کے فرمایا، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ② نماز کی روح ذکر ہے اور ذکر سب چیزوں سے بڑا ہے۔ ذکر کی روشنی جب آئے گی تو کوئی ظلمت اور تاریکی اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتی گناہ ہو، کچھ ہو، سب ختم ہو جائے گا۔

اس سے ایک شبہ کا جواب نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو خوب پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، مسجدیں بھی بنواتے ہیں، لاکھوں روپے بھی اس میں لگواتے ہیں اور بچے بچے کو لاتے ہیں مگر اس کے باوجود منکرات میں مبتلا ہیں۔ بعض بے غیرتی اور بے حیائی کی باتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ نمازی بھی ہیں۔ مگر یہ حرکتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ نماز فحش اور منکرات سے بچا دیتی ہے۔ حالانکہ ہم نمازی بھی ہیں پھر بھی منکرات میں مبتلا ہیں۔

اس شبہ کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ آپ اس سے مقابلہ کیجئے جو بالکل نماز نہیں پڑھتا۔ اس میں کتنے منکرات ہیں اور نمازی میں کتنے ہیں۔ زمین و آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نماز پڑھنے والا اگر مبتلا بھی ہوگا تو اتنی برائی نہیں ہوگی جتنی بے نمازی کے اندر ہوتی ہے۔ نمازی کے دل میں پھر بھی خوف خدا تھوڑا بہت موجود ہوگا تو ایک جواب تو یہ ہے، جو سرسری ہے کہ اللہ کا ذکر اور نماز بلا شبہ منکرات سے، بچاتی ہے۔ آپ نہیں بچ رہے ہیں۔ تو یہ اصل میں زیادہ میں مبتلا نہیں، کم میں مبتلا ہیں۔ جو بالکل نماز نہیں پڑھتے وہ اس سے زیادہ میں مبتلا ہیں تو کسی نہ کسی حد تک تو آپ کو نماز نے بچا دیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ہمارے مرشد بھی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی ہیں۔ ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے استاذ اور مولانا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ یہ دارالعلوم کا ابتدائیہ ہے کہ دو محمودوں سے ابتدا ہوئی۔

الٰہی عاقبت محمود گرداں

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

جب ابتدا محمود ہے تو ان شاء اللہ عاقبت بھی محمود ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ سادات میں سے تھے۔ مگر ہیں سرحدی تو وہاں کے سادات کو بھی خان ہی کہتے ہیں۔ سب پٹھان کے لقب سے معروف ہیں۔ پٹھان اور خان گویا ان کے ہاں ایک عظمت کا لفظ ہوتا ہے۔

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں کے اخبارات نے شائع کیا کہ مولانا محمد طیب خاں حالانکہ میں پٹھان نہیں۔ مگر وہ خان عزت وعظمت کا لفظ ہے۔ تو مولانا عزیر گل صاحب گویا انہیں عرف کے لحاظ سے سرحدی پٹھان کہنا چاہئے یوں تو سادات میں سے ہیں۔ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں بڑے دخیل تھے اور بعض دفعہ اتنے جوش سے بات چیت کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے سے چھوٹے سے بات کر رہا ہو یعنی اتنے دخیل تھے کہ بعض دفعہ بے ادبی کی بات ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح بخاری کے درس میں انہوں نے سوال کیا اور کہا حضرت! یہ مسئلہ کیسے ہے؟ حضرت نے سرسری جواب دے دیا بس کہنے لگے کہ خود کو نہیں آتا اور سرسری جواب دے کے آگے چل دیئے پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے اور جواب دینا آتا نہیں تو اس طرح سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ ان کی عام بات تھی کہ جب ہم لوگوں سے گفتگو شروع کرتے تو ''آپ'' سے شروع کرتے آپ نے یہ کہا، آپ نے یہ کہا۔ اس کے بعد جب جوش آتا تو ''تم'' کہتے، تم نے یہ کہا، تم نے یہ کہا۔ اس کے بعد ''تو'' نے یوں کہا، تو نے یوں کہا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ارے خبیث تو نے یہ کیوں کہا۔ تو ''آپ'' سے شروع ہو کر ''خبیث'' پہ انتہا ہوتی تھی۔ ان کا ایک عام طرز تھا۔ تو بے تکلف بہت اور حضرت کی شان میں بعض جگہ بے ادبی کے کلمات کہہ دیتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عرض کیا کہ حضرت اتنے دنوں وہ آپ کی صحبت میں رہے اور انہیں تہذیب نہ آئی اتنے بے ہودہ اور بھدے کلمات کہہ دیتے ہیں۔ بیس پچیس برس آپ کی صحبت اٹھائی اور پھر بھی آدمی نہ بنے۔

حضرت نے فرمایا: یوں خیال کرو، اگر یہ بیس پچیس برس صحبت میں نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ جب رہ کر اتنے ہوئے، اگر بالکل نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ تو وہی میں کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھ کر اتنی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ بالکل نہ پڑھتے تو کیا ہوتے؟ اور کتنی برائیاں کرتے؟ تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ نمازی اگر مبتلا بھی ہوگا تو کم مبتلا ہوگا بے نمازی زیادہ مبتلا ہوگا۔

لیکن اصل جواب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اگر آدمی فحش سے نہیں بچتا، بے حیائی اور برائی سے سے نہیں بچتا اس نے نماز کا ڈھانچہ قائم کیا اور جو ذکر اللہ کی روح ہے، وہ قلب کے اندر نہیں ہے، روح ہوتی، یقیناً بچ جاتا۔ تو نماز بے حیائی سے بچاتی ہے۔ جب کہ نماز جاندار ہو اور اگر بے جان پڑھے جس کے اندر روح ہی نہ ہو تو لاشہ اور ڈھانچہ کوئی چیز نہیں وہ تو کام نہیں کر سکتا تو نماز بھی کام نہیں آسکے گی نماز اٹھک بیٹھک کا نام نہیں ہے۔ نماز عظمت خداوندی اور یاد حق کا نام ہے کہ دل اللہ کی یاد میں غرق ہے دوسری چیزیں دل سے فنا محض ہو جائیں تو جتنی

یا دزیادہ ہوگی، اتنا ہی بے حیائی سے بچے گا جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم بچے گا۔ بالکل نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے، جب بھی نہیں بچے گا اس لئے کہ جان تو ہے ہی نہیں تو اصل جواب یہ ہے کہ نماز بلاشبہ فحش سے بچاتی ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کا کلام حق ہے۔ ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① یقیناً نماز بے حیائی سے اور منکرات سے بچاتی ہے۔ بچاتی کیوں ہے؟ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اس لئے کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ③ نماز ذکر اللہ ہی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ذکر روح ہے اگر روح نہیں ہوگی تو نہیں بچائے گی۔

روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے...... لیکن میں اتنی بات عرض کئے دیتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھئے کہ پورا ذکر تو ہے نہیں، ہماری نماز تو صورت ہی صورت ہے۔ یہ برائی سے بچاتی نہیں، تو آج سے اسے بھی چھوڑ دو اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا نہیں اس صورت کو قائم رکھو اس لئے کہ جو صورت بنا رہا ہے تو وقت آئے گا کہ اس صورت میں ہی روح آ جائے گی اگر صورت ہی نہیں بنے گی تو پھر روح کس میں آ کر پڑے گی؟ اس واسطے اس صورت کو بھی قائم رکھو۔ اگر روح نہ ہو، شکل اس کی بنائے رکھو اچھی شکل میں اچھی حقیقت آ جاتی ہے۔ آج نہیں آئے گی، کل آئے گی پڑھتے پڑھتے کسی دن تو خیال ہوگا کہ بھئی! یہ جو محض رسمی اور تصویری کی نماز پڑھ رہا ہوں، یہ بے کار نہ جائے۔ اس میں جان پیدا کرو تو پڑھتے پڑھتے چند دن کے بعد دھیان آ سکتا ہے۔ اور روح بن جائے گی اس واسطے چھوڑنا اسے بھی نہیں چاہئے جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ۔

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام   اللہ اللہ کردہ باید والسلام

تم اللہ اللہ کرو، دنیا کے لئے کرو، دکھلاوے کے لئے کرو، نام و نمود کے لئے کرو، کرتے رہو اس لئے کہ کرتے رہو گے تو اسی میں اخلاص بھی آ جائے گا اور بالکل ہی گھر نہ بناؤ تو مسافر آ کے ٹھہرے گا کہاں؟ تو گھر بنا لے، ممکن ہے ذکر اللہ کا مسافر آ جائے اور آ کر اس کے اندر مقیم ہو جائے۔ تو چاہے ریاکاری کی نماز ہو، چاہے بے دھیانی کی ہو، قلب میں کچھ نہ ہو مگر فرض ادا کرتے رہو صورت ہی ان شاء اللہ چند دن کے بعد اپنی طرف کھینچ لے گی تو یہ وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ جب اس میں روح نہیں تو پڑھنے سے فائدہ کیا؟ فائدہ ہے کم سے کم مفتی فتویٰ دے رہا ہے کہ نماز ہوگئی اسے دل کی خبر نہیں اور جب اللہ کی ہزاروں مخلوق نمازی کہے گی تو عند اللہ بھی معتبر ہوگی۔ تو جب سرکاری گواہوں نے گواہی دے دی کہ فلاں آدمی نمازی ہے تو عند اللہ بھی نمازی ہے۔ تو کیا خبر ہے کہ یہ نمازی کی صورت ہی آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے اس لئے چھوڑنا نہیں چاہئے۔

بہر حال مجھے اس ساری آیت سے کلام کرنا نہیں تھا کہ میں نماز کی حقیقت بیان کروں اور پھر یہ بیان کروں کہ نماز کس طرح منکرات اور بے حیائی سے بچاتی ہے بلکہ صرف ذکر اللہ کے بارے میں چند باتیں کہنی تھیں جو

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

آیت کا دوسرا جز ہے، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① وہ بھی اس لئے کہ وہی سارے عالم اور ساری شریعت کی روح ہے۔ شریعت سے ذکر اللہ نکل جائے تو شریعت کے اعمال ڈھانچہ بن جائیں گے۔ دنیا کے اندر ذکر اللہ نہ رہے، تو یہ دنیا بے جان لاشہ بن جائے گی اور ختم ہو جائے گی اس واسطے ذکر اللہ کی رعایت کرنی چاہئے۔

ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت...... اور اس کے لئے سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتلائے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی بچے کو وہ یاد کرا دئے جائیں۔ موقع بموقع کی دعائیں ہیں۔ ان کو ذکر کثیر کہا گیا ہے تو جب وہ دعائیں پڑھائیں گے تو قرآن حکیم میں جو حکم ہے کہ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ ② اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثیر کرو تو کثرت ذکر کیا ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرت ذکر یہ کہ مختلف اوقات میں جو اذکار اور دعائیں آتی ہیں وہ ان اوقات میں پڑھی جاتی رہیں، تو ذکر کثیر ہو گیا مثلاً جب چارپائی پر سونے کے لئے لیٹیں تو اس کی دعا الگ ہے کہ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى." ③ یا سو کے اٹھیں اس کی دعا الگ ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَمَآ اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ." ④ یا کھانا کھانے کے بعد کی دعا ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ." ⑤ یا استنجا کے لئے جائے پاخانے میں بایاں قدم رکھے اور کہے کہ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ." ⑥ اور جب واپس آئے تو دایاں پاؤں پہلے رکھے اور کہے: "غُفْرَانَكَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ." ⑦ یا جب لباس پہنے تو پڑھے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ." ⑧ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِهٖ وَخَيْرِ مَاصُنِعَ لَهٗ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ." ⑨

یا مثلاً بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے۔ کہ "اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا" ⑩ اولاد مقدر ہوگی تو صالح اولاد پیدا ہوگی۔ یا مثلاً بازار جائے تو بازار میں جانے کی دعا یہ ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ صَفْقَةً رَابِحَةً وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ صَفْقَةٍ خَاسِرَةٍ" ⑪ "وَلَفْظُهٗ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۱. ③ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب مایقول اذاطعم، ج: ۱۰، ص: ۳۳۳، رقم: ۳۳۵۲. ⑥ الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب مایقول عندالخلاء، ج: ۱ ص: ۲۴۲ رقم: ۱۳۹.

⑦ السنن لابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۳۵۲ رقم: ۲۹۷. ⑧ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب بلاترجمۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۷ رقم: ۳۵۰۵. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۳. ⑨ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب اذا لبس جدیدا، ج: ۱۱ ص: ۳۶ رقم: ۳۵۰۴.

⑩ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب التسمیۃ علیٰ کل حال، ج: ۱ ص: ۲۴۴ رقم: ۱۳۸.

⑪ المعجم الاوسط للطبرانی، باب من اسمہ: محمد ج: ۱۲ ص: ۲۷۰. علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن ابان الجعفی وھوضعیف، دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مایقول اذا دخل السوق ج: ۴ ص: ۳۹۸.

وَخَيْرَ مَا فِيهَا، وَاَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُصِيْبَ فِيهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً." "اے اللہ! میں نفع کا سودا چاہتا ہوں اور گھاٹے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں"۔ یا سورج نکلے تو دعا بتلائی گئی ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَنَا الْيَوْمَ عَافِيَةً وَجَآءَ بِالشَّمْسِ مَطْلَعِهَا." ①

توہر موقع کا ایک ایک ذکر ہے۔ یہ اذکار علماء نے چھاپ بھی دیئے ہیں۔ اگر بچے کو ابتداء سے یہ یاد کرا دیئے جائیں، تو یہ موتی ان کے قلوب میں بھر جائیں گے اور زندگی اسلام بن جائے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی کہ پاخانے جاتے ہوئے یہ، کھانے کے وقت یہ، لباس پہننے کے وقت یہ، دوستوں سے مصافحہ کرو، تو یہ، کسی سے ملے تو یہ، عادت پڑ جائے گی تو اسی سے اسلامی زندگی بنتی ہے۔ یہ ذکر کثیر مفت میں ہاتھ آ جاتا ہے۔ تو بڑی آسان بات یہ ہے کہ بچوں کو یاد کرا دی جائیں اور بڑے بھی اگر یاد کریں، تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں ساری یاد ہو سکتی ہیں۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ یہ دعائیں نہیں ہوں گی، زیادہ ہوا تو سو ہو جائیں گی۔ تو ایک دن میں اگر ایک دعا یاد کر لے اور چار مہینے لگ جائیں، تو تین چار مہینے میں پورا دین حاصل ہو جائے یہ بڑے نفع کا سودا ہے، کوئی گھاٹے کی بات نہیں۔ تین مہینے میں نہیں، چار مہینے سہی اور بچے تو بہت جلدی یاد کرتے ہیں۔ چند دن میں یاد ہو جائیں گی اس طرح ذکر کثیر کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کر لیا جائے کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک آدھ گھنٹہ آدمی اللہ میاں کے لئے دے دے چوبیس گھنٹے دنیا کی ضروریات کے واسطے اگر اس میں کچھ وقت اللہ کے نام پر نکال دے تو کون سے بڑی بات ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ساری زندگی اللہ کی ہوتی، چھوٹا موٹا وقت دنیا کے کاموں کے لئے ہوتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں چلو تم سارا ہی وقت دنیا کے کاموں میں لگا دو تھوڑا سا وقت اللہ کے لئے دو۔ تو روزانہ صبح کے وقت بیٹھ کر ایک سو مرتبہ کلمہ تمجید، "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ." ② سو مرتبہ استغفار، "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ." ③ اور سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا جائے اور وہ مختصر یہ ہے: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ."

یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ایک بیس منٹ کی بات ہے۔ لیکن ذکر کثیر کی دولت مفت میں حاصل ہو جاتی ہے تو سوتے وقت بھی پڑھ لے اور صبح کو بھی پڑھ لے۔ دونوں وقت نہ سہی، چلو صبح کی نماز کے بعد پڑھ لو صبح نہیں تو سوتے وقت آدھ گھنٹہ دے دو تو آدمی ذکر اللہ کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا اور ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ④ کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ آدمی اگر دیندار بننا چاہے تو دین بڑا آسان ہے۔ دنیا کمانی بڑی مشکل ہے۔ دنیا اس

---

① حدیث محل کلام ہے۔ عمل اليوم والليلة، ج: ١ ص: ٢٧٧ رقم: ١٣٦۔ ② الصحيح لمسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح، ج: ١٣ ص: ٢٠٥ رقم: ٤٨٦١۔ ③ السنن لابي داؤد، كتاب الصلوة، باب في الاستغفار، ج: ٤ ص: ٣١٣ رقم: ١٢٩٦۔ ④ پارہ: ٢١، سورة العنكبوت، الآية: ٤٥۔

وقت تک نہیں آسکتی جب تک آپ چوبیس گھنٹے دماغ دوکان میں نہ لگائے رکھیں، ذکر اللہ اور دین آسکتا ہے۔اگر بیس منٹ بھی دے دیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تو دنیا کمانا مشکل اور دین کمانا آسان ہے۔لوگوں نے آسان کو چھوڑ دیا اور مشکل کو اختیار کر لیا تو۔﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کی فضیلت یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ مختلف اوقات کی دعائیں یاد کی جائیں اور یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ صبح ،شام یہ تین تسبیح پڑھ لیں اور نماز کی پابندی کی۔تو انشاء اللہ بہت سی برکات اسی سے پیدا ہو جائیں گی۔

اس واسطے میں نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں گذارش کیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ذکر اللہ کرنے اور یادِ خداوندی میں لگنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے دین کی ہمیں محبت عطا فرمائے اپنی اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلوب میں ڈال دے۔اس محبت سے عظمت پیدا فرمادے اور عظمت سے متابعت اور اطاعت و اتباع کی دولت نصیب فرمادے۔(آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ."

طریق اصلاح

”اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُ ہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا .“

اَمَّا بَعْدُ:

دنیا کی ایک عام حالت،تمہید...... بزرگان محترم!اس دنیا کی بناوٹ اور ساخت پر ہم غور کریں،تو اس سے یہ اندازہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دو سلسلے جاری ہیں۔ایک خیر اور بھلائی کا،ایک شر اور برائی کا، ہر چیز میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی ذوات کو چھوڑ کر کہ وہ خیر محض ہیں دنیا میں جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں کچھ بھلائی پائی جاتی ہے اور کچھ برائی۔نہ کوئی خیر محض ہے نہ شر محض۔ہر چیز میں سے ایک راستہ شر کا ایک اور ایک بھلائی کا نکلتا ہے۔روٹی جیسی نعمت جو ہم روز کھاتے ہیں،وہ جس طرح زندگی بناتی اور طاقت دیتی ہے۔ذرا بے اعتدالی ہو جائے،وہی موت کا سبب بنتی ہے۔یہی پانی،جس کے بارے میں فرمایا گیا، ﴿وَجَعَلْنَامِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ ① ہر چیز کو ہم نے پانی سے زندگی دی،یہی پانی اگر زیادہ پیا جائے تو تخمہ پیدا کر دیتا ہے۔یہی موت کا سبب بن جاتا ہے۔یہی ہوا حیات کا سبب ہے۔اگر یہی زیادہ پہنچ جائے،سانس اکھڑ جاتی ہے۔فنا کا سبب بن جاتی ہے۔اسی طرح سے زمین فرش بھی ہے اور قبر بھی بن جاتی ہے۔موت کا بھی ذریعہ ہے،حیات کا بھی۔تو ہر چیز میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔

انسان کو دیکھا جائے تو جہاں اس سے بھلائیاں پہنچتی ہیں کہ جتنی بھلائیاں یہ کرتا ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔یہی جب شر پر آتا ہے تو اس سے اتنی شر پہنچتی ہے کہ شیطان بھی اتنی نہیں پہنچا سکتا،جتنی راحتیں اس سے پہنچتی ہیں،اتنی ایذائیں بھی پہنچتی ہیں۔تو انسانوں میں کھانے میں،پہننے میں اور استعمال کی ہر چیز میں کچھ بھلائی ہے اور کچھ برائی۔

لیکن جہاں تک ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ برائی تو ہر شی کی ذات میں رکھی ہوئی ہے اور بھلائی باہر سے لا کر اس کے اندر داخل کی جاتی ہے۔ذات میں کوئی بھلائی موجود نہیں۔جدوجہد اور محنت کرتے ہیں تو کچھ خوبی

① پارہ: ۱۷ ،سورۃ الانبیاء ،الآیۃ: ۳۰.

آ جاتی ہے۔ اگر محنت نہ کریں تو خرابی لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود اندر موجود ہے۔

فرض کیجئے کھانا ہے تو اس کی عمدگی یہ ہے کہ خوش ذائقہ خوش رنگ اور خوشبو ہو ان صفات کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے کہیں آپ نعمت خانہ بنائیں گے، کہیں بہترین الماری بنوائیں گے جس کی جگہ بھی ٹھنڈی ہو، ہوا بھی پہنچتی رہے۔ تاکہ کھانا خراب نہ ہو تو کھانے کی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ کھانے کو سڑانا چاہیں کہ اس میں بدبو آنے لگے، خراب ہو جائے تو کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اپنی محنت چھوڑ دیجئے، دو دن کے بعد سڑ جائے گا۔ بدبو آنے لگے گی، رنگ بھی بگڑ جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ برائی اس کھانے کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم ہوئی وہ اندر کی برائی خود بخود سامنے آ گئی۔

یا مثلاً ایک بہت عمدہ باغ ہے تو اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، ہرا بھرا ہو، شاداب ہو، درخت لہلہا رہے ہوں، سبزہ چھایا ہوا ہو، ان خوبیوں کو دیکھ کر آپ مال بھی خرچ کریں گے، ملازم بھی رکھیں گے جو پانی بھی دے اور درختوں کی نگرانی بھی کرے تب جا کے باغ کی یہ خوبی برقرار رہے گی۔ لیکن اگر آپ باغ کو اجاڑنا چاہیں کہ وہ خشک ہو جائے اور جلانے کے قابل ہو جائے۔ تو نہ مالی اور تنخواہ دار ملازم رکھنے کی ضرورت، محنت بند کر دیجئے دس دن کے بعد وہ خراب، خشک ہو کر پتے جھڑیں گے، شاخیں ٹوٹیں گی۔ جلانے کے قابل ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس باغ کی ذات میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم کر دی۔ خرابی خود بخود اندر سے ابھر آئی۔ خرابی پیدا کرنے کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح مکان ہے۔ کئی لاکھ روپے لگا کر آپ نے بلڈنگ بنوائی۔ اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ملازم رکھنے پڑتے ہیں۔ تب مکان خوشنما اور بہتر طریق پر باقی رہے گا۔ لیکن اگر آپ مکان کو اجاڑ یا ویرانہ بنانا چاہیں، اس کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن کے لئے جھاڑو دینا چھوڑ دیجئے پہلے گرد جمے گا، پھر پلاستر گرے گا، پھر اینٹیں گریں گی۔ چند دن کے بعد مکان کھنڈر بن جائے گا، تو کھنڈر بنانے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں۔ عمدہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدگی کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ خرابی خود بخود بلا محنت اندر سے ابھر آتی ہے۔ یہ دنیا کی عام حالت ہے۔

برائی انسان کی ذات میں موجود ہے...... اسی پر اپنے آپ کو قیاس کیجئے۔ انسان بھی بہر حال دنیا ہی کی ایک چیز ہے۔ انسان کو قابل بنانے کیلئے محنت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی کو عالم بنائیں گے تو کسی مدرسہ میں بھیجنا پڑے گا، گھر پڑھائیں گے تو ایک عالم کو رکھنا پڑے گا۔ تنخواہ اسے الگ دیں گے خوشامد الگ کریں گے۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ الگ ہوگی کہ محنت کرے، تعلیم پائے تب جا کر وہ عالم بنے گا۔ لیکن جاہل بنانے کے لئے نہ آج تک کوئی مدرسہ کھلا نہ کسی معلم کو رکھا گیا کہ آپ ہمارے بچے کو جاہل بنا دیجئے۔ جاہل خود ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا

ہے۔علم کولانے کے لئے معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہالت ذات میں موجود ہے۔علم لاکر اسے چھپا دیا جاتا ہے جس کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے۔جیسے کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگِ خاراز آفتاب لعل گردد دربدخشاں یا عقیق اندر یمن

سالہاسال کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک پتھر آفتاب کی گرمی سہتے سہتے تپش اور جلن لیتے لیتے صدیوں میں جا کر لعل بدخشاں اور یاقوت بنے گا۔جس کی قیمت اٹھے گی تو یاقوت بننے کے لئے پتھر کو ضرورت پڑی کہ آفتاب کی گرمی کو سہے اس کی تپش کو جذب کرے تب جا کر لعل بنے گا۔لیکن پتھر بنانے کے لئے وہ تو پہلے سے بنا بنایا پتھر ہے۔لعل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ بے قیمت پتھر بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں تو شاعر نے خوب کہا کہ سینکڑوں برس ایک پتھر آفتاب کی کرنوں کو جذب کرے تب جا کے لعل بدخشانی بنتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ۔

ماہ ہا باید کہ یک پنبہ دانہ بعد کشت جامہ گردد شاہدے رایا شہیدے راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ بنولہ کا ایک دانہ، اسے زمین میں ڈالو، مہینوں وہ مٹی میں دبے، اپنی ہستی کو ختم کرے، اس میں سے کونپل نکلے، درخت بنے، اس میں روئی لگے، پھر روئی کو صاف کیا جائے پھر دھنا جائے، پھر کپڑا بننے والے کے ہاں بھیجا جائے کہ اس کے تار بنائے اور مشینوں پر لگائے کپڑا بنے، تب جا کے کپڑا کسی محبوب کا لباس بنے گا یا کسی شہید کا کفن بنے گا۔لیکن اگر یہ روئی کا دانہ محنت نہ اٹھائے۔نہ اسے کپڑا بننا نصیب ہوگا، نہ جامہ محبوب بننا نصیب ہوگا۔وہ محض ایک بنولہ کا دانہ ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔تو بنولہ کے دانے میں یہ کمال آ جانا کہ اس میں سے نکلی ہوئی چیز محبوبوں کے سر پر جائے، جب ہوتا ہے جب بنولہ کا دانہ محنت اٹھائے مٹی میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کرے، اور کاشت کار کی محنتوں کو سہے تب جا کے اس رتبے پر پہنچتا ہے۔کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑی اور بے کمالی پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔دانہ پڑا پڑا خود ہی خراب ہو جائے گا اور خوب کہا ہے۔اسی شاعر نے کہا۔

سالہا باید تا یک کود کے از درس علم عالمے گرد و نکو، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت چاہئے کہ آدمی کا ایک نادان بچہ میاں جی کی مصیبتیں سہے۔مکتب میں جائے، نو برس تک مصیبتیں اٹھا کر کورس کو حاصل کرے تب جا کے عالم یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔لیکن اگر یہ محنت نہ اٹھائی جائے۔تو جاہل رکھنے کے لئے کسی قسم کی محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔بے محنت چھوڑ دو، جاہل بنا بنایا ہے تو جاہل بنانے کے لئے آج تک کوئی مدرسہ قائم نہیں ہوا۔کوئی کہے کہ بھئی ہمارے بچے کو جاہل بنا دو۔وہ کہے گا کہ جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔بنوانا چاہتے ہو تو عالم بنا دوں گا بشرطیکہ یہ بھی محنت کرے اور میں بھی محنت کروں۔تو خوبی محنت سے لائی جاتی ہے۔خرابی کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ خرابی ہر چیز کی ذات میں موجود ہے۔

بااخلاق بنانے کے لئے مربیوں کو محنت کرنی پڑے گی۔ مربیانِ دین کے سپرد کرنا پڑے گا، شیوخِ طریقت محنت کریں گے، اپنے مرید سے محنتیں کروائیں گے۔ جب جاکے برسہابرس میں اس کے اخلاق درست ہوں گے۔ تو خانقاہ اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اخلاق کو درست کریں کیریکٹر کی اصلاح کریں۔ انسان کو اعلیٰ انسان بنائیں۔ آج تک کوئی خانقاہ اس لئے قائم نہیں ہوئی کہ کسی بچے کو بداخلاق بنادیا جائے بداخلاق بنتا نہیں۔ آپ ذرا محنت کر کے اخلاق کو خراب کر دیجئے یہ کہے گا ارے احمق! یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی بداخلاق پیدا ہوا ہے۔ محنت خوبی کے لئے کی جاتی ہے، خرابی کے لئے نہیں کی جاتی۔

تو انسان کے اندر دو ہی بڑے بڑے کمال ہیں: ایک علم اور ایک اخلاق۔ جس سے عمل درست ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کمال محنت سے لائے جاتے ہیں اور محنت نہ کی جائے تو علم کی جگہ جہالت ہے، وہ بھی پہلے سے موجود اور حسن اخلاق کی جگہ بداخلاقی، وہ بھی پہلے سے موجود۔ قرآن کریم میں علم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① "اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حالت میں کہ تم جاہل مطلق تھے۔ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا"۔ انسان کا بچہ ایک مضغہ گوشت پیدا ہوتا ہے۔ نہ اسے اچھے برے کی تمیز، نہ سیاہ کو جانتا ہے نہ سفید کو۔ حق تعالیٰ اس کے اندر سمجھنے، دیکھنے اور سننے کا مادہ رکھتے ہیں۔ تب سن سن کر، دیکھ دیکھ کر، سوچ سوچ کر برسہابرس میں جاکے وہ عالم بنتا ہے، محنت کرتا ہے تو عالم بن جاتا ہے۔ مگر خلقی طور پر جہالت لے کر پیدا ہوتا ہے تو علم انسان کی ذات میں نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں جہالت ہے۔

اخلاق کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ ② میں اپنے نفس کی بریت نہیں کرتا۔ نفس جب حکم دے گا، برائی کا حکم دے گا۔ اس میں شر ہی شر چھپا ہوا ہے۔ تو خیر لائی جاتی ہے، شر پہلے سے موجود ہے۔ اخلاق میں بھی بدی پہلے سے موجود، نیکی محنت سے لائی جائے گی۔ علم میں بھی جہالت پہلے سے موجود، علم محنت کر کے لایا جائے گا۔ دو ہی کمالوں سے آدمی آدمی بنتا ہے، علم سے اور اخلاق سے اور وہ دونوں اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ذات کے اندر بداخلاقی اور جہالت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے جتنے مادے ہیں۔ وہ سب گندے اور نجس ہیں۔ ان سے علم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے نیک اخلاقی بن ہی نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ جہالت اور بداخلاقی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے ذکر کیا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ③ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا اس گندے قطرے میں کوئی خوبی، شعور، بھلائی اور دانش مندی نہیں، بلکہ ناپاک قطرہ

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۷۸. ② پارہ: ۱۳، سورة يوسف، الآية: ۵۳. ③ پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۴.

ہے۔ بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو اس کا دھونا واجب، مسجد میں آنا جائز نہیں، قرآن پڑھنا جائز نہیں۔ اس درجہ گویا ناپاک اور نجس چیز ہے کہ عبادت سے آدمی جاتا رہتا ہے۔ مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے تو انسان کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض ائمہ کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ وہ قطرہ پاک ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ عام ائمہ کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ ناپاک ہے۔ مگر بعض اس کے قائل ہیں کہ وہ پاک ہے وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا مادہ ہے۔ تو اس کو نجس کیسے کہہ دیں۔؟ تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہو گیا۔

لیکن ماں کے پیٹ میں جا کر آگے کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن کے بعد خون بنتا ہے۔ خون کے پاک ہونے کا کوئی قائل نہیں گویا ناپاکی کی طرف بڑھا۔ اب تک اختلاف تو تھا کہ کوئی پاک کہتا تھا، کوئی ناپاک، لیکن حدیث میں ہے کہ وہی نطفہ چالیس دن کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خون بالاتفاق ناپاک ہے۔ اس کی پاکی کا کوئی قائل نہیں تو گویا دوسرا مادہ انسان کی پیدائش کا ایسا گندہ ہے کہ سب ہی اس کی گندگی کے قائل ہیں۔ چالیس دن کے بعد خون کی یہ بوند ایک لوتھڑا بن جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی خوبی نہیں، کوئی نورانیت اور چاندنا نہیں۔ اس کے چالیس دن بعد ماں کے پیٹ میں اس میں ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں، اور ان پر گوشت ڈالا جاتا ہے، کھال بن جاتی ہے، ایک شکل بنا دی جاتی ہے اس میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک گندے یا خراب قسم کے مادے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے ایک موقع پر ذکر فرمایا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ① "ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا"۔

ظاہری بات ہے کہ مٹی میں نہ شعور و عقل نہ تمیز و امتیاز نہ علو شرف، ہر وقت پامال ہے، جوتیوں میں روندی جاتی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مادہ ہے۔ مٹی کے خلاصے سے پھر گندہ قطرہ بنا، وہ نجس، اس گندے قطرے سے خون بنا، وہ نجس۔ اور فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ② یہاں حق تعالیٰ نے دور بتلائے ہیں کہ پہلے انسان مٹی تھا۔ مٹی سے گندہ قطرہ، پھر مضغہ گوشت بنا، پھر ہڈیاں آئیں، پھر کھال پہنائی گئی تب جا کے کہیں اس میں جان پڑی۔ اتنے ادوار میں جتنے مادے آئے۔ وہ سب گندے اور ناپاک۔ ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اس سے انسان کی پیدائش عمل میں آئی جس مکان میں پیدائش ہوئی وہ بھی گندا ماں کے پیٹ میں کوئی چاندنا تھوڑا ہی ہے۔ نہ ظاہری روشنی نہ باطنی روشنی۔ قرآن کریم نے ایک موقع پر فرمایا ﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ ③ ہم نے تمہیں

① پارہ:۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲۔ ② پارہ:۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ:۱۳، ۱۴۔

③ پارہ:۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ:۶۔

ماں کے پیٹ میں تین اندھیری کوٹھڑیوں کے اندر پیدا کیا۔ان میں ظلمت کے سوا نورانیت کا نشان نہیں۔تو پہلے ماں کا پیٹ ہے۔اس میں کون سا چاندنا ہے، پھراس میں رحم مادر ہے۔اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی اس میں اور زیادہ ظلمت پھراس میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے۔وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔دایا اسے کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔گویا تین ظلمتوں میں انسان کو پیدا کیا گیا تو پیدائش کے مادے وہ بھی گندے، مکان پیدائش کے وہ بھی گندے۔اتنے گندے مادوں میں سے علم کیسے پیدا ہوسکتا تھا؟ اخلاق کیسے پیدا ہوسکتے تھے؟ نجاستوں میں سے خوبی نہیں نکلتی جب انسان کی پیدائش ہی ایسے مادوں سے ہے، اس میں خوبی کہاں سے آتی؟۔

انسان میں کمال منجانب اللہ ہے.....لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دنیا میں جتنی خوبیاں ظاہر ہوئی ہیں۔وہ انسان ہی سے ظاہر ہوئی ہیں۔انسان میں اولیاء علماء پیدا ہوئے انبیاء وحکما پیدا ہوئے دنیا کو بھی انسان نے سجایا اور آخرت کو بھی انسان نے بنایا تو خوبیاں بھی انسان میں ہیں۔پھر اگر یہ ایسا گندہ تھا تو یہ خوبیاں کیوں اس کے اندر ظاہر ہوگئیں؟

اس کا جواب بھی سن لیجئے۔وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں انسان کی پیدائش کے مادے ذکر کئے وہاں ان گندی چیزوں کا ذکر کیا۔لیکن ان گندی چیزوں میں سے نہ کوئی علم نکلتا ہے نہ کمال علم کا تعلق اس کی روح، حقیقت اور روحانیت سے ہے۔روح کا جب ذکر کیا، اسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا فرمایا ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ ① ''میں نے انسان کے اندر اپنی روح ڈال دی''۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ ② تو جہاں کمال کا ذکر آیا۔اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ان کے اندر کمال میرا ہے۔جہاں گندگی اور گندے مادوں کا ذکر آیا وہاں انسان کی طرف نسبت کی ﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ﴾ ③ انسان کو ہم نے مٹی سے بنایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ④ انسان کو سڑے ہوئے گارے سے بنایا تو جہاں انسان اور اس کے مادوں کا ذکر ہے۔وہاں انسان کی طرف نسبت کی گئی۔ جہاں روح کا ذکر آیا۔وہاں کہا کہ میں نے اپنی روح انسان میں ڈال دی۔

معلوم ہوا کہ کمالات جتنے آتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے آتے ہیں۔عیب جتنے ہیں وہ انسان کی ذات میں پہلے سے موجود ہیں۔اسے واسطے اسے کمال پیدا کرنے کے لئے اللہ کی طرف جھکنا پڑے گا۔وہیں سے کمال ملے گا۔اس کی ذات میں کچھ نہیں ہے۔علم اور اخلاق کے لئے محنت کرنی پڑے گی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، کیونکہ علم وکمالات اور اخلاق کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔لیکن کتنا ہی علم آ جائے، ذات تو انسان کی ذات ہی رہے گی۔ذات میں وہی کوراپن وہی گندگی۔یہی وجہ ہے کہ علم آ جانے کے بعد جتنا علم بڑھتا رہتا ہے،

① پارہ:۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۲. ② پارہ:۲۸ سورۃ التحریم، الآیۃ: ۱۲.

③ پارہ:۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲. ④ پارہ:۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶.

اتنے ہی اہل علم تواضع سے جھکتے رہتے ہیں، سرنیچا رکھتے ہیں، غرور نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ علم ہمارا کمال نہیں ہے۔ غرور آدمی کرے تو اپنی چیز پر کرے۔ دوسرے کی چیز پر آدمی کیا غرور کرے جو آ بھی سکتی ہے، چھنی بھی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری چیز نہیں ہے۔

آپ اپنے خزانے پر کسی خزانچی کو بٹھلا دیں اور خزانچی آپ کے امر سے دوسروں کو دیتا رہے تو خزانچی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس خزانہ کا مالک ہوں اور میں دے رہا ہوں؟ وہ جانتا ہے کہ خزانے کا مالک دوسرا ہے۔ اس کی اجازت سے میں خرچ کررہا ہوں۔ میں تو امین ہوں اور میں تو محض منتقل کردینے کا ذمہ دار ہوں، مالک نہیں ہوں تو خزانچی کے دل میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے۔

اسی طرح سے انسان کتنا ہی عالم وفاضل بن جائے۔ مگر جب وہ یہ دیکھے گا کہ میری ذات سے یہ علم نہیں آیا۔ یہ تو باہر سے آیا ہے۔ یہ عمدہ اخلاق میرے نہیں ہیں۔ میرے مادے تو گندے اور برے تھے۔ یہ کہیں اور سے آئے ہیں۔ اس لئے دانش مند آدمی کبھی شیخی نہیں کرے گا۔ کبھی اترائے گا نہیں اصلیت کو سمجھے گا اور یوں کہے گا کہ میں ان کمالات پر شکر تو کرسکتا ہوں۔ لیکن فخر نہیں کرسکتا فخر اپنی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے ہی نہیں۔ جتنے بڑے لوگ، علماء، اولیاء اور حکماء گزرے ہیں جتنا اونچے بنتے گئے، اتنا ہی سر جھکاتے گئے ہیں کہ ہم کوئی چیز نہیں، ہم ہیچ در ہیچ ہیں، ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ اس لئے کہ ان پر اصلیت منکشف ہوتی ہے۔

اہل کمال میں تواضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے...... اس عالم میں سب سے بڑے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مخلوقات میں آپ کے برابر کا کیا ہوتا؟ کوئی آپ کے لگ بھگ بھی نہیں ہے۔ سب سے بالا اور برتر آپ کی ذات عالی ہے۔ اللہ کے بعد اگر رتبہ ہے تو بس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اتنی بڑائی عالم میں کسی کو نہیں دی گئی جتنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اگر غرور فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، اگر اتراہٹ ظاہر فرماتے تو آپ فرماتے۔ لیکن آپ سے زیادہ تواضع کرنے والا بھی عالم میں کوئی نہیں۔ آپ سے زیادہ سر کو جھکانے والا بھی کوئی نہیں۔ قدم قدم پر اپنی تواضع ظاہر فرماتے۔ کبھی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ننگے پیر کھانا کھاتے اور فرماتے "آكُلُ كَمَا يَأكُلُ الْعَبْدُ" ① میں ایسے کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں۔ میں کوئی بادشاہ اور سلطان نہیں ہوں۔ میں ایک غلام ہوں۔ جیسے غلام کھانا کھاتے ہیں، میں کھاتا ہوں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں کوئی چیز ہوں۔

اسی طرح سے جب آپ چلتے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ فرمائیں کہ میں آگے آگے رہوں، بقیہ سب پیچھے رہیں۔ وہاں بھی کمال تواضع کہ صحابہ آگے پیچھے، دائیں بائیں چل رہے ہیں. آپ کوئی اپنا امتیاز ظاہر نہیں فرماتے۔ یہ کمال تواضع ہے لیکن یہ آگے اللہ کی دی ہوئی بزرگی ہے کہ آپ اپنے کو لوگوں میں کتنا ہی رلاتے ملاتے اور رل ملا کر

---

① المصنف لعبدالرزاق، ج: ۱۰، ۴۱۵، رقم: ۹۵۴۳. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۲ ص: ۸۲.

لوگوں میں چلتے۔لیکن سب سے اونچے آپ ہی نظر پڑتے تھے، حالانکہ بہت سے صحابہ ہیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ تھا نہ پستہ قد تھے نہ بہت لمبا قد۔نہایت موزوں اور خوبصورت قد تھا۔ جب آپ چلتے تو سب سے اونچے آپ دکھائی دیتے تھے۔یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔آپ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

مجلس میں جب آپ بیٹھتے تو اورلوگ بھی بیٹھتے۔صحابہ آگے پیچھے اوردائیں بائیں بھی ہیں۔کبھی اپنے لئے کوئی امتیازی مقام تجویز نہیں فرماتے تھے۔لیکن اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ لمبے لمبے قد کے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں مگر سب سے اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر پڑتے تھے۔تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے بلند اور بالا آپ ہی نظر پڑتے تھے تو آپ کی ذات ہے۔لیکن سب سے زیادہ تواضع آپ ہی فرماتے تھے۔کہیں فرماتے ہیں، ''لَاتُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ''① اے لوگو! میری تعریف میں مبالغے مت کرنا، مجھے میری حد سے مت گزارنا، جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مبالغے کئے کہ انہیں خدا کا بیٹا بلکہ خدا تک کہہ دیا۔میری بزرگی یہ ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ اوراس کا رسول کہو ''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ،'' نہ میں خدا ہوں، نہ خدا کی اولاد، وہ اولاد ہونے اور باپ ہونے سے بَرِی ہے۔''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ'' میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ہاں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنا رسول بنایا، مجھے اپنا ایلچی اور پیغمبر بنایا اوراتنی عظمت مجھے عطا کی۔یہ اس کی دین ہے، میں بندہ ہی ہوں، تو جگہ جگہ فرماتے ہیں۔''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ'' (صلی اللہ علیہ وسلم)

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو کہا کہ ''یَاسَیِّدَنَا'' اے ہمارے سردار! حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردار ہی تھے۔آپ تو جہانوں کے سردار ہیں۔لیکن فرمایا، ''اَلسَّیِّدُ اللّٰہُ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ'' ② سردار اللہ ہے۔میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔فوراً اصلاح فرمائی کہ ایسے خطاب بھی مت دو جس سے مبالغے ٹپکتے ہوں۔کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''لَاتَقُوْلُوْا اَنَا خَیْرٌ مِّنْ یُّوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی'' ③ اے لوگو! یہ کبھی میری نسبت مت کہو کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر اور برتر ہوں۔حالانکہ آپ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔لیکن روکا یعنی اس طرح تعریف مت کرو کہ دوسرے کی تنقیص وتوہین ہونے لگے۔مقابلے ڈال ڈال کر میری بڑائی مت بیان کرو، کہ میرے مقابلے میں دوسرے کم رتبہ ہیں اور میں زیادہ رتبے والا ہوں۔یہ ادب کے خلاف ہے۔گستاخی کی بات ہے۔یہ کمال تواضع ہے تو کہیں ہدایت فرمائی کہ میری تعریفوں میں مبالغے

① الصحیح للبخاری ، کتاب التفسیر ،باب قول اللہ تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج: ۱۱ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۹.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ التمادح ج: ۱۲ ص: ۴۲۹.

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء ،باب قول اللہ تعالیٰ وان یونس لمن المرسلین ج: ۱۱ ص: ۲۲۳ رقم: ۳۱۶۳.

مت کرو اور کہیں فرمایا کہ دیکھو میری حیاتِ طیبہ میں ادب کرو۔ مگر مبالغے مت کرو اور وفات کے بعد فرمایا، ”لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ“ ① میری قبر کو بت مت بنالینا کہ پوجا شروع کردو، سجدے شروع کردو یا جھکنا شروع کردو، بت مت بنالینا۔ اور کہیں فرمایا: ”لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا“ ② میری قبر کو عیدگاہ مت بنانا کہ وہاں میلے ٹھیلے کرنے لگو، وہاں جماعتیں بن کر آئیں۔ یہ مت کرنا۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری زیارت کرنے کے لئے آؤ۔ روضہ اقدس پر حاضر ہو۔ حدیث میں فرمایا: ”مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ“ ③ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ میرا حق ہے کہ وہ میرے پاس آئے۔ اگر زیارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آدمی سفر کرکے جائے۔ تو اس کا حق ہے کہ سفر کرے اور زیارت کرے اور روضہ اقدس پر حاضر ہو اور صلوٰۃ وسلام پڑھے۔

بہرحال وفات کے بعد اور وفات، سے پہلے جتنے آداب بتلائے ان میں اپنی عبدیت و بندگی ظاہر فرمائی کہ میرے ساتھ نہ زندگی میں مبالغے کرو، نہ وفات کے بعد کہیں فرمایا: ”لَا تَقُوْمُوْا لِیْ کَمَا یَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ“ ④ میرے دربار میں میرے پاس آکر یہ مت کرو کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور لوگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہوں. جیسے عجمی بادشاہوں کے سامنے لوگ کھڑے رہا کرتے تھے اور درباری بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ چاہے دو گھنٹے ہوں یا تین گھنٹے بادشاہ بیٹھتا تھا۔ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا: یہ مت کرو جیسے سلاطین دنیا کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ رسمی تعظیم ہوتی ہے۔ حقیقی ادب نہیں ہوتا حقیقی ادب یہ ہے کہ دل میں عظمت اور عقیدت گھر کی ہوئی ہو اور بیٹھے رہو۔ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اس سے منع فرمایا تو یہ بھی کمالِ عبدیت کا اظہار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میری بندگی پیشِ نظر رکھو۔

رسالت و بشریت...... حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے رسول بھی ہیں اور رسالت کی بزرگی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر کرامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ تو ایک طرف تو یہ کرامت کہ اشارہ فرمادیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجائیں اشارہ فرمائیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے سامنے آجائیں۔ طشت میں انگلیاں ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے جاری ہوجائیں اور چودہ سو آدمی سیراب ہوجائیں ایک طرف تو یہ۔ اور ایک طرف یہ کہ غزوہ احد میں پتھر پیشانی مبارک پر لگا تو خون مبارک بہہ نکلا، گھوڑے سے آپ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک طرف تو عظمت کے تصرفات آسمان تک پہنچے ہوئے

① سبل السلام، کتاب الجنائز، باب النهي عن البناء والتجصيص على القبور، ج: ۳، ص: ۱۴۸، رقم: ۵۴۳

② السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب زيارة القبور ج: ۵، ص: ۴۱۸، رقم: ۱۷۴۶ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابی داؤد ج: ۵ ص: ۴۲ رقم: ۲۰۴۲. ③ کنز العمال، ج: ۱ ص: ۲۶ رقم: ۱۲۳۶۹. علامہ عجلونی فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی وغیرہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن اس حدیث کو موضوع قرار دینا مناسب نہیں دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۴۴. ④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب قيام الرجل للرجل، ج: ۱۳، ص: ۴۶۲، رقم: ۴۵۵۳.

کہ چاند تک اثر پہنچا اور ایک طرف یہ بے بسی کہ آپ گھوڑے سے گر پڑتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب بخار آتا ہے تو اوروں کو ایک درجے کا آتا ہے، مجھے دوگنا آتا ہے، جتنا اوروں کو چڑھتا ہے، اس سے دوگنا مجھے چڑھتا ہے اور زیادہ قوت کے ساتھ بخار آتا ہے۔ تو ایک طرف یہ بے بسی اور ایک طرف یہ اقتدار کہ اشارہ کریں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، اشارہ کریں تو سورج ہٹ جائے، زمانے کی حرکت بند ہو جائے، حق تعالیٰ نے یہ چیزیں کیوں رکھیں کہ ایک طرف بے بسی رکھی اور ایک طرف یہ دعویٰ رکھ دیا کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول بھی ہوں۔ یہ اس لئے کہ جب انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزے ظاہر ہوتے ہیں۔ تو لوگ کہیں ان کی خدائی کے قائل نہ ہو جائیں۔ اس لئے بشریت کے لوازم رکھ دیئے تاکہ خدائی کا کوئی اقرار نہ کرے۔ یوں کہیں کہ بندے ہیں۔ تو جہاں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے وہاں یہ بھی کہ گڑھے میں گر پڑے ایک دفعہ شکست بھی ہو گئی۔ بیماری بھی آ جاتی تھی۔ علاج کرنا پڑتا تھا۔ یہود نے سحر کرا دیا تو آپ سحر سے متاثر ہو گئے۔ غم بھی آ جاتا تھا۔ خوشی بھی آ جاتی تھی جتنے بشریت کے عوارض اور لوازم ہیں۔ وہ خود آپ پر طاری ہوتے تھے اور یہ اس لئے کئے جاتے تھے کہ آپ کے معجزات دیکھ کر کہیں آپ کو خدا ہی نہ مان لیں۔ یوں سمجھیں کہ آپ بندے ہی ہیں اور یہ خدا کی دی ہوئی بزرگی ہے۔ اس لئے آپ زبانِ مبارک سے بھی تواضع کے کلمات فرماتے، عمل بھی تواضع کا فرماتے۔ حق تعالیٰ آپ سے معاملہ بھی وہی کرتے جو بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام باوجود رسول ہونے کے، باوجود اللہ کے مقرّب بندے ہونے کے ہیں بندے ہی، خدا نہیں ہیں۔ انسان اور بشر ہی، بشر بھی ایسے کہ جو بشریت کے آثار وخواص ہیں، وہ ان پر طاری ہوتے ہیں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مقدس اور زیادہ بزرگ طبقہ اس عالم میں کوئی دوسرا نہیں اور اس میں بھی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ نے فرمایا: ''اَنَا نَبِیُّ الْاَنْبِیَاءِ'' (الحدیث اخرجہ علی المتقی الھندی، فی کنز العمال، ''وَلَفْظُہٗ: اَنَا سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْنَ،'' ''اور نبی امتوں کے نبی ہیں، میں نبیوں کا نبی ہوں''۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا کہ نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ۔ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ﴾ ① حق تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں نبوت دوں اور کتاب دوں۔ اس کے بعد وہ رسول آئیں۔ جن کی تمہیں بشارت دی گئی ہے تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا، اس کی اتباع کرنا اور اس کے ساتھ رہنا۔ گویا انبیاء علیہم السلام سے بھی عہد لیا گیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ایمان نبی پر لایا جاتا ہے۔ گویا نبیوں کا بھی آپ کو نبی بنایا گیا اور انبیاء علیہم السلام کو ایمان لانے کا مکلف قرار دیا گیا۔ جیسے ہمیں اور آپ کو حکم ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

لائیں۔انبیاءکوبھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ایمان لائیں اس لئے فرماتے ہیں کہ۔ ''اَنَـا نَبِیُّ الْاَنْبِیَـآءِ '' اور نبی امتوں کے لئے نبی ہیں، میں نبیوں کے لئے نبی بنایا گیا ہوں۔تو اتنی بڑی ذات اقدس کہ انبیاء میں بھی آپ کا اتنا اونچا درجہ کہ خاتم انبیاء بنائے گئے۔اگر عیاذاًباللہ غرور یا تکبر کرتے،تو آپ کرتے مگر سب سے پہلے زیادہ تواضع فرماتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ جتنے کمالات ہیں وہ اللہ کے ہیں،ادھر سے آتے ہیں۔انسان کی ذات میں کمال نہیں ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے،عمل سے یہ بتلا دیا کہ انسان اپنے کو کورا سمجھے اور اللہ کا شکر مانے کہ اس نے تمہیں کمال دے دیا۔اس لئے دنیا میں جتنے بھی بڑے گزرے ہیں۔جتنے بڑے ہوتے گئے، اتنے ہی تواضع میں بڑھتے گئے۔اتنی خاکساری اور عجز ونیاز برتنے لگے۔اس لئے کہ ان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ کمال ہمارا نہیں،اللہ کا ہے۔اور جب آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ کمال دینے والا دیتا ہے۔لیکن جب لینے پر آتا ہے لے بھی لیتا ہے۔انسان کے بس میں نہیں کہ روک لے۔جیسے ایک طرف یوں فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے علم وہنر اور اخلاق لے کر نہیں آتا۔ہم دیتے ہیں۔

اسی طرح آخری عمر کے بارے میں فرمایا ﴿مَنْ یُّـرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا﴾ ①
انسان اُخیر میں جب اُرذلِ عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو عمر بہت ہی گری ہوئی ہے۔سو یا سو سے زیادہ برس کا ہوگیا تو ایک ایک کر کے اس کا علم کھونا شروع ہو جاتا ہے۔آج آنکھوں میں فرق آ گیا تو دیکھنے کا علم ختم ہوگیا،دماغ کمزور ہوگیا تو سوچنے سمجھنے کا علم ختم ہوگیا،کانوں کے سننے میں فرق آ گیا تو سننے کا علم ختم ہوگیا۔نیا علم نہیں آ رہا۔پرانا علم حافظہ میں محفوظ تھا۔آج حافظہ کمزور ہوگیا،تو پچھلی معلومات ختم ہوگئیں،اگلی معلومات کا دروازہ بند ہوگیا۔پچھلی ختم ہوگئیں انسان جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔حق تعالیٰ بتلا دیتے ہیں کہ علم تیری چیز نہیں جب چاہا ہم نے دے دیا،جب چاہا ہم نے چھین لیا۔پھر ایسا انسان کس طرح سے غرور کرسکتا ہے؟ اگر اس کے پاس علم وکمال آجائے۔ وہ جانے گا کہ علم وکمال میرا نہیں،میرے مالک کا ہے،میں خزانچی اور امین ہوں۔خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ یہ مال میرا ہے۔یہ مال تو مالک کا ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا طریق اول،فیضِ صحبت...... بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں ہنر نہیں ہے اور کچھ محنت کرے گا تو آئے گا۔اب علم واخلاق کے آنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اتنی بات تو واضح ہوگئی حاصل کرنا پڑے گا۔بلا حاصل کئے نہ علم آئے گا نہ اخلاق پیدا ہوں گے تو پھر اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ سب سے بہتر طریقہ علم اور اخلاقی کمال حاصل کرنے کا فیض صحبت ہے۔اہل اللہ اور اکابر دین کی خدمت میں رہ کر ان کی زبان سے جب آدمی سنتا ہے تو علم آدمی کے دل میں اترتا ہے۔ان کے فیض صحبت سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔حضرات صحابہ کو صحابہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔صحابہ

① پارہ:۱۴،سورۃالنحل،الآیۃ:۷۰.

اس طرح علم حاصل نہیں کرتے تھے کہ کوئی کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے رات دن مطالعہ کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے، فیضِ صحبت حاصل کیا۔ فیض صحبت کی برکت سے علماء، عرفاء، کامل، زاہد اور درویش بن گئے۔ علم و اخلاق کے سارے کمالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ ترین طریق فیض صحبت ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ ان کے قلب کا اثر انسان کے قلب پر پہنچتا ہے۔ ان کے قلب میں اگر علم ہے تو قلب سے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے اندر اگر پاکیزہ اخلاق ہیں تو اخلاق منتقل ہوتے ہیں، قلب پر اثر پڑتا ہے۔ اس واسطے تاکید کی گئی ہے کہ اچھی صحبت حاصل کرو، بری صحبت سے بچو، اچھے ماحول میں رہو، بُرے ماحول سے پرہیز کرو۔ مولانا رومیؒ نے کہا کہ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند   صحبتِ طالح ترا طالح کند

''نیک صحبت تجھے نیک بنا دے گی، بری صحبت تجھے برا بنا دے گی''۔ تو صحبت و معیت کا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان تو انسان میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کپڑوں کے صندوق میں گلاب کے پھول بھر دیں۔ ہفتہ بھر بعد جب نکالیں گے، سارے کپڑوں میں سے گلاب کی خوشبو آئے گی۔ تو کپڑا گلاب نہیں تھا۔ گلاب کے پھول کی صحبت حاصل کی، خوشبو ادھر بھی منتقل ہوگئی اور کپڑوں میں سے وہی خوشبو آنے لگی۔ جو گلاب کے پھول میں سے آتی تھی۔

آپ جب گرم کپڑے کیڑے کے ڈر کی وجہ سے صندوقوں میں بند کرتے ہیں تو کافور کی گولیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یا تمباکو ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کیڑا نہ لگے۔ اب جب سردیوں میں کپڑے نکالیں گے تو کپڑوں میں سے تمباکو کی بو آتی ہوگی۔ حالانکہ خود کپڑا تمباکو نہیں تھا۔ مگر تمباکو کی صحبت میں رہ کر کپڑے نے بھی وہی خوبی پیدا کرلی۔

لوہے کو آپ بھٹی میں ڈال دیں۔ پندرہ منٹ آگ کی صحبت میں رہنے کے بعد جو آپ نکالیں گے تو شکل بھی اس کی آگ جیسی، وہی سرخ رنگت، کام بھی وہی کرے گا۔ جو آگ کرتی ہے۔ اس میں روشنی گرمی بھی ہے۔ اس کا سرخ رنگ ہوگیا۔ جیسے آگ کا ہوتا ہے اگر آپ اس جلتے ہوئے لوہے کو کسی چھپر میں ڈال دیں تو دو منٹ میں سارا گھر پھونک دے گا۔ جو کام آگ کرتی ہے، وہی لوہا کرے گا۔ اسلئے کہ آگ کی صحبت میں رہ کر وہی خوبی اس نے اختیار کرلی۔ بلکہ شکل بھی وہی بنالی جو آگ کی شکل تھی۔

صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ، اکابر اولیاء اللہ اور بڑے کاملین میں سے ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار ہے۔ حضرت مجددؒ صاحب کے شیوخ میں سے ہیں۔ ان کے یہاں اتفاق سے مہمان آئے اور شیخ کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ پریشان کہ کس طرح مدارات کروں گھر میں ایک دانہ نہیں، مہمانوں کو کیا کھلاؤں؟ اسی گھبراہٹ میں کبھی گھر میں جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں۔ پریشان ہیں کہ کس طرح سے مہمان کو کھلاؤں پلاؤں۔ گھر میں تو ایک دانہ بھی نہیں۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک بھٹیارہ، جو کھانے کی دکان کرتا تھا۔ آج اسے ہوٹل اور ہوٹل مالک کہتے ہیں۔ کل وہ بھٹیاری سرائے اور بھٹیارہ کہلاتا تھا، کھانا پکاتا تھا اور بیچتا تھا۔ وہ بھٹیارہ سمجھ گیا کہ شیخ کے گھر فاقہ ہے اور کھانے پینے کو کچھ ہے نہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو فوراً مجلس سے اٹھا۔ اپنی دکان پر گیا اور عمدہ عمدہ کھانے، جو اس کے ہاں پکے ہوئے تھے ان میں سے کھانے لے کر دستر خوان تیار کیا۔ کئی آدمیوں کا اور کئی قسم کا بڑا عمدہ کھانا، سر پر رکھ کر لایا اور ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بے حد خوش ہوئے۔ مہمانوں کو بڑی عزت اور مدارات سے کھانا کھلایا اور خوشی سے چہرہ کھل گیا کہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور میں مدارات کر سکا۔ جب مہمان رخصت ہو گئے۔ تو خواجہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جوش میں آ کر بھٹیارے سے فرمایا، تو نے آج مجھے اتنا خوش کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو آج مانگے گا، تجھے ملے گا۔

بھٹیارے کی زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! مجھے اپنے جیسا بنا دو۔ اب یہ چیز بڑی بھاری تھی کہ بھٹیارہ بعینہٖ خواجہ باقی باللہ بن جائے، خواجہ باقی باللہ کی استعداد اور صلاحیتیں، اور بھٹیارہ بے چارہ معمولی آدمی۔ نہ اس میں علم کی وہ صلاحیت نہ اخلاق کی استعداد۔ گویا اس نے درخواست اپنے حوصلہ سے بڑھ کر کی۔ یہ کہتا کہ دعا کیجئے مجھے اللہ نیک اور صالح بنا دے، اللہ مجھے جنت دے دے، یہ نہیں۔ بلکہ فرمایا بس اپنے جیسا مجھے بنا دیجئے۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ تو نے اپنے حوصلہ سے بڑھ کر درخواست کی ہے۔ کوئی اور چیز مانگ۔ اس نے کہا نہیں۔ میں تو یہی مانگتا ہوں۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل کہ اس کو آخر میں اپنے جیسا کیسے بنا دوں۔ اور اگر میں کوشش بھی کروں تو اس میں اتنی استعداد کب ہے کہ اتنا علم اٹھا سکے تحمل بھی کر سکے اور ان اخلاقی کمالات کو برداشت کر سکے، جو میرے اندر اللہ نے دیئے ہیں۔ ہر انسان کی صلاحیت الگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استعدادیں اور ہیں۔ جو نبوت کے کمالات برداشت کرتے ہیں۔ امت میں کسی بڑے سے بڑے قطب، غوث اور ولی کی مجال نہیں کہ ان کمالات کی برداشت کر سکے، وہ ولایت کے کمال کا تحمل کریں گے۔ جو ولی نہیں ہے، معمولی عالم ہے، وہ ولایت کے کمالات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ عوام الناس میں سے ہے وہ اہل علم کے کمالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو ہر ایک کی استعداد و صلاحیت الگ ہے۔ اگر پیالہ پاؤ بھر کا ہو، جس میں پاؤ بھر غلہ آ سکے۔ وہ یوں کہے کہ میرے اندر دو مَن بھر دو، کیسے بھر دیں؟ اس کے اندر کب صلاحیت ہے اتنا بھر دینے کی؟ تو بھٹیارے کا یہی قصہ تھا کہ استعداد تو پاؤ بھر کی بھی نہیں تھی اور مانگ لیا اس نے کہ دس من میرے اندر بھر دو۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے اندر کیسے بھر دیں؟

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پھر فرمایا، تو نے اپنی ہمت سے بڑھ کر درخواست کی ہے تیرے اندر تحمل اور قوت نہیں ہے۔ اتنی بات مانگ جتنی تو برداشت کر سکے۔ اس نے کہا نہیں، اب تو میری زبان سے نکل گیا۔

اب تو مجھے اپنے ہی جیسا بنالو۔ اب پھر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل ہوئے۔ فرمایا، اچھا اللہ کے نام پر۔ فرمایا، اُٹھ میرے ساتھ، اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر اس کے اوپر توجہ ڈالنی شروع کی، اس کی روح میں تصرف کرنا شروع کیا۔ اس درجہ تصرف کیا اور اس درجہ اس کی روح کے اندر نسبت و کمالات کو بھرنا شروع کیا کہ وہ ساری چیزیں بھر دیں جو اپنے اندر تھیں۔ اور کیفیت یہ ہوئی کہ بھٹیارے کی شکل بھی ویسی بن گئی۔ جیسی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ اب جب کوٹھڑی سے باہر نکلے تو دو خواجہ باقی باللہ آ رہے ہیں۔ ایک اس طرف، ایک اس طرف شکل بھی وہی، صورت و رنگ بھی وہی۔ اپنی استعداد و صلاحیت سے اس طرح اس کے باطن کو بھرا کہ اس کی ظاہری شکل بھی ویسی بن گئی۔ لوگوں نے پہچانا کس طرح سے؟ ایک خواجہ باقی باللہ تو بڑی قوت اور متانت سے آ رہے تھے اور ایک خواجہ باقی باللہ اس طرح کہ پیر لڑھک رہے ہیں، بدن لرز رہا ہے، جیسے بوجھ ہے برداشت نہیں ہوتا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھٹیارہ ہے۔ جس کی صورت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بن گئی۔ تین یا چار دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بے چارہ برداشت نہیں کر سکا تو

آرزومی خواہ ولے دباند ازہ خواہ

آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اتنی آرزو کرو، جتنی آدمی برداشت کر سکے، جتنی اندر صلاحیت ہو۔ میں نے کس وجہ سے یہ واقعہ ذکر کیا؟ اس لئے کہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دس منٹ صحبت اٹھائی، دوسرا باقی باللہ بن گیا۔ تو صحبت کا اثر پڑتا ہے اچھے آدمی کی صحبت سے قلوب کے اندر اچھائیاں پیوست ہوتی ہیں۔ اس سے انسان میں صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو حضرات صحابہ کو جو کمالات حاصل ہوئے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے۔

فیض صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہیں...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر نظر کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار ہا معجزات ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزوں سے الگ معجزے ظاہر ہوئے۔ چاند سورج پر الگ معجزات ظاہر ہوئے اور دنیا کی ہر چیز پر آپ کے معجزات نمایاں ہوئے۔ پتھروں نے آپ کی نبوت کی شہادت دی اور بول پڑے۔

حدیث میں ہے کہ آپ کو استنجا کی ضرورت پیش آئی ریگستان تھا۔ میلوں تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ بیٹھ سکیں۔ میل بھر پر ایک اور دوسرے میل پر ایک درخت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر اشارہ فرمایا۔ دونوں درخت دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دو میل کی مسافت طے کر کے آئے اور آ کر اس طرح کھڑے ہوئے کہ اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ جیسے خیمہ اور پردہ بن گیا استنجا فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ چلے جاؤ وہ درخت اپنی جگہ چلے گئے تو درختوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔ جانوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا روتا ہوا آیا۔ آنکھوں میں اس کے آنسو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آکر سر ڈال دیا اور بلبلا رہا ہے۔ آنکھوں سے پانی جاری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے مالک کو بلاؤ۔ مالک حاضر ہوا۔ فرمایا، یہ شکایت لے کر آیا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ اس کے اوپر بوجھ لادتا ہے۔ تجھے غیرت نہیں آتی؟ تیرا ذریعہ معاش یہ ہے، تیری کمائی اس کے ذریعے ہے۔ پھر اس پر رحم نہیں کھاتا؟ واقعہ سچا نکلا۔ اس نے توبہ کی کہ یارسول اللہ! آئندہ میں ظلم نہیں کروں گا، اس کا حق پہچانوں گا، اسے غذا دوں گا، اتنا ہی بوجھ لادوں گا جتنی اس میں طاقت ہے۔ تو جانور آ کے شکایتیں کرتے ہیں۔ حضور فیصلے فرماتے ہیں تو یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح پتھروں نے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دی۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ساری مجلس والوں نے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں۔ تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دے دیں پھر تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں تو تسبیح بند ہوگئی۔ بہر حال یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ کنکریوں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

تو چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، پتھروں کا شہادت دینا، درختوں کا دوڑ کے چلے آنا، انگشتان مبارک (انگلیوں) سے پانی کے چشمے بہہ پڑنا، یہ عظیم معجزات ہیں جو نمایاں ہوئے۔ لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معجزات ایک طرف اور یہ ایک معجزہ ایک طرف کہ ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے کیوں؟ اس واسطے کہ پتھر کو موم بنا دینا آسان ہے۔ لوہے کو نرم کر دینا آسان، لیکن انسان کی روح میں انقلاب پیدا کر دینا، یہ بڑا مشکل ہے۔ انسان کو انسان بنا کر اس کے دل کو پھیر دینا یہ بڑا مشکل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ ہے کہ ایک شخص مجلس مبارک میں آتا ہے، وہ کافر بھی ہے مشرک بھی ہے۔ بدعقیدہ بھی ہے اور بدعمل بھی ہے۔ ساری خرابیاں اسی میں ہیں۔ لیکن جونہی دستِ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوتا ہے تو اس حالت میں واپس ہوتا ہے کہ عالم بھی ہے۔ عارف بھی ہے، کامل بھی ہے، زاہد بھی ہے، عابد بھی ہے اور متقی بھی ہے۔ ایک دم دل کے اندر انقلاب پیدا ہو گیا تو پتھروں میں انقلاب آسان ہے۔ مگر انسان میں انقلاب پیدا کرنا بڑا مشکل ہے تو ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ ہے یہ اعجاز کیسے ظاہر ہوا؟ یہ فیض صحبت کی ہی برکت تھی۔ آپ کی صحبت مبارک میں منٹوں میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ دوسری جگہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیعت کرتے ہی ہر شخص کامل ہو جاتا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے کہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ لیکن آکر جونہی دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اسلام قبول کیا۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ چھپ کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ کل تیرہ آدمی مسلمان تھے۔ دارِ ارقم میں

اندر سے زنجیر بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پہنچے، بیعت کی، اسلام قبول کیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں ہیں؟ عرض کیا پھر چھپ کر نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا چلو، آگے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے پیچھے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ مسجد حرام میں پہنچے۔ مشرکین کی مجلسیں جمی ہوئی تھیں۔ اعلان سے کہا کہ جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ اب جان لے میں عمر ہوں اور میں کلمہ پڑھ کر آیا ہوں ''اَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَاَشْهَدُاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ① یہ کہنا تھا کہ تمام مشرکین مارنے پیٹنے پر پل پڑے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی آستینیں کھینچی، مار پٹائی سب کچھ ہوئی، لڑائی بھی ہوئی۔ مگر اللہ پر بھروسہ ایک منٹ میں اتنا پیدا ہو گیا کہ یا کفر میں پڑے ہوئے تھے یا ایک دم ایمان میں بڑھ گئے۔ یہ فیضِ صحبت ہی کا اثر تھا۔ بہر حال نبوت کی صحبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بنے اور صحابہ کے بارے میں اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اس امت میں صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی مقدس نہیں۔ کوئی ولی قطب بن جائے، غوث بن جائے۔ مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ کی جو شان ہے، وہ کسی کی نہیں بن سکتی۔ وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ دوسروں کو یہ شرف میسر نہیں ہے۔ تو سب سے بڑی بنیادی چیز جس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ وہ فیضِ صحبت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اخلاق اور اپنا علم صحیح کرنا ہو تو جو نیک اور صالح لوگ ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنا چاہئے چاہے کچھ بولیں یا نہ بولیں۔ لیکن پاس بیٹھنے سے ہی ایک اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔

بے شعور اشیاء کی صحبت...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی اور بری صحبت کی مثال دی ہے فرمایا، نیک صحبت کی مثال تو عطار کی دُکان جیسی ہے۔ عطر بیچنے والے کی دکان پر جب آپ بیٹھیں گے، چاہے عطر نہ بھی خریدیں۔ کم از کم دماغ میں ہی خوشبو آ جائے گی۔ دماغ تو معطر ہو ہی جائے گا، کپڑوں میں خوشبو کی ہوا بھرے گی۔ گھر پہنچیں گے تو گھر والے کہیں گے۔ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بدن کو ہی خوشبو لگ جائے گی، ناک میں ہی پہنچ جائے گی اور اگر کہیں عطر خرید ہی لیا اور مل لیا، پھر تو سبحان اللہ۔ مگر عطار کی دوکان پر محض جانے سے کم از کم دماغ تو معطر ہو ہی جاتا ہے۔ ②

اور بری صحبت کی مثال ایسی فرمائی کہ جیسے لوہار کی دوکان کہ بعض دفعہ لوہا گرم ہوتا ہے۔ کٹتا ہے تو اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی کالک ہی کپڑے کو لگ جائے گی، لوہا جلنے کی تھوڑی سی بدبو ناک کے اندر آ جائے گی۔ ③ غرض آدمی کوئی نہ کوئی کدورت دماغ میں لے کر آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کالک اور سیاہی کپڑے کو لگا آئے گا۔ بری صحبت کی

---

① المطالب العالية، كتاب السير والمغازي، باب اسلام عمر، ج: ١٢، ص: ١٥٨، رقم: ٤٣٤٤.

② ③ السنن لابي داؤد، كتاب الادب، باب مايومران يجالس...... ج: ١٢ ص: ٤٥٧ رقم: ٤١٩١. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابي داؤد ج: ١٠ ص: ٣٢٩ رقم: ٤٨٢٩.

مثال یہی ہے کہ برے کے پاس بیٹھ کر یا تو برا بنے گا، برا نہیں بنے گا تو کم سے کم برائی کی برائی دل سے نکل جائے گی۔کل کو برائی پر آمادہ ہو جائے گا۔نیکوں کے پاس اگر بیٹھے گا، اگر دیندار نہیں بنے گا، تو کم سے کم دین کی محبت تو پیدا ہو ہی جائے گی محبت نہ بھی پیدا ہو، کوئی کلمہ سن کے دل کی برائی ہی جاتی رہے گی تو راستہ درست ہو جائے گا۔ جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

''اللہ کے کسی ولی، مقبول اور دوست کے پاس ایک گھڑی بیٹھنا، یہ سو برس کی عبادت سے بہتر ہے''۔اس لئے کہ ایک گھڑی بیٹھنے سے بعض دفعہ دل کی گرہیں ایسی کھل جاتی ہیں کہ سو برس کی عبادت کا راستہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ جو دل میں گنجلک پڑی ہوئی ہوتی ہے، وہ نکل جاتی ہے تو فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اس واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ہر چیز اپنا اثر کرتی ہے۔آپ روز دریا کے کنارے دو چار گھنٹے جا کر بیٹھیں مزاج میں رطوبت پیدا ہو جائے گی، نرمی آجائے گی، تری آجائے گی۔اس لئے کہ پانی کی صحبت اختیار کی۔آپ آگ کے پاس بیٹھیں مہینہ بھر سینکتے رہیں۔مزاج میں جھنجھلاہٹ اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔آپ مٹی پر بیٹھیں، یبوست اور خشکی پیدا ہو جائے گی۔مٹی کا اثر ہی یہ ہے۔

جب یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے جان کہلاتی ہیں۔یہ بھی اثر کرتی ہیں۔کسی جاندار کے پاس بیٹھیں گے تو اس کا اثر کیوں نہیں ہوگا؟ اور ایماندار کے پاس بیٹھیں یا کسی فاسق و فاجر کے پاس بیٹھیں۔آپ کے اندر وہی جذبات پیدا کر دے گا۔جو اس کے اندر تھے۔تو اصل چیز اخلاق درست کرنے کی یہ ہے کہ صحبت صالح اختیار کی جائے کہ ان کے پاکیزہ اخلاق کا اثر آپ کے قلب پر پڑے گا چند دن کے بعد آپ کو فرق محسوس ہوگا کہ اخلاق کچھ صحیح ہونے لگے۔دل کا راستہ بدل جائے گا۔دل ادھر ہی کو چل پڑے گا، جدھر کو اس صالح اور نیک آدمی کا چل رہا ہے۔اس لئے سب سے اعلیٰ طریقہ علم و معرفت اور اخلاق حاصل کرنے کا اہل اللہ، اہل دل اور سچوں کی صحبت ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں امر فرمایا گیا ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① اے ایمان والو! اللہ کے سے ڈرو اور سچوں کی معیّت اختیار کرو۔یعنی ڈر تمہارے دل میں قائم نہیں رہے گا۔جب تک ڈرنے والوں کی معیّت نہ اختیار کرو۔ان کے پاس بیٹھو تو ڈر دل میں اثر کر جائے۔تقویٰ دل کے اندر اثر کر جائے گا۔

دین اہل اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے......اصل یہی ہے کہ دین محض کتابوں کے ورقوں سے نہیں پیدا ہوتا۔اہل اللہ کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے۔کتابیں کوئی لاکھ پڑھ لے۔صحبت نہ ملے، دین اثر نہیں کرے گا۔قلب کے اندر رنگ نہیں پیدا ہوگا۔محض کتاب یا کاغذ سے مراد نہیں، اہل دل کے پاس بیٹھ کر دل میں اثر پیدا ہوگا۔لسان العصر اکبر الہ آبادی یوپی کا بڑا شاعر گزرا ہے۔اس نے کہا ہے۔وہ اکثر علی گڑھ کالج کے لڑکوں سے خطاب کیا کرتا

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹.

تھا۔ جو چوٹیں ہوتی تھیں۔ ان پر طعن بھی کرتا تھا۔ ساتھ میں انہیں سمجھاتا بھی تھا۔ تو کالج کے لڑکوں سے اس نے خطاب کر کے کہا کہ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل اللہ کی نظر پڑتی ہے، دین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہ کتاب سے آتا ہے نہ مدرسے کے دروازوں سے اہل دل کے دل سے آتا ہے۔

از دل خیزد بردل ریزد

دل سے بات اٹھتی ہے تو دل ہی سے جا کے ٹکراتی ہے۔ اس واسطے اعلیٰ ترین طریقہ دین اور دینی اخلاق حاصل کرنے کا وہ فیض صحبت ہے خواہ علماء ربانی کی صحبت میسر ہو یا کوئی حقانی درویش اور اہل اللہ میں سے ہو۔ اس کی صحبت میسّر ہو وہ بھی نہ ہو، تو کسی نیک آدمی ہی کی صحبت میسّر ہو۔ عوام میں بھی نیک ہوتے ہیں، تاجروں میں ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں اللہ کے نیک بندے ضرور ہوتے ہیں۔ آدمی چھانٹ لے کہ یہ مقبول ہے اور مقبولیت اعمال سے معلوم ہو جاتی ہے، بلکہ صورت سے نظر پڑتی ہے کہ یہ آدمی مقبول ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا، مگر دل سے پڑھ لیتا ہے کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایمان کی نرمائی، ایک بھول پن، ایک سادگی، اللہ پر بھروسہ اور توکل ہوتا ہے، نہ چالاکی اور عیاری برستی ہے، بلکہ سچائی برستی ہے۔

جیسے فرمایا گیا: ’’اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْمُنَافِقُ خَبٌّ لَئِيْمٌ‘‘ ① مومن کی شان یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا، سیدھا، سچا ہوتا ہے۔ بھولے پن کے معنی یہ کہ عیاری، مکاری، چالاکی نہیں سیدھی سیدھی بات ہے اور ایک بے وقوفی ہے یہ اور چیز ہے۔ مومن بے وقوف نہیں ہوا کرتا جس درجے کا ایمان ہوگا۔ اس درجے کی عقل مندی بھی اس کے اندر ہوگی۔ ہاں ایمان ہی کمزور ہو، عقل بھی کمزور ہوگی۔ ایمان قوی ہے تو عقل بھی قوی ہوگی۔ ان کے چہروں پر بھول پن ہوتا ہے۔ یعنی فریب کاری نہیں ہوتی۔ سیدھی سیدھی جو دل میں ہے، وہی زبان پر، جو زبان پر ہے وہ دل میں۔ تو چہرہ مہرہ بتلا دیتا ہے کہ یہ آدمی سچا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں۔ تو اول سندھ میں داخل ہوئے ہیں۔ سندھ کے راستے سے پنجاب پھر پنجاب کے راستے سے ہندوستان پہنچے ہیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم سندھ کے بازاروں سے گزرے۔ تو ہزاروں آدمیوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے اور کہا کہ یہ جھوٹوں کے چہرے نہیں۔ ان چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کے چہرے دلیل ہیں کہ ضرور اسلام حق ہے۔ اسلام ان کے چہروں پر برستا ہے۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے زبردست محدث، عالم، عارف باللہ تھے۔ ان کے چہرے پر نورانیت برستی تھی۔ مظفر نگر میں مسلمانوں کا آریوں سے مناظرہ ہوا۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب العشرة، ج: ۱۲، ص: ۴۱۱، رقم: ۴۱۵۸.

ادھر ہندو آریہ تھے، ادھر مسلمان تھے، تو اسٹیج پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ نہیں فرمایا۔ مناظرہ دوسرے علماء کررہے تھے۔ مگر صدر کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف رکھتے تھے۔ تو آریہ مناظر نے کہا کہ۔ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاسکتا تھا۔ تو میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر اسلام قبول کرلیتا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے، اس کے چہرے پر ایمان کھل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس شخص کا دل، ایمان وعلم اور کمال سے بھرا ہوا ہے۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

مردِ حقانی کی حقانیت چہرے پر آجاتی ہیں۔ یہ چہرہ اصل میں چغل خور ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ یہ چیز دل میں بھری ہوئی ہے۔ اگر بدنیتی بھری ہوئی ہے، چہرے پر برستا ہے کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور سچائی بھری ہوئی ہے تو چہرہ بول دیتا ہے کہ یہ سچا مادی کیفیات ہوں یا روحانی چہرے پر برسنے لگتی ہیں۔ اگر کسی کے دل میں خوف بھرا ہوا ہے تو چہرے پر ایک زردی اور پریشانی ظاہر ہوگی۔ دیکھتے ہی آپ کہیں گے کہ بھئی! تم ڈر رہے ہو؟ حالانکہ ڈر چہرے میں نہیں۔ ڈر دل کے اندر ہے مگر دل کے اثرات چہرے پر آتے ہیں۔ چہرہ آئینہ ہے۔ دل کی چیز چہرے پر کھل جاتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں خوشی بھری ہوئی ہے، کسی تقریب سے مسرت ہے۔ چہرہ خوشی سے دمکتا ہوا ہوگا لوگ دیکھ کے کہیں گے کہ بھئی! بڑے خوش نظر آرہے ہو، کیا بات پیش آئی حالانکہ خوشی تو دل میں بھر رہی ہے۔ مگر چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ دل میں خوشی ہے۔ اگر دل میں غمی ہے چہرہ اداس پریشان ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ بھئی کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو؟ حالانکہ پریشانی دل میں ہے، چہرے میں تھوڑا ہی ہے۔ مگر چہرہ آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی اوپر آجاتا ہے۔ جب قلب میں نورِ ایمان چمکتا ہے۔ تو اس کی چمک دمک چہرے کے اوپر نمایاں ہوتی ہے۔ کفر اندر بھرتا ہے تو چہرے پر فساد اور سخت دلی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایمان کا نور چہرے پر آتا ہے۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

آدمی فوراً پہچان لیتا ہے۔ بہرحال "اَلظَّاهِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِنِ" "ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے"۔ جو باطن میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ ظاہر کھول دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر نورِ ایمان برس رہا تھا تو ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کر مسلمان ہوگئے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، یہ خبر سن کے عرب میں آئے کہ کوئی نبی پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ پچھلی کتابیں پڑھی تھیں۔ دنیا کو انتظار لگا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ وہ علامتیں جو اس نبی کی ہیں، پائی جارہی ہیں۔ تو جب دعویٰ نبوت سنا۔ یہ فوراً گئے کہ میں جا کر دیکھوں۔ آپ صحابہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ پاس نہیں پہنچے، تو اچانک دور سے چہرہ مبارک پر نظر پڑی، تو چلا کر کہا کہ:

''وَاللّٰہِ لَیْسَ ھٰذَاالْوَجْہُ وَجْہُ الْکَذَّابِ'' '' خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے''۔ چہرہ خود بتلا رہا ہے کہ اس کے اوپر سچائی برس رہی ہے۔ اس کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ اس کے قلب کے اندر نورِ نبوت بھرا ہوا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صحبت سے وہ قلبی نور منتقل ہوتا ہے جو دوسروں کے قلب کے اندر ہے۔ اس لئے دین میں کمال پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اہل اللہ، اکابرِ دین کی صحبت ہے کہ کتاب سے وہ چیز حاصل نہیں ہوگی، جو قلوب سے حاصل ہوگی۔ بلکہ کتاب کا مضمون بھی آپ سمجھیں گے تو شخصیتوں کی بدولت سمجھیں گے۔ اگر معلم اور مربی کتاب کا مطلب نہ سمجھائیں، وہ مطلب آپ کا اپنا مطلب ہوگا، کتاب والے کا مطلب نہیں ہوگا، خدا کا مطلب نہیں ہوگا، کتاب والے کا مطلب تب سمجھیں گے، جب کتاب والا خود بتلائے یا کسی کو بتلا کر بھیجے تو اللہ نے اپنی کتاب کا مطلب اپنے رسول کو سمجھایا، رسول نے اپنی صحبت سے صحابہ کو سمجھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی صحبت سے اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ محض کتاب سے کام نہیں چلا، جب تک مربیوں کی شخصیت سامنے نہ ہوئی۔ ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی۔ تو بڑا ذریعہ فیضِ صحبت ہے۔ جس سے دین اور دینی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

علم و اخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواخاۃ فی اللہ...... اس لئے بڑی چیز فیض صحبت ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب ہم ایک ایسی بستی میں ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی اچھا آدمی نظر نہیں پڑتا۔ جس کی صحبت میں بیٹھا کریں نہ ہماری بستی میں کوئی عالم ہے، نہ کوئی درویش ہے اور ویسے ہی اچھے تو خود ہم بھی اچھے ہی ہیں۔ ہم کس کے پاس جائیں؟ اتنے اچھے ہم بھی ہیں۔ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی صحبت اٹھائیں کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ کیا ہمارے اخلاق درست نہیں ہوں گے؟ اس لئے کہ آپ نے بتلایا کہ دین، علم اور اخلاق کے کمال کے لئے صحبت اصل چیز ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فیض صحبت سے دین و اخلاق حاصل کرلیں تو ہماری اصلاح کی کوئی صورت نہیں رہی۔ کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ میں اس کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نہیں آپ کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ اگر نیک صحبت میسّر نہ ہو، پھر ایک اور تدبیر ہے۔ جس سے آپ اپنے دین میں کمال پیدا کرلیں۔ اخلاق درست کرلیں اور سیدھے راستے پر پڑ جائیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کسی ایک آدمی سے دوستی پیدا کرلیں۔ اور دوستی اللہ کے لئے پیدا کریں معاہدہ یہ ہو کہ ہم اس لئے دوستی کر رہے ہیں کہ میں تمہارے دین کی حفاظت کروں گا، تم میرے دین کی حفاظت کرنا۔ اگر میں نماز میں سستی کروں کان سے پکڑ کر گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے جانا اور تم نے اگر سستی کی، میں لے جاؤں گا۔ تم اگر برے راستہ پر گئے میں زبردستی ہٹاؤں گا۔ اگر میں چلوں تو تم ہٹانا۔ ہم اس لئے آپس میں دوستی کرتے ہیں کہ اس دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دین کی حفاظت ہو جائے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اگر آپ نے کسی ایک شخص سے دوستی کرلی اور اس میں روک ٹوک شروع ہوئی اور روک ٹوک دوسرا ہی کرسکتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اپنا عیب انسان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا فوراً پرکھ لیتا ہے کہ یہ عیب

کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہو کے نظر پڑتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی آدمی تنکا نہیں سمجھتا''۔ اپنی برائی کو آدمی خود محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا فوراً سمجھ لیتا ہے یہ برائی ہے۔ اپنے ساتھ آدمی کو بڑا حُسنِ ظن ہوتا ہے کہ میں تو اچھا ہوں۔ میرے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس حُسنِ ظن سے جب دیکھتا ہے اپنی ہر حرکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کوئی برائی کی۔ دوسرے کو اتنا حسن ظن ہوتا نہیں اس واسطے وہ نگاہ رکھتا ہے۔ پھر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ برائی ہے اور ہے وہ دوست، تو فوراً ٹوکے گا کہ بھئی! اس برائی کو چھوڑ دو۔ اس دوستی کو شریعت کی اصطلاح میں مواخات کہتے ہیں۔ یعنی دین کی خاطر بھائی چارہ قائم کرنا۔ کہ بھئی! جب میں کسی اچھی جگہ جاؤں گا، تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، تم کہیں جاؤ تو مجھے ساتھ لے جانا تم برائی کرو، تو میں روک دوں گا۔ میں برائی کروں تو تم مجھے روک دینا۔ غرض ایک دوسرے کے دین کے حفاظت کریں گے۔ اس لئے بھائی بندی اور دوستی اختیار کرتے ہیں۔ اس کو مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

یہ اصول خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپ تشریف لائے۔ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کو ملا کر دونوں میں آپ نے بھائی چارہ قائم کیا۔ جتنے تھے سب کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔ یہ تمہارا دینی بھائی، یہ تمہارا دینی بھائی۔ اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، رہ گئے انصار کی تعداد ختم ہوگئی۔ سب مہاجرین کا بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو اب کوئی انصاری باقی نہیں تھا کہ ان کی بھائی بندی کسی سے کرائی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کچھ آزردگی پیدا ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَنَا اَخُوْکَ فِی اللّٰہِ" ① تیرا دینی بھائی میں بنتا ہوں اور میرے ساتھ معاہدہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ خوش ہوگئے۔ اس سے بہتر کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھائی بنیں۔ بہر حال اس کو مواخات فی اللہ یعنی اللہ کے لئے بھائی بندی قائم کرنا کہتے ہیں۔ اس طرح سے اگر آپ بھائی بندی اختیار کریں تو چالیس دن میں پتہ چلے گا کہ کتنی برائیاں دور ہوگئی ہیں۔ اس واسطے کہ وہ دوست آپ کی برائیاں دیکھ دیکھ کر آپ کو مطلع کرے گا۔ آپ متنبہ ہوں گے۔ بہت سی برائیوں کی اصلاح ہو جائے گی بہت سے برے اخلاق چھوٹ جائیں گے، اس کے بھی چھوٹ جائیں گے، آپ کے بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو بھائی بندی کے اصول سے آپ نے وہ چیز کمالی۔ جو کسی شیخ وقت سے کماتے، کسی عالم ربانی کی صحبت سے کماتے یا کسی درویش ربانی کی صحبت میں بیٹھ کر کماتے۔ اب یہ عذر باقی نہیں ہے کہ صاحب! میری بستی میں نہ کوئی عالم ہے نہ درویش نہ سچے لوگوں لوگوں میں سے کوئی ہے، میرے اخلاق درست نہیں ہو سکتے تو دوسرا طریقہ مواخات کا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اخلاق درست کریں۔ اس اصول پر چل کر چالیس دن کے بعد فرق محسوس کریں گے۔ اگر اسی طرح برس دن گزر جائیں۔ اس وقت تک آپ ولی بن جائیں گے۔ اس لئے اصل چیز فیض صحبت ہے۔ دوسرے درجے کی چیز مواخات ہے۔

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ تعالی عنہ، ج: ۱۲ ص: ۱۸۳ رقم: ۳۶۵۴.

علم واخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، اِتّعاظ بالغیر ...... لیکن اگر آپ پھر کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی بستی میں ہوں جہاں کوئی اچھا آدمی نہیں کہ میں اسے دوست بناؤں۔ سب برے ہی برے پھر رہے ہیں۔ یہ عقل سے تو بعید ہے کہ کوئی ایسی بستی ہو جس میں کوئی بھی اچھا آدمی نہ ہو۔ یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہوگا سو پچاس ہوں گے۔ تو علماء یہ لکھتے ہیں کہ چالیس آدمی جمع ہو جائیں ان میں کوئی نہ کوئی مقبول الٰہی ضرور ہوتا ہے۔ تو ایک بستی کی بستی ہو اور کوئی اللہ کا مقبول نہ ہو یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتا ہوں کہ بستی کے اندر کوئی بھلا آدمی نہیں اور دوست ہونے کے بجائے سارے آپ کے دشمن ہی دشمن پھر رہے ہیں، بدخواہ ہی بدخواہ ہیں کوئی بھی نیک انسان نہیں۔ میں کس سے بھائی چارہ قائم کروں؟

میں اس کے لئے ایک تیسری تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کیسے؟ اس کو اِتّعاظ بالغیر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں سے عبرت پکڑ کر اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ٹوہ لگائیں۔ کہ آپ کے دشمن آپ کے حق میں کیا کہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن آپ کی بھلائیاں تو پھیلانے سے رہے۔ وہ تو چھانٹ چھانٹ کے آپ کی برائیوں کو شہرت دیں گے۔ فلانے میں یہ کھوٹ ہے، یہ برائی ہے۔ اگر آپ کی بھلائیاں شائع کرنے لگیں، وہ دشمن ہی کیا ہوئے۔ وہ تو آپ کے دوست ہوئے۔ مگر دشمن کا کام یہی ہے کہ برائیاں چُن چُن کر پھیلائے، بدنام کرنے کی کوشش کرے، رسوا کرے، آپ اس دشمن سے شیخ وقت کا کام لیں۔ وہ یہ کہ آپ یہ سنیں کہ میرے دشمن کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے جائیں آپ اسے چھوڑتے جائیں۔ جتنی برائیاں وہ بیان کریں، آپ اسے ایک ایک کر کے چھوڑ دیں۔ چالیس دن تک آپ عمل کر کے دیکھیں۔ بیسیوں برائیاں آپ میں سے ختم ہو جائیں گی۔ تو دشمن سے آپ نے وہ کام لے لیا، جو شیخ وقت سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کام لینا چاہیں، دشمن سے بھی لے سکتے ہیں۔ تو پہلی چیز فیضِ صحبت، دوسری مواخات فی اللہ اور تیسری اِتّعاظ بالغیر ہے کہ غیر سے نصیحت حاصل کرنا۔ تو دشمن سے آپ نے شیخ وقت کا کام لے لیا۔ اس لئے اگر کوئی اپنے دین کو درست بنانا چاہے تو راستہ کہیں رُکا ہوا نہیں ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبۂ نفس ...... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ جہاں نہ کوئی عالم وعارف نہ کوئی دوست، نہ دشمن گویا یہ بعید بات ہے کہ دوست نہ ہو۔ لیکن دشمن بیسیوں مل جاتے ہیں۔ دشمن تو ٹکے سیر ملتے ہیں اور دوست سینکڑوں روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ ٹکے سیر بھی زیادہ قیمت ہے۔ دشمن تو مفت بھی مل جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ آدمی پڑھا نہ لکھا تو جہالت کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنیاں ہی کرے گا۔ دوست علم واخلاق سکھاتے ہیں۔ جب علم واخلاق حاصل نہ کئے تو آدمی دنیا میں دشمنی اور حسد ہی کرتا پھرے گا۔ برائی چاہے گا، بھلائی نہیں چاہے گا۔ اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں بالکل تن تنہا ہوں۔ میرے اخلاق کی درستگی کا کوئی طریقہ نہیں۔ اس لئے کہ سفر کر کے یوں نہیں جاسکتا کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ گھر میں

میرے پاس کوئی عالم اور درویش نہیں۔ اپنے ماحول میں میرا کوئی دوست اور دشمن نہیں۔ میرے لئے اب تحصیل علم واخلاق اور کمال پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو میں چوتھی تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ اس کے باوجود بھی اپنے اخلاق درست کرلیں۔ اور وہ بھی صحیح طریقہ ہے، فرضی نہیں ہے۔ اس طریقہ کا نام محاسبہ نفس ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ آپ عشاء کی نماز کے بعد دس منٹ مقرر کرلیں اور اس میں یہ سوچیں کہ آج دن میں، میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں کی ہیں، تو عمر بھر کی بھلائی برائی یاد نہیں رہے گی۔ لیکن دن بھر کی بھلائی برائی یاد رہے گی کہ آج کس کو فائدہ پہنچایا، سخاوت کی، کس کی غیبت کی، کس کی چغلی کھائی، میں نے کوئی جھوٹی گواہی دی، کتنوں کا میں نے مال دبالیا، بدنیتی کر کے کس کا قرضہ دبالیا۔ جیب کتری، غرض جو بھی بری حرکت دن میں کی ہے، رات کو ضرور یاد رہے گی۔ اتنا بدحافظہ کوئی نہیں ہوتا کہ دن بھر کی باتیں عشاء کے بعد بھول جائے۔ تو محاسبہ کر کے شمار کر لیجئے کہ دس میں نے نیکیاں کی ہیں اور دس ہی بدیاں۔ دس نیکیوں پر اللہ کا سچے دل سے شکر ادا کیجئے۔

کہ اے اللہ! میں قابل نہیں تھا کہ نیکی ادا کروں۔ یہ تیرا فضل اور احسان ہے تو نے مجھ سے نیکی کرادی میرے میں کہاں اہلیت تھی۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے نیکی کی تو ارادہ بھی تو ہی پیدا کرنے والا ہے۔ میں ارادے سے نیکی کرتا۔ لیکن اگر عمل کرنے کے سامان نہ ہوتے عمل کیسے کرتا؟ وہ سامان تو نے ہی پیدا کئے، توفیق تو نے دی، بدن میں طاقت تو نے دی۔ تیرے فضل وکرم سے یہ نیکی ہوئی۔ میں شکر کرتا ہوں اور تیرا احسان مانتا ہوں۔ وعدہ خداوندی ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① جس نعمت پر شکر ادا کرو گے۔ اس نعمت کو بڑھاؤں گا، ترقی دوں گا۔ لہٰذا جب آپ نیکیوں پر شکر ادا کریں گے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق نیکیاں بڑھنی شروع ہوں گی۔ مال پر شکر ادا کرو گے، مال بڑھے گا، دین پر شکر کرنے سے دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے، صحت ترقی کرے گی۔ قوت پر شکر ادا کرو گے، قوت بڑھے گی۔ دین پر شکر ادا کرو گے، دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے عمل صالح ترقی کرے گا۔ اس لئے کہ آیت عام ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① یہ نہیں فرمایا: ”لَئِنْ شَكَرْتُمْ فِي الْمَالِ لَأَزِيدَنَّكُمْ“ مال پر شکر کرو گے میں بڑھادوں گا اور کسی چیز پر وعدہ نہیں۔ تو کوئی قید نہیں لگائی اور جب بلاقید کے فعل آتا ہے تو ہر چیز اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے نیکیوں پر شکر ادا کیا۔ تو وعدہ خداوندی کے مطابق اس میں ترقی ہوگئی۔

اور دس ہی برائیاں یاد آئیں کہ کچھ چغلی کھائی تھی، غیبت کی تھی، کچھ یہ کیا، کچھ وہ کیا، کسی کا مال مارلیا، کچھ ناپ تول میں کمی کردی، ڈنڈی ماری اور مال کم دیا، پیسے گاہک سے پورے لے لئے یا مال خراب دے دیا دام پورے کر لئے۔ تو ایک تو حقوق اللہ ہیں دیانت کے بارے میں۔ اس میں توبہ سے معاف ہو جانے کی توقع ہے۔ تو

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

جب بدیاں یاد آئیں ان سے توبہ کرلیں دس بدیاں تھیں چاہے دس دفعہ توبہ نہ کریں۔ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں دس بدیاں معاف ہو جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وعدہ خداوندی ہے۔اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''۔ بالکل پاک صاف ہو گیا تو نیکیوں پر شکر کیا، وہ بڑھنی شروع ہوگئیں۔ بدیوں پر توبہ کی وہ گھٹنی شروع ہوگئیں۔ چالیس دن اگر آپ اس عمل کو روزانہ کریں گے۔اور دس دس بدیاں روزانہ کا حساب لگائیں تو چالیس دن میں چار سو بدیاں کم ہوگئیں۔ حالانکہ چار سو آپ کرتے بھی نہ، مگر بالکل مٹ گئیں شیخ وقت اتنی بدیاں نہ مٹا سکتا۔جتنی آپ نے محاسبہ نفس سے مٹا دیں۔ آپ نے اپنے اخلاق درست کر لئے۔اب آپ کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی کہ صاحب! میرے ہاں نہ کوئی شیخ ہے نہ عالم نہ دوست نہ دشمن. مجھ سے اللہ میاں پوچھیں گے کہ تو نے اخلاق کیوں نہیں درست کیے؟ میں کہہ دوں گا، حضور! اخلاق کو درست کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کیسے درست کرتا اور پیسہ میرے پاس نہیں تھا کہ سفر کر کے کسی بزرگ کے پاس جاؤں اس واسطے میں بداخلاق رہ گیا۔فرمائیں گے نہیں تو تنہا پہاڑ پر تھا۔ جب بھی اخلاق درست کرنے کا طریقہ تھا اور وہ محاسبہ تھا۔اپنے نفس کا حساب لینا تھا۔اگر آپ عشاء کے بعد دس منٹ روز اس مراقبہ کو کرلیا کریں اور پھر اندازہ کریں چالیس دن کے بعد کتنے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ کتنی بداخلاقیاں گھٹتی ہیں، کتنی نیکیاں بڑھتی ہیں۔آپ جتنا کام ایک شیخ وقت سے لیتے۔آپ نے شیخ وقت اپنے نفس کو بنالیا۔نفس نے وہی کام کیا جو ایک شیخ وقت اور مربی دین کرتا ہے۔

اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں ...... حاصل یہ نکلا کہ اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلا دیئے ہیں، کرسکتے ہیں۔ نہ چاہیں، خود پیغمبر بھی نصیحت کریں۔ آدمی درست نہیں ہوسکتا۔جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی۔ اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔کوئی صدیق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی فاروق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی ذی النورین رضی اللہ عنہ بنا، کوئی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بنا اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی تو کوئی ابوجہل بن گیا، کوئی ابولہب بن گیا، کوئی مسیلمہ کذاب بن گیا۔غرض بگڑے ہی رہے اور نبی وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہوسکی۔اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھی۔

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جب تمہیں ہی مقصود نہیں کہ اپنی اصلاح کرو تو دس تاویلیں کرلو گے، دس باتیں بنالو گے۔مگر اللہ کے ہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔دنیا کو آدمی دھوکہ دے سکتا ہے۔تو خدا کی حجت بندے پر پوری ہوچکی۔کسی بھی حالت میں

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد باب ذكر التوبة، ج: ۱۲ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۲۴. علامہ سخاوی فرماتے ہیں: ہمارے شیخ (ابن حجرؒ) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے لیکن اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۸۴ حرف التاء.

ہوں اصلاحِ اخلاق کا راستہ موجود ہے۔ دوست و دشمن میں ہوں جب بھی تنہا یا جماعت میں ہوں تب بھی۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ دنیا میں ہر چیز میں شر اور برائی اس کی ذات میں گھسی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ تو انسان کا بچہ بھی پیدائشی طور پر برائیوں سے بھرپور ہے۔ جب تک اصلاح کی جدوجہد نہیں کرے گا۔ اس میں خوبی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کی طبعی جہالت رفع نہیں ہوگی۔ جب تک علم حاصل نہ کر لے اس کے اخلاق پاکیزہ نہیں بنیں گے جب تک کسی بااخلاق کی صحبت نہ اٹھائے یا قلب کا محاسبہ نہ کرے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

جب آدمی اپنی اصلاح خود نہ چاہے، کوئی اصلاح نہیں کر سکتا۔ خود اپنی خواہش سے آدمی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ ① ''اے پیغمبر! قیامت سے آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں، جو دل میں ڈرنے کا ارادہ رکھتا ہے''، جو اپنے دل میں ڈرنے کا مادہ رکھتا ہے اور جس نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو مجھے نہیں ڈرنا، اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ وہ جب قبر میں جائے گا جبھی اسے ڈر لگے گا۔ دنیا میں اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے۔ بڑے سے بڑا عالم آ جائے لیکن وہ نہ چاہے کہ مجھے علم پہنچے، کبھی بھی علم نہیں پہنچے گا۔ بڑے سے بڑا درویش اور ربانی آ جائے اور اس کا جذبہ نہ ہو کہ میں اخلاق درست کروں، کبھی بھی اخلاق درست نہیں ہوں گے اور اگر اپنا جذبہ ہو کہ اخلاق درست کروں تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ آپ اپنے نفس سے درست کر لیں گے۔ اصل میں آپ کا جذبہ اور آپ کا عزم ہے۔ یہ اصل چیز ہے۔ عارف رومی نے کہا ہے کہ ۔

آب کم جو، تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو، اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس ہوگی تو پانی خود آ جائے گا۔ پیاس تو ہے نہیں اور آدمی یوں چاہے کہ پانی آ جائے، تو اوپرے دل سے پانی کی تلاش کرے گا۔ اوپرے دل سے طلب کرنے پر کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ دل کے جذبے سے جب طلب ہوتی ہے، جبھی ملتا ہے۔

اگر بیوی یوں کہے کہ فلاں زیور بنوا کے دے اور خاوند کے دل میں جذبہ پیدا ہو تو خاوند چوری کر لے گا، ڈکیتی کرے گا۔ مگر اسے بنا کے دے گا۔ اس لئے کہ جذبہ پیدا ہو گیا اور جذبہ نہیں ہے تو وہ لاکھ چلائے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کام تو اپنے جذبے سے چلتا ہے جب تک دل میں طلب نہیں ہوگی محض کہنے سننے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ حال ایمان اور دین کا ہے. لاکھ وعظ کہنے والے وعظ کہیں۔ لیکن جب تک آپ کا عزم نہیں ہوگا کہ ہم درست ہوں۔ کبھی بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر آپ وعظ میں اس نیت سے آئیں کہ بھئی! دیکھیں کون کیسا بولتا ہے۔ گویا آپ تماشا دیکھنے آئے کہ بھئی! مداری کا تماشہ تھا۔ فلاں نے اچھا کہا اور فلاں نے غلط۔ کبھی بھی فائدہ نہیں

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۴۵.

ہوگا اور اگر اس لئے آئے کہ مجھے بھی کچھ دین کی بات لے کے جانی ہے، مجھے زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی جاہل آدمی بھی سچی بات کہے گا۔ تو اس سے بھی آپ عبرت پکڑیں گے۔ اپنے دل کی خود ہی اصلاح کرلیں گے۔ تو پھر اپنے اوپر بات رہی۔ اپنے اندر طلب صادق پیدا کیجئے اپنے اندر پیاس پیدا کیجئے پانی آجائے گا۔ اپنے اندر زر کی طلب پیدا کیجئے۔ دولت آنے لگ جائے گی۔ اس کے لئے دس حیلے کریں گے۔ دوکان پر بیٹھیں گے، زمین پر جائیں گے، صنعت وحرفت کریں گے دولت آجائے گی اور اگر آپ کے دل میں طلب نہیں ہے، سست پڑا رہنا آپ کو گوارا ہے کہ بس چارپائی پر پڑے رہو، اس سے کیا ملے گا؟

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک کاشت کار ہو۔ برسات کی ہوائیں چلیں اور پانی پڑنا شروع ہوا۔ تو اس وقت بیج ڈالا جاتا ہے، بیج ڈالتے ہیں تو کھیتی اُگتی ہے۔ مگر کاشت کار نے کہا، کیسی عمدہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ چار مہینے ٹھنڈی ہواؤں کے ہیں۔ میں پڑ کے آرام سے سوؤں گا۔ کون جائے کھیت پر؟ کون بیج ڈالے؟ برسات کے چار مہینے اس نے چارپائی پر پڑ کے گزارے۔ یہاں تک کہ برسات ختم ہوگئی، گرمی آئی اور لو چلنی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر میں غلے لے کے آئے اور یہ اب منہ تک رہا ہے۔ بیج ڈالتا تو غلہ لے آتا؟ مگر اس نے سونے میں اور آرام طلبی میں سارا وقت گزار دیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا اب تو جو بیج پڑا ہوا ہے، اس کے بھی مارے جانے کا اندیشہ ہے، لو چل رہی ہے، آگ کی سی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اب کھیتی باڑی کا کیا کام؟ تو جیسے اس وقت سُست کاشت کار کو پشیمانی اور ندامت ہوگی۔ مگر وہ ندامت کام نہیں دے گی اس لئے کہ وقت گزر چکا۔ اس طرح سے اگر ایک دین کے طالب میں سچی طلب نہیں ہے اور یہ دنیا کی عمر اس نے لہو ولعب اور کھیل کود میں گزار دی اور یہ سمجھ کے کہ آج تو چارپائیاں بھی ہیں، بستر بھی ہیں اور کھانے کی نعمتیں بھی ہیں۔ اب کون جائے نماز کو؟ اور کون روزے رکھے؟ کون دین کی تلاش کرے؟ یہ مزے پھر کہاں ملیں گے۔ تو جب موت کا وقت آئے گا۔ اس وقت کہا جائے گا۔ ﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ ① "اس نفس کو حوالے کرو، یہ تمہاری ملک نہیں ہے۔ آج کے دن عذاب چکھنا پڑے گا"۔ اب ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو اس وقت ندامت نہ فائدہ دے گی نہ عمل کا وقت ہوگا۔

دنیا کا ہر ذرّہ واعظ ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت ملک الموت سے کہیں گے کہ اے ملک الموت! مجھے تھوڑا سا وقفہ دو کہ میں توبہ کرلوں اور میں اللہ کی طرف رجوع کرلوں۔ ملک الموت حیرت سے کہیں گے کہ کیا تیرے پاس میرے قاصد نہیں پہنچے؟ انہوں نے تجھے موت کا پیغام نہیں پہنچایا؟ جو آج توبہ کے لئے مجھ سے وقت مانگ رہا ہے؟ میرے بیسیوں قاصد اسی لئے پہنچے کہ تو توبہ کرے، وقت موجود تھا۔ اتنے قاصدوں پر جب تو نے توبہ نہ کی۔ میں تو آج آخری قاصد ہوں۔ اس کے بعد توبہ کا زمانہ ہی نہیں۔ وقت گزر

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۳.

گیا۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی قاصد نہیں پہنچا۔ ملک الموت کہیں گے: قاصد نہیں پہنچا؟ میں نے بہت سے اپنے پیامبر بھیجے۔ جنہوں نے اطلاع دی ہوگی کہ میں تیرے پاس آنے والا ہوں۔ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ فرمائیں گے کیا تیری داڑھی میں سفید بال نہیں آئے؟ کیا تیرے سر کے اندر بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہوئے؟ یہ بڑھاپا میرا ہی تو قاصد تھا، جو خبر دے رہا تھا کہ میرے آنے کا وقت آ رہا ہے۔ موت کا پیغام آ چکا ہے۔ موت قریب آنے والی ہے وہ میرا قاصد ہی تھا۔ فرمائیں گے کیا تیرے پوتے نہیں پیدا ہوئے؟ نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی قاصد تھے کہ ان کا زمانہ آ گیا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کا وقت ختم ہو چکا۔ ان کے لئے جگہ خالی کرو۔ یہ میرے ہی تو قاصد تھے، جو خبر دے رہے تھے۔ ﴿ وَجَآءَكُمُ النَّذِيرُ ﴾ کیا ڈرانے والے تیرے پاس نہیں آئے؟ یہ سارے میری طرف سے آئے تھے۔ اور فرمائیں گے، کیا یہ دن رات کا لوٹ پھیر، اس نے تجھے وعظ نہیں کیا؟ سورج طلوع ہوا، طلوع کے بعد عروج کرتے کرتے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب گرنا شروع ہوا، یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ سورج کا چہرہ فق ہوا، روشنی زرد پڑ گئی اور آخر میں غروب ہو کر چھپ گیا۔ گویا ختم ہو گیا۔ روز طلوع اس کی حیات ہے اور غروب اس کی موت ہے۔ جب اتنی بڑی ہستی روزانہ آتی بھی ہے اور فنا بھی ہے، مٹنا بھی ہے، چھپ جانا بھی ہے۔ تو سورج بھی ایک واعظ ہے۔ جو وعظ و نصیحت کہتا ہے۔ لیکن کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھے۔ تو اس کے وعظ کو سنے گا۔ اور اگر بیلوں کی نگاہ سے دیکھے، تو بیل کے سامنے بھی سورج چھپتا ہے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اس لئے کہ نہ عقل ہے نہ علم۔ اگر انسان بھی کائنات کے واقعات کو بیلوں کی طرح دیکھنے لگے کہ واقعات کی صورت تو دیکھ لے۔ عبرت، نصیحت حاصل نہ کرے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ گیا۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ جانور واقعات کی صورتوں کو دیکھتا ہے۔ انسان ان کی حقیقتوں میں گھس کر ان سے کچھ علم اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ حق تعالٰی نے اس کی شکایت فرمائی۔ فرمایا: ﴿ وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ ① کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گزرتی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے اور آنکھ بند کر کے چلا جاتا ہے۔ اس سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتا اور فرمایا، بہت سے وہ لوگ ہیں کہ ایمان لاتے ہوتے ہیں۔ پھر بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ مومن بن گئے ہیں، مگر شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز سے کٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ہر حادثے کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور مالک کو پہچانتے۔ لیکن یہ پھر بھی اپنے ہی نفس کی رضا میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہی نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی آرام کی فکر میں ہیں۔ نہ آخرت، نہ عبرت، نہ نصیحت، پیش نظر تو مومن بھی ہیں مگر ساتھ مشرک بھی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے، کہ سورج کے طلوع و غروب کے واقعات حیوان کے اوپر بھی گزرتے ہیں اور انسان بھی دیکھ رہا ہے۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۵، ۱۰۶۔

حیوان فقط شکل کو دیکھتا ہے، انسان اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہے تو کون سا ذرہ خالی ہوگا، جس میں تغیرات نہ ہوں۔ ہواؤں کا چلنا، زمین کی تعمیر وتخریب موسموں کا آنا جانا، پھلوں کا آنا اور مٹ جانا۔ ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ عالم موت اور حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیدائش بھی ہے اور موت بھی ہے، عروج بھی ہے زوال بھی ہے۔ ترقی بھی ہے، تنزلی بھی ہے، تعمیر بھی ہے، تخریب بھی ہے۔ جو چیز پیدا ہوئی وہ موت کے منہ میں ضرور جائے گی۔

عیسیٰ بن مریم نے فرمایا: ''لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ '' ① جو موت کے لئے بچوں کو مرنے کے لئے پیدا کرو، تعمیریں بناؤ ڈھانے کے لئے جو تعمیر بنے گی، ایک دن اس کی تخریب بھی ہوگی۔ دنیا میں ہر تعمیر کے لئے تخریب اور ہر بقاء کے لئے فنا لازم، ہر حیات کے لئے موت لازم، ہر آغاز کے لئے انجام لازم ہر ابتداء کے لئے انتہا لازم۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔

ہمارے مرشد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے ذرات کو اور حالات کو دیکھو کہ وہ اعلان کرر ہے ہیں کہ "فَافْهَمْ فَافْهَمْ......" اب بھی سمجھو، اب بھی سمجھو، غفلت کی نیند کو چھوڑ دو، ان تغیرات کو دیکھ کر اب بھی متوجہ ہو لو، کہ تم میں بھی تغیر آنے والا ہے۔ تم بھی اس دنیا کے جز ہو۔ جب دنیا کے ہر جز میں تغیر ہے اور تغیر کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ تو تم بھی فنا کی طرف جارہے ہو۔ انسان پر جو بیماریاں آتی ہیں۔ یہ علامت ہے کہ جب یہ تغیر صحت سے پیدا ہوا تو صحت والے پر بھی ایک دن تغیر آنے والا ہے، طاقت بدن میں آتی ہے ایک دن اس کے گھٹنے کا زمانہ بھی آتا ہے۔ غذائیں ہضم کرنے کی قوت ہوتی ہے، ایک دن ضعف تغیر کا زمانہ ہے، جوانی آتی ہے، ایک دن بڑھاپے کا دور آنے والا ہے۔ جب انسان کے عوارض میں تغیرات ہیں تو ذات میں بھی تغیر ہوگا۔ یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ سارے واعظ ومقرر ہیں۔ سارے نصیحتیں کرر ہے ہیں۔ آپ اس تلاش میں ہیں کہ کسی واعظ، مقرِّر یا عالم کو بلائیں اور تقریر سنیں میں نے ہزاروں واعظوں کا پتہ دے دیا کہ گھر بیٹھئے اور وعظ سنتے جایئے۔ سورج زمین، ہواؤں کا چلنا، دنیا کے تغیرات۔ الغرض ذرہ ذرہ واعظ ہے، سننے والا اور عبرت پکڑنے والا ہونا چاہئے وہ ہر جز سے عبرت پکڑے گا۔ تو گھر میں واعظ موجود ہے اور گھر چھوڑ آپ کے بدن کے اندر واعظ موجود ہیں۔ اپنے اندر کے تغیرات کو دیکھئے کہ ہر ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ استاد داغ بڑا شاعر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ؎

ہوش وحواس، تاب وتواں داغ جاچکے ‏ ‏ ‏ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

سامان تو چلا گیا۔ اب مسافر بھی روانہ ہو رہا ہے۔ روزانہ سامان جاتا رہتا ہے اور ہمیں عبرت نہیں کہ ایک

① المطالب العالية، كتاب الرقاق، باب الوصايا النافعة ج: ۹ ص: ۱۳۶ رقم: ۳۱۹۹۔

وقت آ رہا ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں نوشیرواں کا واقعہ لکھتے ہوئے خوب کہا ہے کہ ۔

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر ۔۔۔۔۔ زاں پیشتر کہ بانگ در آید فلاں نماند

اے عزیز! کچھ نہ کچھ خیر اور بھلائی کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ یہ موتیوں جیسے دن ہیں۔ جو جا رہے ہیں انمول موتی ہیں۔ جو قیمت سے نہیں، اللہ نے بلا قیمت دے دیئے ہیں۔ تو کوئی خیر کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ اس سے پہلے کہ یہ آواز دی جائے کہ آج فلاں نہیں رہا۔ ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾ ① اس سے پہلے کچھ کرنا ہے تو کر لے۔ آج ہم قبرستانوں سے گزرتے ہیں۔ ہزاروں وہ آدمی جو ہمارے دوست، احباب، والد، عزیز، اقرباء تھے آج وہ قبر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیں اور خاک کا جز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افسوس! یہ آدمی تھے اور آج نہیں۔ کل کو ہم پر بھی یہی وقت آنے والا کہ گزرنے والے ہمارے اوپر سے گزریں گے اور کہیں گے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں تھے۔ مگر آج ان کا نشان اور پتہ نہیں تو ہر شخص اس راستے پر جانے والا ہے کچھ اس راستے کی بھی فکر کر لینی چاہئے۔

شیطانی دھوکہ...... بعض آدمی کو دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرے اندر قوت ہے۔ جب بڑھاپا آئے گا، توبہ کر لیں گے ابھی تو کھانے پینے لہو ولعب اور قوت کا دور ہے۔ موت کے کچھ آثار ونشانات نہیں ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا اور یہ بات سامنے آجائے گی کہ اب چند دن باقی رہ گئے۔ اس وقت توبہ کر لیں گے اب مزے اڑا لیں۔ عیش میں رہیں۔ مگر یہ محض دھوکہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اس لئے کہ موت کے لئے بڑھاپا، جوانی، بیماری شرط نہیں ہے۔ بلا بیماری کے آدمی بیٹھے بٹھائے چلا جاتا ہے۔ جوان بھی مرتے ہیں، بچے، بوڑھے بھی مرتے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے سب کو آ رہی ہے۔ اس وسوسے کو تب آپ دل میں جگہ دیں کہ بڑھاپے کے بغیر آدمی مرا ہی نہ کرتا۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھی موت کا وقت ہی نہیں آیا۔ لیکن جب بڑھاپے سے پہلے موت آجاتی ہے پھر دل میں یہ خیال کیسے گزرا کہ بڑھاپا آئیگا جب توبہ کر لیں گے۔ کیا خبر ہے کہ بڑھاپا آئے گا بھی کہ نہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں، میں تو یوں کہوں گا کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ جوانی میں موت زیادہ آتی ہے۔ بوڑھاپے میں کم آتی ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ مجمعوں کو دیکھیں، بازاروں میں گھومیں۔ آپ کو بوڑھے کم نظر آئیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے، تو دنیا میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سارے سفید داڑھی کے نظر پڑا کرتے حالانکہ جوان زیادہ نظر پڑتے ہیں، بوڑھے کم نظر پڑتے ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ پہلے ہی ختم ہو جاتے

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۶۔

ہیں۔تو جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم موت آتی ہے۔ یہ محض ایک دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا، توبہ کر لیں گے۔ بڑھاپا شرط نہیں اور تو اور ماں کے پیٹ میں بھی مرجاتے ہیں۔ دنیا میں آنے ہی نہیں پاتے۔ اس کی بھی نظیریں ہیں تو موت کے لئے کوئی خاص سبب متعین نہیں ہے۔ پھر اس میں اس دھوکے میں پڑنا کہ جب فلاں بات ہوگی، تب توبہ کریں گے۔ آج نہیں کل کریں گے یہ جو کل پر بات ٹالنے کا عادی ہوگیا ہے۔ جب وہ کل آئے گی تو اگلی کل پر ڈال دے گا۔ وہ آئے گی تو اس سے اگلی کل پر۔ اسی کل کل میں رہے گا اور موت کا وقت آجائے گا۔ توبہ نصیب نہیں ہوگی۔ جسے توبہ کرنی ہے۔ وہ آج کرے اور اس عمر کو غنیمت سمجھے۔

عمل کا زمانہ جوانی ہے...... بلکہ یہ خیال کرے کہ عمل کرنے کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپے کا زمانہ عمل کا نہیں ہوتا بڑھاپے کا زمانہ پنشن کا زمانہ ہے اور حق تعالیٰ کے ہاں پنشن دی جاتی ہے۔ جیسے گورنمنٹ کے ہاں پچپن سال کی عمر ہو جائے تو پنشن دے دیتے ہیں۔ مگر گورنمنٹوں بے چاریوں کے خزانے چھوٹے ہیں۔ اس واسطے وہ آدھی پنشن دیتے ہیں۔ دوگنی اور تگنی تو کیا؟ پوری تنخواہ بھی نہیں۔ آدھی تنخواہ دیتے ہیں۔ اللہ میاں کے ہاں سے پوری پنشن ملتی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جوانی میں کوئی عمل کرتا تھا۔ بڑھاپا آ گیا، طاقت رہی نہیں اور عمل نہیں کر سکتا حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔ کہ نامہ اعمال میں ثواب برابر لکھتے رہو۔ اس واسطے کہ اس نے خود نہیں چھوڑا بڑھاپا ہم نے بھیجا ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لہذا عمل برابر لکھتے رہو۔ گویا آج بھی عمل کر رہا ہے۔ جو دس مسئلے پڑھتا اور آج وہ نہیں پڑھ سکتا مگر ثواب دس ہی کا لکھتے جاؤ اس لئے کہ اس کے ارادے کا قصور نہیں ہے۔ لہذا جوانی عمل اور بڑھاپا پنشن کا زمانہ ہے۔ جس نے جو کچھ کیا، جوانی میں کیا ہے۔ اس واسطے جوانی کے اندر یہ لیت ولعل کہ جب بڑھاپا آجائے گا، جب توبہ کرلیں گے۔ "الٹے بانس بریلی کو" یہ تو اوندھا قصہ ہے کہ جب پنشن ملنے کا زمانہ آئے جب آدمی کہے کہ میں کام کروں گا۔ جیسے کوئی آدمی گورنمنٹ سے کہے کہ صاحب! ابھی تو میری پندرہ برس کی عمر ہے۔ ابھی آپ مجھے ملازم نہ رکھیں۔ جب میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں، جب ملازم رکھیں۔ گورنمنٹ کہے گی کہ تو پاگل ہوگیا ہے۔ ارے ملازمت کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپا پنشن کا اور عمل کے چھوڑنے کا زمانے ہے۔ تو عمل کا زمانہ سمجھ رہا ہے۔ یہی دین میں بھی بات ہے۔ جس نے جو کچھ بھی کیا ہے، جوانی میں کیا ہے بڑھاپے میں تو ثواب لوٹنے کا زمانہ ہے۔ وہ کسی شاعر نے کیا خواب کہا ہے کہ ؂

من نمی گویم کہ زیاں کن، یا بند سود باش ۔۔۔ اے زفرصت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

میں یوں نہیں کہتا کہ کوئی نفع یا نقصان کا کام کرو۔ یہ کہتا ہوں کہ جو کرنا ہے جلدی کرلو۔ اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا۔ تو عمل کا زمانہ یہی ہے جسے توبہ کرنی ہے آج کرے، کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اس واسطے وعظ سن کر یا دنیا کے ان ذروں سے وعظ سن کر یا دیکھ کر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کرے۔ ممکن ہے کل کو یہ جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں...... حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

میں لکھا ہے اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ میں ایک پیسہ اللہ کے راستے میں صدقہ کروں، فوراً کر دے۔ اس لئے کہ ممکن ہے گھنٹہ بعد قلب کی وہ کیفیت نہ رہے کہ ایک پیسہ دے کے کیا کروں گا اور ہزار دینے پر قادر ہوں گے۔ پھر یہ نہ ایک کرے گا نہ ہزار کرے گا۔ محرومی اس کے سر پر پڑے گی۔ اس لئے جب کسی نیکی کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، نیکی کے اندر مشورے طلب کرنے یا استخارے کرنے کی ضرورت نہیں۔ استخارہ مشورہ ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جن میں حق واضح نہ ہو کہ بھئی مشورہ کرلو، حق واضح ہو جائے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دے دیا۔ اس میں استخارہ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو۔ آپ نے کہا، میں ذرا گھر والوں سے مشورہ کرلوں کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں، تو لوگ کہیں گے، احمق آدمی! خدا کے حکم کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے کہا زکوٰۃ دو کہ جی میں ذرا استخارہ کرلوں۔ اگر استخارہ اللہ سے پوچھنے کو کہتے ہیں تو وہ خود کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں حکم دے رہے ہیں۔

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

کارِ خیر میں استخارہ کی ضرورت نہیں۔ جس میں آدمی کو تذبذب ہو اور اس کا خیر ہونا پوری طرح ثابت نہ ہو۔ اس میں استخارہ و مشورہ کرے۔ آج اگر کسی وعظ و نصیحت سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اللہ پر بھروسہ کرے۔ پھر وہ جاری بھی ہو جائے گی۔ ''لَیْتَ وَ لَعَلَّ'' میں نہ پڑے کہ کل کرلوں گا، پرسوں کرلوں گا۔ یہ شیطان کی طرف سے ڈھیل کرائی جاتی ہے کہ اس کے دل سے یہ جذبہ نکل جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تو جب جذبہ خیر، جذبہ حق آ جائے۔ اسے خدا کی طرف سے امر سمجھو، اسے کر ڈالو۔ تو اپنی اصلاح کا تھوڑا بھی جذبہ پیدا ہو، آدمی کر گزرے۔ اپنے اخلاق کو درست کرنے کا جذبہ خواہ نفس کے محاسبے سے ہو یا مواخات فی اللہ سے ہو یا غیروں سے عبرت پکڑنے سے ہو یا سچوں کی صحبت اختیار کرنے سے ہو، آدمی کر گزرے۔ اس لئے یہ حیلہ کام نہیں دے گا کہ صاحب! کوئی درویش، عالم نہیں ہے، کوئی دوست نہیں ہے، کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں بھئی! کوئی بھی نہیں تو خود تو موجود ہے۔ اپنے نفس سے ہی کام لے سکتا ہے۔

تو یہ ایک نسخہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ جو چار دواؤں پر مشتمل ہے۔ صحبتِ صالحین، مواخات فی اللہ، اِتعاظ بالغیر اور محاسبۂ نفس۔ اب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مل جائے۔ وہ بھی ان شاء اللہ کارآمد ہے۔ بعض نسخے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی ایک دوا بھی مل جائے۔ تو وہ بھی صحت کے لئے مفید ہوتی ہے اور اگر چاروں دوائیں مل کے معجون مرکب بن جائے، تو سبحان اللہ کہ صحبت نیک بھی میسّر ہو مواخاۃ فی اللہ کہ دینی بھائی بندی بھی ہو جائے، دشمنوں سے عبرت بھی پکڑے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے۔ چاروں دواؤں کا نسخہ اگر پیئے تو بڑا مقوی ہوگا۔ جس نسخہ کا ایک ایک جز شفا کا ذریعہ ہو۔ اس نسخے کے اگر سارے اجزا مل جائیں، وہ تو اکسیر بن جائے گا۔ اس واسطے یہ چند چیزیں میں نے ذکر کیں تا کہ ان سے عبرت بھی ہو۔ ان سے اپنی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہو

اوران سے اپنے اخلاق بھی درست ہوں اور آدمی یہ سمجھ لے کہ میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے۔خوبی کی میں جتنی محنت کروں گا آ جائے گی برائی محنت سے نہیں آتی۔ وہ میرے اندر پیدائشی طور پر ہے۔اسے زائل کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہے اوراس کے زائل کرنے کے یہ چار طریقے ہیں۔ جو میں نے عرض کئے۔بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔اب وقت بھی زیادہ ہوگیا ہے۔دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کی اصلاح کرنے، اپنے اعمال واخلاق کو درست کرنے اوراپنے عقائد کو سچا بنانے کی توفیق دے۔اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا نصیب فرماوے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور ہماری دنیا کو درست فرماوے، ہماری آخرت کو بھی درست فرماوے، ہم میں جتنے کھوٹ ہیں۔اللہ ان کو نکال دے، نفس میں جتنی بیماریاں گھسی ہوئی ہیں، ان کو زائل فرماوے۔اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رکھے، حق تعالیٰ ہر مشکل سے ہمیں بچائے، ہماری راہ درست فرمادے۔

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ."

رضائے اِلٰہی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:..... فَاَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ارْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ٥ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ (١)
(صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔ یہ سورۂ فجر کی آخری آیت ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اے نفس مُطْمَئِنَّہ! لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا''۔

یہ آیت بہت سے علوم ومعارف اور حقائق پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ موقع نہ سب کے بیان کرنے کا ہے اور نہ ہی وقت ہے کہ پوری تفسیر کی جائے اور پورے حقائق کی تشریح بیان کی جائے۔ ورنہ آیت کا جب حق ادا ہو کہ پہلے نفس مطمئنہ کی تشریح کی جائے کہ نفس مطمئنہ کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں؟ ﴿ اِرْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ﴾ (٢) اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ یہ لوٹنا کیسا ہے؟ لوٹنا جب ہوتا ہے کہ پہلے آنا واضح کیا جائے۔ راضی اور مرضی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ خاص بندوں میں شامل ہونے کی کیا حقیقت ہے؟ جنت میں داخل ہونے کی کیا کیفیت ہے؟ غرض یہ بہت سے مقاصد ہیں جن پر یہ آیت مشتمل ہے۔ ہر مقصد ایک مستقل موضوع ہے اور مستقل وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت نہیں ہے۔ اس لئے اس آیت کے سلسلے میں تین باتوں کے متعلق میں کچھ تشریح تھوڑی سی عرض کروں گا۔

یہ آیت ایک تو واقعہ پر مشتمل ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ایک بشارت پر جس کی آیت میں وضاحت کی گئی ہے اور ایک انعام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں انہیں تینوں چیزوں کی مختصر تشریح کرنی ہے۔

(١) پارہ: ٣٠، سورة الفجر، الآية: ٢٧، ٣٠. (٢) پارہ: ٣٠، سورة الفجر، الآية: ٢٨.

وقتِ نزع کا خطاب......اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت و نزع کے وقت خطاب کیا جائے گا۔ جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جیسے شرعی خطابات زندگی میں کہے گئے ہیں کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو۔ یا "عَلَیْکُمْ بِالصِّیَامِ" روزے رکھو یا "عَلَیْکُمْ بِالْحَجِّ" حج ادا کرو وغیرہ۔ یہ زندگی کے خطابات ہیں اور یہ زندگی کے خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔ اور اسی وقت کی یہ بشارت ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اور اسی وقت ایک انعام کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ① یہ خطاب کس وقت ہوگا؟ حدیث میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ جب مومن پر اس کا آخری وقت آتا ہے اور اس کا نزع شروع ہوتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں جو حالت نزع میں ہے اور اس کی موت کی ابتداء ہو رہی ہے۔

ملکُ الموت کے دو قسم کے اَعوان مددگار ہیں۔ ایک اصحاب یمین اور ایک اصحاب شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بیض الوجوہ ہیں۔ یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے۔ تاریک اور سیاہ اور ڈراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔

مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحاب یمین کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ بندہ جس کی موت قریب آچکی ہے۔ یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسے ایک قسم کا تحیر پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمین اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لئے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے، نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے۔ ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے اور جزع فزع میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھلاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔

یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر ایک عالم تحیر طاری ہے کہ سورج اور چاند ہیں، کیا چیز؟ آہستہ آہستہ قریب آ رہے ہیں، یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں، اب مشخص ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شکل و صورت سب مشخص ہو کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر و مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں۔ بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: "اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّ

① پارہ: ۳۰، سورۃالفجر، الآیۃ: ۲۷.

رَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَانٍ " ① اے پاک روح اور نفس! نکل اس بدن میں سے کہ تو نے اپنے عمل سے اسے پاک بنا دیا تھا۔ تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک۔ کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہوگا۔ بلکہ رحمت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرف چل یہ گویا ایک قسم کا وعظ ہوتا ہے. جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس میں دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے۔ بلکہ بشاشتیں، راحتیں اور انبساط ہے۔ ادھر چل اور اخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی، محنتیں اٹھائیں۔ اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ وترغیب ہے تاکہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے گا۔

ملائکہ موت مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں...... غرض پہلے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر طبعی طور پر انسان کو موت شاق ہے کہ اس عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لئے جیسے بدن کا چھوڑنا بھاری ہے۔ اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے۔ اس لئے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے۔ مگر وہ طبعی کراہت اور جھجک غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنالیا تھا وہ فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، میں ایک دن ان کی مجلس میں حاضر تھا۔ دو یا تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ عام مجلس نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے حضرت کی طبیعت میں کچھ جوش سا پیدا ہوا۔ تو ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں جیسے گویا کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتے ہوں، تو ادھر ادھر دیکھا تا کہ کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو۔ جب مطمئن ہو گئے تو ہم سے خطاب کر کے فرمایا کہ: ''الحمدللہ! میں موت وآخرت کے لئے اتنا تیار بیٹھا ہوں کہ اگر ابھی پیغام آجائے تو خوشی خوشی چلا جاؤں''۔ یہ بات فرمائی یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ کون سی ایسی نئی بات ہے جس شخص کے پاس بھی موت کا پیغام آئے گا، خواہی نخواہی اسے تو جانا ہی پڑے گا۔ یوں کہنا میں تیار بیٹھا ہوں۔ اس سے کیا حاصل؟ یہ تیار ہو یا نہ ہو جب موت آئے گی تو جانا ہی پڑے گا اس میں تیاری کی کیا بات ہے؟

گویا ہمیں ایک استعجاب سا ہوا کہ یہ کون سی ایسی راز کی بات تھی کہ حضرت نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی اجنبی اور بیگانہ نہ ہو۔ مگر بعد میں واقعی معلوم ہوا کہ ایک تو موت کا آنا تکوینی طور پر ہے۔ جب آجائے گی تو آدمی جائے گا۔ جیسے پیدا ہونے میں مجبور ہے۔ جب اللہ کسی کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہے نہ چاہے اسے آنا پڑتا ہے۔

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، ج: ۱۲ ص: ۳۱۴.

اسی طرح جب آخرت میں لے جانا چاہیں گے۔ وہ چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا۔ تو ایک فعل خداوندی ہے کہ تکوین الٰہی کے سامنے انسان مجبور ہے۔ ایک رضا ہے کہ اپنی خوشی سے جائے۔ یہ جب ہوگا جب اللہ سے انس و محبت غالب آ جائے۔ آخرت کی نعمتوں کی رغبت غالب آ جائے وہاں کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ معلوم ہو۔ قرآن کریم کی ایک آیت دنیا و مافیہا سے زیادہ اونچی اور برتر نظر آئے اور یہ سمجھے کہ اگر ایک آیت کا مفہوم میرے ذہن میں آ گیا اور کیفیت یہ طاری ہوگئی کہ پوری دنیا مجھ سے چھین لی جائے، یہ نعمت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ جب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ اور دین اسلام کی محبت کا غلبہ ہو جائے۔ اس وقت پھر انسان کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ کس طرح سے دنیا سے نکلوں جیسے بعض عارفین کا قول ہے کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم ‌ ‌ ‌ ‌ تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس آباد دیار میں پہنچیں گے اور اس شہر مطلوب میں پہنچیں گے۔ جہاں کے ہم سے وعدہ کئے گئے ہیں۔ اس لئے موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔

مومن کو عندالموت حق تعالیٰ براہِ راست بھی خطاب فرماتے ہیں...... حدیث میں موت کی تمنا کی ممانعت فرمائی گئی۔ فرمایا ”لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ“ ① کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اس لئے کہ موت آ کر زندگی اور عمل کو بھی قطع کر دے گی۔ جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ ہو اتنی بہتر ہے۔ اس لئے موت کی تمنا مت کرو اور ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ② ”اے یہود! اگر تمہیں اولیاء اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ“۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔ بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو، ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو۔ یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں لیکن ایک دوسری حدیث نے اس مضمون کو صاف کر دیا۔ فرمایا گیا: ”لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ بِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ“ ③ کوئی شخص کسی مصیبت سے اکتا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ بے صبری اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آ جاتی۔ اگر موت آ گئی اور وہاں بھی مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ انعام خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے صبری ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔ لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا

---

① الصحيح للبخاري، كتاب المرضىٰ، باب تمني المريض للموت، ج: ۱۷ ص: ۴۲۱ رقم: ۵۲۳۹.

② پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ٦.

③ الصحيح للبخاري، كتاب المرضىٰ، باب تمني المريض للموت، ج: ۱۷ ص: ۴۲۱ رقم: ۵۲۳۹.

ہو۔ یہ عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے ابلی پڑتی تھی۔ فرمایا: ''غَدًا نَلْقٰی مُحَمَّدًا وَّ اَصْحَابَهٗ'' کل ان شاء اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے۔ اس لئے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے۔ بہر حال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے: ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ'' ① ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کر دے جو میرے نبی اور رسول ہونے کا قائل ہے''۔

اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے: ''اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ'' ② موت مومن کے لئے تحفہ ہے۔ ''یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ'' ③ جو ایک عاشق کو اس کے محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے۔ اگر عاشق ہو تو محبوب کے پاس جانا مطلوب ہوتا ہے یا مکروہ؟ جو عاشقِ خداوندی ہے اس کو اللہ سے ملنے کی تمنا ہوگی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے۔ تو موت درمیانی واسطہ ہے۔ اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا۔ بہر حال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو واقعی موت کے شائق ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔

ملائکہ علیہم السلام اور ملکُ الموت کے اَعوان و انصار آ کر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح و ریحان ہے اور اس رب کی طرف جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہو جاتا ہے۔ پھر نزع شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کر کے نکالنی ہے۔ گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے۔ یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھلاتے ہیں۔ یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم الٹا کر دو۔ تو

---

① المعجم الکبیر للطبرانی ج: ۳ ص: ۴۷۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹. ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزوجل ج: ۸ ص: ۱۷. روایت ضعیف ہے، دیکھئے: کشف الخفاء رقم: ۲۶۶۷.

③ یہ حبان الاسود کا قول ہے دیکھئے۔ فیض القدیر ج: ۳ ص: ۳۰۷.

غرغرا کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا۔ اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ ﴿یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ ①

تو بالواسطہ ملائکہ پیغام دیتے ہیں کہ اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَ رَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَان ② اے پاک روح چلی آ۔ تیرا بدن بھی پاک تھا اور خود بھی تو پاک ہے۔ یہ تو ملائکہ علیہم السلام کے واسطے سے بشارت ہوتی ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست پیغام دیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ خود پکارتے ہیں یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝...... اے نفس مطمئنہ آ۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ③ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف کہ تو خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی۔ یہ اس وقت کا خطاب اور بشارت ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کو ہوگا۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مومن کے لئے ہوگا۔

مؤمن کے لئے اعلان رضا کی بشارت...... بشارت اس میں کیا ہے؟ ﴿رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ ④ یہ بشارت ہے۔ یعنی اے نفس مطمئنہ آ اور ہماری طرف لوٹ۔ اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔ اعلان رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟

بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے۔ سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس سے راضی ہونے پر ہے۔ کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہو؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا کہ میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مومن کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہی ہیں۔ مومن کی کیا خصوصیات ہے؟

احادیث کے اندر اس رضا کی تفسیر فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ ایمان کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں۔ جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضامندی نہ ہو، جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، جیسے خالق و مالک ہیں، رب بھی ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷ تا ۳۰. ② السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له ج: ۱۲ ص: ۳۱۴. ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸. ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔ پال پرورش کے اندر وہ افعال بھی کئے جاتے ہیں، جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے۔

ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی تو مارتی ہے۔ جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے۔ باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب میں نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا دل میں محبت موجود ہے مگر کہہ رہا ہے کہ گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اب اگر تو نے کوتاہی کی تو دیوار سے دے کر تجھے ماروں گا۔ کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار میں دے مارے۔ صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہتا ہے۔ غرض جیسے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔

اگر بچہ ماں کے دودھ پلانے پر خوش ہو جائے روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور ناخلف بیٹا ہے۔ جیسے اسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہئے تھا ویسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے لئے ہے۔ کیوں کہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں، محبت کا ہے۔ اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی۔ خلف صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے۔ کھانا کھلانے پر بھی راضی اور جب سزا دے کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا۔ ایک وقت کی روٹی بند کر دے۔ تو بھی راضی ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے لئے ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی وہ ماں کی گود میں جاتا ہے۔ جب طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس گود کے سوا میرے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے. میرا ٹھکانہ یہی ہے۔ بہر حال جب کھلانا پلانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے۔ تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے۔ بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو۔ اگر وہ تو نگر بنا دے، تو جتنا اس وقت راضی ہو، اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنا دے۔ تب کہا جائے گا کہ یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے جتنی رضامندی نعمت میں ہو، اگر وہ مصیبت بھیج دے تو اتنی ہی رضامندی مصیبت میں بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ بندہ کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔

بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے۔ مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، لیکن بندے نے اس کو غلط طریق سے استعمال کرنا شروع کیا۔ بجائے اس کے شکر گزاری سے رات دن اپنے پروردگار کے آگے جھکتا اس

نے تعیش میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنالیا۔ تو انصاف اور عقل سے سوچئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔؟ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے۔ اس لئے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں۔ حقیقۃً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کے بھرلو بلکہ ایک تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ شاید یہ اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آجائے اور جس برائی کی طرف جارہا ہے۔ پھر توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن کریم میں ایک موقع پر فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ ① ”ہم دنیا کی قوموں کو کبھی کبھی مصیبت سے آزماتے ہیں، کبھی کبھی خوف میں مبتلا کرتے ہیں، کبھی دشمنوں کو مسلط کر کے آزماتے ہیں۔ تاکہ یہ دوبارہ تضرع اور زاری کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں ہماری پناہ ڈھونڈیں۔“

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کے جھک جاتی ہیں۔ پھر ان پر مزید انعاموں کی بارش ہوتی ہے لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ آگے اس کا ذکر کیا ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ② ”ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہماری طرف سے مصیبت بھیجی جائے۔ تو یہ جھک کر تضرع اور زاری اختیار کریں“۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ عبرت قبول نہیں کرتے۔ نصیحت کا اثر ان پر نہیں ہوتا۔ اور شیطان نے یہ زندگی ان کے سامنے اتنی آراستہ کر دی ہے کہ اگلی اور دوسری زندگی کا وہم ہی نہیں گزرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو قبضے کی زندگی ہے۔ اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے۔ اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے، اس کی رنگینیوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ ③

جب نصیحتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں اور جتنی یاددہانی کی گئی سب اکارت جاتی ہے تو ﴿فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ④ ہم بھی آزمائش کے لئے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہر طرف سے دروازے کھل گئے۔ عزت، آبرو، رزق کے، اشیاء اور سامانوں کے، اولاد کے بھی۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا﴾ ⑤ جب وہ مطمئن ہو گئے کہ اب تو وسائل زندگی قابو میں ہیں۔ اب چھننے والے نہیں ہیں۔ کون ہے جو ہم سے لے لے؟ ﴿فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا﴾ ⑥ مگن اور مطمئن ہو گئے، انجام کو بھلا چکے۔ پھر ﴿اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ ⑦

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۲. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۳. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.
④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑤ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑥ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.
⑦ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

اچانک ہم پھر پکڑ کرتے ہیں اور عقاب کا پنجہ آ کر پڑتا ہے۔ ﴿فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ﴾ ① اب حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ مصیبت کہاں سے آ گئی؟ اس کا تو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ یہ آفت کہاں سے آ گئی؟ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ ② اس وقت ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیّت الٰہیّہ میں جیسے انعام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لئے ہے۔ جیسے دینا ربوبیّت ہے، چھیننا بھی ربوبیّت ہے۔ تو عبرت ونصیحت دلانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے اَفعال پر بھی راضی رہنا چاہئے..... حاصل یہ نکلا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہے۔ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو۔ اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور کبھی سزا یا انتقام لے تو اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لئے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت پر ہم راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضا مندی ہونی چاہئے۔

اس لئے راضی اس بندے کو کہیں گے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ اس کے اَفعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات سے بھی راضی ہو۔ اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی۔ نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا، نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے رضا شروع ہوتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے، لہٰذا ہم بھی اس کے۔ یہ اگر ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں۔ اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

ہمارا دہلی کا جو آخری بادشاہ ظفر تھا۔ کچھ بے چارہ صوفی مزاج تھا ہی کچھ مصائب اور آفات نے اسے بنا دیا تھا اور بہترین شاعر بھی تھا۔ اس نے ایک قطعہ اپنے ان مصائب کے وقت کہا تھا۔ بڑی عبرت کی اور بڑی عجیب بات کہی، پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی جو اپنی خرابیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

دوسروں کو آدمی اس لئے برا کہتا ہے کہ اپنی برائی اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی اور اگر اپنی برائی سامنے آئے تو دوسرے کو معذور سمجھے گا، بلکہ اچھا سمجھے گا۔ کسی عرب کے شاعر نے کہا کہ ؎

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۵.

لعمری إن فی ذنبی لشغلا　　　　بنفسی عن ذنوب بنی امیة

خدا کی قسم مجھے اپنے گناہوں کا اتنا شغل ہے کہ مجھے بنی امیہ کے گناہ یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ تو ظفر کہتا ہے کہ

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر　　　　رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر　　　　تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

اور آگے کہتا کہ

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا　　　　گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

اسے آدمی نہ سمجھنا، خواہ کتنا ہی دانا اور دانش مند ہو۔

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی　　　　جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی، نعمت میں بھی نہ بھولے مصیبت میں بھی نہ بھولے۔ دنیا میں نعمت بھی آزمائش کیلئے ہے۔ مصیبت بھی آزمائش کے لئے ہے۔ بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے اس لئے رضا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اللہ کے قائل ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں۔ اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں۔ مومن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افعال سے، اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کر بادشاہ بنا دے۔ تو کہے اے اللہ! میں راضی ہوں۔ تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا کر اس وقت جنگ کرو۔ وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کروں گا اور اگر کہے کہ جان دے دو تو بندہ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں۔ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے۔ آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہو سکتی آپ غنی عنِ العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لئے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت ان کو نفع نقصان سے کیا تعلق؟

حدیث میں ہے کہ اگر سارے بندے مل کر اتقی قلب ہو جائیں۔ سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کا قلب ہوتا ہے تو میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر سب کے قلوب شیطان کے قلوب بن جائیں تو میرے ملک میں ذرہ برابر نقصان نہیں کر سکتے۔ اللہ کو نہ نفع کی پرواہ نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج نہ نقصان کا۔ اس لئے جو کچھ بھی ہے بندے کی مصلحت کے لئے ہے اور بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیۃ کہا گیا ہے۔ اس حالت میں تو ہمارے پاس آ رہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا۔ ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟...... حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحبِ نسبت بزرگ گزرے ہیں، اربابِ نسبت میں سے ہیں۔ اس نسبت کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی، اللہ اس سے راضی۔ جانبین سے جب رضا ہوگی تو کہیں گے کہ آدمی صاحبِ نسبت بن گیا۔ جہاں ایک طرف سے رضامندی ہو وہ صاحبِ نسبت نہیں۔ اللہ بھی راضی ہو جب صاحبِ نسبت بنے گا۔ جیسے نکاح اس وقت ہوتا ہے کہ عورت بھی راضی ہو۔ مرد کہہ دے کہ صاحب میں تو راضی بس ہوگیا میرا نکاح اور عورت راضی نہیں۔ نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ جانبین کی رضا شرط ہے۔ جب یہ تعلق مضبوط ہوگا۔ اس سے نیک ثمرات پیدا ہوں گے۔ آگے اولاد ہوگی تو جانبین کی رضا سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔

اس طرح سے حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جانبین سے ہوگا تب کہا جائے گا یہ بندہ صاحبِ نسبت ہے کہ یہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی ہے۔ تو بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہوگیا۔ حتیٰ کہ اگر یہ بندہ کوئی غلطی بھی کر گزرے گا۔ تب بھی ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ منشاء صحیح ہے۔ رضامندی سے کر رہا ہے۔ بھول چوک ہوگئی، کام غلط ہوگیا، اس لئے وہ بھی ناراض نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔ ''یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عجیب وغریب ہے کہ اللہ میاں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آپ میں خواہش پیدا ہوئی اور پوری ہوئی۔ حق تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور نفس کے تقاضے کے ساتھ ہیں۔'' ①

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اللہ کی رضا میں اتنا فانی ہے کہ اس نفس سے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوگا رضا کے مطابق ہوگا لہٰذا وہ پسندیدہ ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا پاک ہوتا ہے کہ نفسانی خواہش بھی ابھرتی ہے۔ وہ بھی عین حق وصواب ہوتی ہے۔ اگر نبی بیوی کے پاس جانا چاہیں تو وہ خواہش نفسانی کہلاتی ہے۔ مگر نفس اتنا پاک ہے کہ اس میں بھی رضائے خداوندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے ان کو اس میں بھی وہی اجر ملتا ہے جو آپ کو نماز اور روزے میں ملتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا ہر فعل پسندیدہ ہے۔ کیونکہ نفس رضائے حق میں فانی بن چکا ہے۔ تو جو اتنے اللہ سے راضی ہیں کہ اس کی ہر تقدیر پر راضی، تو اللہ ان سے اتنا راضی ہے کہ ان کے ہر فعل پر راضی اور ان کا ہر فعل پسندیدہ۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے: ''اذا حکم الحاکم ثم اصاب فله اجران واذا حکم فاجتهد ثم اخطا فله اجر واحد'' ② حاکم خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ صواب کرے گا تو دو اجر ملیں گے۔ خطا کرے گا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ ترجی من تشاء منهن ج:۴ص:۲۷۴ رقم:۴۴۱۴.

② الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب اجر الحاکم ج:۲۲ص:۳۳۵ رقم: ٦٨٠٥.

تو ایک اجر ملے گا تو خطا کرنے پر بھی اجر ملنا حالانکہ غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس غلطی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ مسئلہ حق واضح ہو، اتفاق سے پہنچ نہیں سکا۔ تو اس نے جان بوجھ کر غلطی نہیں کی۔ بلکہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکی اس واسطے یہ غلطی بھی کرتا ہے تو اسے ایک اجر دیا جاتا ہے۔ تو یہ کس لئے؟ کر تو رہا ہے خطا اور اوپر سے مل رہا ہے ثواب۔ غلطی کر رہا ہے اور ثواب دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نفس رضاءِ حق میں فانی ہو چکا ہے۔ اس حالت میں غلطی بھی کر جائے گا۔ وہ بھی اس کا ثواب سمجھا جائے گا۔

این خطا از صد صواب اولیٰ تراست

یہ خطا بھی ہمارے صواب سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی فی اللہ اور فانی فی الحق ہے۔

مقام صاحب نسبت...... اس مقام کے بارے میں فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ" ① حق ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے جدھر کو حضرت عمر گھومتے ہیں۔ یعنی بظاہر تو یوں فرماتے ہیں کہ جدھر کو حق گھومتا ہے عمر ادھر گھوم جاتے ہیں۔ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہ کب کہا گیا؟ جب عمر رضی اللہ عنہ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے۔ کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی۔ جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے وحی سے مل گئی۔ جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہو گئی۔

حدیث میں ہے کہ ابتداء میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، بعض منافق بھی شامل ہوتے ہیں، مجھے پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں۔

یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہو گئی کہ: ﴿فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ② اور ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ ③ "گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو"۔ جو رائے دی۔ عین اس کے مطابق وحی آئی۔ ④

اس طرح کے متعدد واقعات گزرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے عرض کی اور وحی آ گئی۔ حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم، حج کرنے والے جانتے ہیں کہ طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جائے۔ تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آ جائے طواف کا دوگانہ

---

① رحم الله عمر يقول الحق وان كان مر حضرت عمرؓ کی شان میں یہ حدیث آئی ہے بجائے حدیث بالا کے، دیکھئے: جامع الاصول لابن الجزری ج: ۱، ص: ۴۲۲. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۵۳.

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۳. ④ کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸.

واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''لَوْ كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَهٗ......'' یا رسول اللہ! کیسا اچھا ہو کہ ہم مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا، اسی دن شام کو یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى﴾ (۱) ''مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو''۔ (۲)

اس طرح کی متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو رائے دی وحی بعینہٖ اس طرح سے نازل ہوئی۔ گویا ان کا ضمیر وحیِ خداوندی کا اِتباع کرتا تھا۔ ادھر ہی چلتا تھا جدھر وحیِ خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔ اس لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ'' (۳) اگر میرے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا اور کوئی نبی آتا، تو عمر ضرور نبی بنائے جاتے۔ مناسبت نبوت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں۔ وحی اس کے مطابق آتی ہے۔ مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفس رضائے خداوندی میں بالکل فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ اس حالت میں نفس میں بھی جو خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ، حق اور مرضی خداوندی ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے۔ حتی کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو۔ اس لئے کہ اس کا منشاء حق کا طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی نعمت دے جب راضی، مصیبت دے جب راضی۔

اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دنیا میں اِنعام...... حضرت عمران ابن الحصین رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک پھوڑا نکلا وہ ناسور بن گیا۔ کوئی بتیس برس تک اس کا زخم رہا۔ ہر وقت اس میں سے پیپ وغیرہ بہتی اور بتیس برس تک چت لیٹے رہے، کسی ایک جانب کو کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے لیٹے کھانا کھاتے اسی طرح وضو کرنا، اسی طرح نماز پڑھنا۔ اندازہ کیجئے جو شخص بتیس برس تک ایک کروٹ پر چارپائی پر پڑا رہے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن حضرت عمران ابن الحصین کے چہرے پر وہ بشاشت تھی کہ کسی تندرست و توانا کے چہرے پر بھی وہ رونق نہ ہو۔ جو ان کے چہرے پر تھی۔

لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف کا تو یہ عالم برسہا برس گزر گئے آپ اٹھ نہیں سکتے، کروٹ نہیں لے

(۱) پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵۔ (۲) کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸۔

(۳) السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب عمر، ج: ۱۲ ص: ۱۴۶ رقم: ۳۶۱۹۔

سکتے چت لیٹے ہوئے ہیں۔ پھر اتنے ہشاش بشاش؟ ان دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔ فرمایا'' تکلیف آئی۔ میں نے رضا کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں راضی ہوں جس حالت میں تو رکھے میں راضی ہوں اس لئے کہ تو میری مصلحت کو جانتا ہے۔ میں اپنی مصلحت کو خود نہیں جانتا میں نے رضا کا اظہار کیا۔ وہ رضا میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ میرے صبر و رضا سے اب یہ کیفیت ہے کہ میں چت لیٹے لیٹے ملائکہ علیہم السلام کی زیارت کرتا ہوں۔ عالم غیب مجھ پر منکشف ہے، عالم مِلکوت مجھ پر روشن ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ یہ تکلیف جائے۔ اتنا میں راضی ہوں۔ تو جو اللہ کے افعال پر اور اس کی تقدیر پر ہر طرح راضی ہو جائے تو اللہ بھی اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی کرے اللہ اس سے راضی اور یہ برا کرے گا ہی نہیں۔ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں کہ مسلمان تنگی کی حالت میں تھے اور شام کی طرف رومیوں سے مقابلہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ فرمایا۔ لیکن اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جہاد ہونے والا ہے۔ اس کی یہ فضیلت ہے۔ اس کے لئے چندہ جمع کرو۔ مسلمان غربت کی حالت میں تھے۔ چندہ لا نہیں سکتے تھے۔ امراء میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے سو اونٹ مہیا کر کے ان کی زینیں، چادریں، ہر اونٹ کے مناسب ہتھیار، اس پر توشہ چڑھا ہوا کہ مجاہد بیٹھ کر کیا کھائے گا۔ اس طرح سو اونٹ مکمل لا کر پیش کئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل گیا اور چمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج آپ کے چہرے کے اندر دوڑ رہا ہے اور یہ لفظ فرمائے: ''مَا عَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْیَوْمِ'' [1] ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے۔ اس کے اوپر کوئی وبال نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی برائی اور نا مرضی نہیں ہے۔ جو چاہے کرے''۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ کبیرہ گناہ کر لیں۔ جب بھی اللہ ان سے راضی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نفس اتنا مطمئن بن گیا ہے کہ ان کی نفسانی خواہش بھی پاک ہو گئی۔ جو کر لیں گے وہ پسندیدۂ الٰہی ہو گا۔ یہ گویا رضا کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں ...... تو انسان کے نفس میں اللہ سے اتنی محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو۔ مجبوری کے ساتھ نہیں صبر بشاشت کے ساتھ ہو۔ مجبوری کا صبر سب کو آ جاتا ہے۔ کیسی کے ہاں خدانخواستہ کوئی میت ہو جائے۔ تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آ جاتا ہے مگر صبر وہ ہے جو بروقت ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ جیسے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور بین کر کے رو رہی تھی اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بڑی بی! صبر کر! بڑی بی کو غم میں غصہ آ گیا۔ کہا تمہارے کوئی مر جاتا تب میں جانتی تم صبر کرتے میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ گزر گیا میں کیسے صبر کروں؟ فرمایا اچھا تیری مرضی مت صبر کر۔

---

[1] السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان ج: ۱۲ ص: ۱۶۱ رقم: ۳۶۳۳.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوگئے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو پریشان ہوگئی اور دوڑی ہوئی پہنچی کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ تھے اور آپ نے صبر کے لئے فرمایا۔ میں اب صبر کرتی ہوں آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى'' ① صبر کا وہ وقت تھا جب صدمہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن کے بعد تو سبھی کو صبر آ جاتا ہے۔ یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے اور اختیار سے ہو اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور اس کے اندر خیر ہی خیر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں در حقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاءِ الٰہی پر اُخروی و اَبدی انعام..... غرض مومن کو یہ ایک بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o﴾ ② اے نفسِ ''مطمئنہ''! تجھے اللہ کے ہر فعل اور ہر تقدیر پر اطمینان حاصل تھا ''ضرّآء ہو یا سرّآء'' ہو، نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو۔ تو ہر حالت پر اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانیت و بشاشت حاصل ہوگئی۔ اب تو اس حالت میں ﴿اِرْجِعِیْ﴾ ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی راضی، ہم بھی تجھ سے راضی تو نے اپنی عمر رضا میں گزار دی۔

ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے کہ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔ جب تو اس مقام پر رہے تو ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ ③ اب تیرا نام میرے بندگانِ خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے مطلقاً بندے تو سبھی ہیں۔ کفار و فجار بھی اسی کے بندے ہیں۔ ابلیس بھی اس کا بندہ ہے۔ مگر عبادِ خاص نہیں ہیں۔ جن کو مقرب کہا جائے، جن پر عبد کا اطلاق آئے۔ عبد وہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیت مطلقہ۔ عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں۔ یعنی اللہ کے سامنے ایسے غلامی ہو کہ جو بھی وہ کہیں بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو۔ ناخوشی کا کوئی سوال نہ پیدا ہوا سے عبدِ مطلق کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے تفویض کہا ہے: ﴿اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ④ ''ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں''۔

تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے..... جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔ واقع یہ ہے کہ بندے کے لئے راحت بشاشت جتنی ہے تفویض کے اندر ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے۔ ویسا ہوتا نہیں، تو بیٹھ کے گھٹتے ہیں یہ مصیبت ہے۔ اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کے جو اللہ میاں کردے کہ بس میں اس پر راضی ہوں۔ پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش ہی نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں

① الصحيح للبخاری، كتاب الجنائز، باب زيارة القبور، ج: ۵ ص: ۹ ۲ رقم: ۱۲۰۳.

② پارہ: ۳۰، سورة الفجر، الآية: ۲۷. ③ پارہ: ۳۰، سورة الفجر، الآية: ۲۹.

④ پارہ: ۲۴، سورة الغافر، الآية: ۴۴.

پھر مصیبت کیا ہوئی۔ مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کر دی۔ سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ جو ہوگا خیر ہوگا۔ قلب کے اندر گھٹن ہی پیدا نہیں ہوگی۔ نعمت آ جائے جب بھی راضی، مصیبتیں آ جائے جب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا، آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہانوں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں، فرمایا ہاں الحمدللہ۔ میں اسی درجے کا ہوں۔

لوگوں نے کہا، آخر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے. جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو کوئی چیز میرے خلاف طبع دنیا میں ہوتی ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں، الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے نہ ہونا چاہئے۔

جیسے بعض لوگ اخبارات میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت سے ہمیں بڑا صدمہ پہنچا۔ اس بندہ خدا سے کوئی پوچھے کہ خدا کی طرف سے کوئی چیز بے وقت بھی ہوتی ہے۔ بے محل اور بے موقع بھی ہو سکتی ہے؟ یہ بڑی گستاخی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ آپ سے مشورہ لینا چاہیے تھا کہ کون سا وقت مناسب ہے۔ جس میں اس بندے کو موت دی جائے اور پھر موت دی جاتی۔ بڑی جرات کی بات ہے۔ موت جب آئے گی اپنے وقت پر آئے گی، مرضی الٰہی سے آئے گی ہم اس معاملہ میں گھسنے والے کون ہیں؟ کسی کی ولادت ہوگی اپنے وقت پر ہوگی۔ اس پر کسی کو صدمہ کرنے کا حق کیا ہے؟ ہر حالت میں بندہ کو رضا اپنانی چاہئے۔

تو اس بزرگ نے کہا کہ دونوں جہانوں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں. اس لئے کہ وہ اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ لہٰذا کوئی چیز دنیا میں خلاف طبع ہوتی ہی نہیں۔ یہ درحقیقت ان کی عبدیت کا مقام ہے کہ جو پیش آئے گا وہ من اللہ ہوگا اور جو من اللہ ہوگا وہ خیر ہوگا، وہی مصلحت ہوگا۔ اس پر ہم راضی ہیں ہمیں ناراض ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے نفسِ ''مطمئنہ!'' جب تو نے اپنی زندگی میں نیکی سے، فلاح و رُشد سے اپنے نفس میں طمانیت پیدا کر لی اور اللہ کے کسی فعل پر تجھے کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ جو ادھر سے فعل ہوا، تو نے کہا ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں تو جب تو نے اطمینان کا برتاؤ کیا۔ ہم بھی تجھ پر مطمئن ہو گئے جب تو ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔

دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل جاری ہے...... اس لئے کہ دنیا میں اللہ نے قانون مکافات جاری کیا ہوا

ہے۔یعنی اَدل بدل کا قانون کہ جیسا تم کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہوگا۔ ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' ① ''جیسی راہ تم اختیار کرو گے، ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ ② ''اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے ہم عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے'': ﴿اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ ③ ''تم بدی کی طرف لوٹو گے ہم عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے''۔ جیسا تم کرو گے ویسا ہم کریں گے۔ ''مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ'' ''جو ہم سے ملنا پسند کرتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا پسند کریں گے''۔ ''مَنْ کَرِهَ لِقَآءَ اللّٰهِ کَرِهَ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ'' ④ ''جو ہم سے ملنا مکروہ جانتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں۔ ہم بھی اسے نہیں ملیں گے''۔ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ⑤ ''تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا'' ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ ⑥ ''تم ہماری یاد کرو گے، ہم تمہاری یاد کریں گے''۔ غرض قانون مکافات ہے۔ جو برتاؤ بندے کا ہوگا، وہ اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹیں...... اس لئے اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ کے ساتھ میرا تعلق کیسا ہے۔ اس پر قیاس کر لے ویسا ہی ان کا تعلق ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں اللہ کی طرف سے بعد ہے تو ادھر سے بھی بعد ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں۔ ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی یہ کسوٹی ہے۔ ہر شخص پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہے۔ وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنے سے قطع نظر کر کے اللہ کے معاملات کو دیکھنا چاہے۔ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔ شکایت پیدا ہو جائے گی کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہوئی کہ یہ کفار سارے رہ گئے تھے مصیبت کے لئے میرا ہی گھر رہ گیا تھا مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی۔ حالانکہ میں مومن ہوں یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں، تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔

اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بعد ہو۔ غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو اللہ سے دیکھ لے، حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔

فرمایا اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔ اگر پڑوسی کو ستاتے ہو، سمجھ لو کہ اللہ میاں کو بھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب وسمیت ام الکتاب، ج: ۱۲ ص: ۳۸۵.

② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج: ۲۰ ص: ۶۴ ارقم: ۶۰۲۶.

⑤ پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۷. ⑥ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲.

تم سے بعد ہے۔اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہوگا۔اگر تم پڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف وکرم کا معاملہ کرتے ہو۔یقیناً امید رکھو کہ ادھر سے لطف وکرم کا برتاؤ ہوگا۔تو کسوٹی بیان کردی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے۔اس لئے اگر آپ خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک آپ کے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آجائے،آپ مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں۔سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی آپ کے ہر فعل سے راضی ہیں اور آپ کو اچھی راہ دے رہے ہیں۔تم اسی راہ پر چلو گے جو ان کی پسندیدہ ہوگی اور اگر آپ ان کی راہ سے ناراض ہیں کہ وہ جو معاملہ کرتے ہیں آپ اس سے اکتاتے ہیں۔وہ آپ کے معاملے سے ناراض ہیں آپ کی عبادت بھی ناپسندیدہ ہوگی۔آپ لاکھ سجدے کریں جب دل میں ناراضگی ہے تو سجدے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ملازم اپنے آقا کی خدمت بہت کرتا ہے مگر آقا کے ساتھ اچھا خیال نہیں رکھتا اس کی خدمت آقا کے لئے تکلیف دہ بن جائے گی اور ایک ملازم ہے کہ دل سے محبت کرتا ہے مگر بے وقوف ہے۔رات دن غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔آقا کہتا ہے اسے کچھ نہ کہو یہ میرا اپنا ہے۔غلطی ہوئی تو کیا ہوا بندہ بشر ہے۔غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔اس کی غلطی سے بھی راضی ہیں۔تو اصل چیز قلب کا رخ اور قلب کا معاملہ ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندے! قیامت کے دن اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے زمین وآسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی ہی بڑی رحمت ومغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔بشرطیکہ میری عظمت تیرے قلب کے اندر ہو۔① ہر بندہ دیکھ لے کہ اللہ کی کتنی عظمت اور بڑائی میرے دل میں ہے۔آیا دولت کے مقابلے میں،میں دولت کی عظمت کو جانتا ہوں یا اللہ کی عظمت کو؟ اسے حاجت روا سمجھتا ہوں یا اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہوں؟ جب کوئی معاملہ آتا ہے تو پہلے میری نگاہ اسباب کی طرف جاتی ہے یا مسبب لاسباب کی طرف۔اسباب کو محض حکم برداری کے اِتباع کے لئے اختیار کرتا ہوں۔

اس لئے کہ نظر ہماری اسباب پر ہے۔مگر چونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہ ہے کہ کرنے والا وہی ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ کرنے دھرنے والے تو اللہ میاں ہیں۔اسباب اختیار کئے جائیں گے۔مگر اطمینان اسباب پر ہے مسبّبُ الاسباب پر نہیں ہے۔اور ایک یہ کہ مسبّبُ الاسباب پر اطمینان ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ اسباب نہ بھی اختیار کریں تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔مگر حکمِ الٰہی ہے اس لئے ہم اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔تابعداری کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں۔اسی ایک کسوٹی سے پتہ چل جائے گا کہ ہم اسباب سے کتنے اور مسبّبُ الاسباب سے کتنے راضی ہیں۔اسی سے اللہ سے معاملہ سمجھ لیجئے کہ ویسا ہی برتاؤ ادھر سے ہوگا۔غرض ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' ''جیسی آپ راہ اختیار کریں گے ویسی راہ ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، ج: ۱۲ ص: ۴۵۵ رقم: ۴۶۷۴.

مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں...... اس کو فرمایا گیا: ﴿اِرْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ① اے نفس لوٹ کر آ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا تھا۔ تو دنیا کی چیز نہیں تو آخرت کی چیز ہے۔ اب تو نے اپنی رضا واطمینان کا امتحان دے دیا اس لئے مقصد پورا ہوگیا۔ اس لئے اب واپس لوٹ کر ہماری طرف آ جا اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔

اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے اسے ''اِرْجِعِیْ'' کہ ''لوٹ کے آ'' کا خطاب نہیں کیا جائے گا تو دنیا کا تھا، دنیا ہی میں رہ۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اسے لے جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرین ولعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ اس آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے۔ گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ اس کو جو پکڑ لے گا وہ اس قید خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ اور وہ رسی کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ ② ''اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو''۔

حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلْقُراٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ'' ③ ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے۔ جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اپنے تک پہنچا دیں گے''۔ گویا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا۔ وہ جہنم میں موجود ہیں۔ جہنم میں ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ اب بھی جہنم میں ہیں۔ نکلنے والے نکل جائیں گے جو رہ گئے وہ رہ جائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لئے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے۔ کافر کو اس لئے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو اَبدالآباد تک وہیں رہے گا۔ اسی کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔ اس لئے کافر کو دنیا سے نکلنا نہیں ہے۔ مومن کو نکل بھاگنا ہے اس لئے ''اِرْجِعِیْ'' رجوع کرو۔ تو پہلے بھیجا گیا ہے۔ بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے برائے چند دن بھیجا تھا اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع...... اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا رجوع کی علت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے۔ اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

③ کنز العمال ج: ۱ ص: ۱۸۳. رقم: ۹۲۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۵ ص: ۲۳ رقم: ۲۰۲۴.

تو ﴿ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴾ ① اس لئے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے اس بعد کے عالم میں نہیں ہے۔ جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہ یہی جہنم ہے۔ مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایمان قبول کر چکا کافر نکلنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے ......اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴾ ② میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگان خاص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

جیسے حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا مقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ دو فرشتے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "مَنْ رَّبُّکِ" تیرا رب کون ہے؟ ان کے پاس بھی منکر نکیر آئے۔ انہوں نے کہا "مَـــنْ رَّبُّکِ" تیرا پروردگار کون ہے؟ تو رابعہ بصریہ تو ولیہ اور عارف باللہ تھیں۔ انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں اس لئے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ تو ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھنا۔ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سوال کرنے لگا۔ تو بات وہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں آپ کا بندہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا ہوں نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ بھی فرما دیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے ہم سے راضی ہوتا، ہماری طرف آتا تو ہم سے بعد پر راضی ہے تو اسی بعد کے عالم میں رہ۔ اور مومن کہتا ہے کہ امنا باللہ ہم ایمان لے آئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں کہ جب تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے چلے آؤ۔ اس لئے "اِرْجِعِیْ" کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو ﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴾ ③ میرے عباد میں دخل ہو جا صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس قابل

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

ہے کہ تو اس مقام کریم وقرب میں پہنچ جائے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ویسے تو یہ آیت بہت سے علوم پر حاوی ہے۔ اس میں صبح سے شام ہو جائے، پورے نہ ہوں۔ لیکن میں نے موٹے موٹے تین مقصد اختیار کئے ایک واقعہ کے متعلق جو نزع کا پیش آتا ہے۔ ایک بشارت سے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے اس بندہ محتضر کو دی جائے گی کہ ﴿اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً﴾ ① اور تیسرا انعام ہے ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تو میرے بندگان خاص میں داخل ہو جا اور اس مقام قرب میں تجھے داخل کرنے کی نوبت آ گئی جو شہر مطلوب ہے۔ جو ہمارے باپ کو دیا گیا تھا۔ پھر ایک لغزش کی وجہ سے وہ وہاں سے الگ کئے گئے ہم اور تم یہاں پیدا ہوئے وہاں پیدا ہوتے وہیں کے وارث ہو جاتے اور یہاں آ گئے۔ مگر آدم علیہ السلام سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے اندر اس شہر مطلوب کی طلب موجود ہے۔ جہاں سے آپ کو نکالا گیا ہے اب وہاں تک پہنچنے کے لئے اس دنیا کی گھاٹیوں میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لئے میں اپنا قانون بھیجوں گا۔ جو اس قانون پر چل پڑے گا اسے واپس بلا لیں گے اور جو نہیں چلے گا وہ وہیں رہ جائے گا۔

اس واسطے میں نے یہ آیت پڑھی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا عرض کروں رات میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا عرض کروں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کرنا چاہئے میں نے کہا کہ بھئی! میں نے تو مکہ مکرمہ سے لکھا تھا کہ آ کر اس مسجد میں نماز پڑھوں گا۔ تقریر کا نہیں کہا تھا۔ میرا مقصد تو صرف ملنا اور ملاقات کرنا ہے۔ وعظ وتقریر کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اعلان کر دیا۔ جب اعلان کر دیا میں نے کہا اب کوئی بات تو بتائی جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر ہمارے ایک دوست نے کہا اللہ کی رضا کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے کہ اللہ کی رضا اختیار کرنی چاہئے اس سے کچھ ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ یہ گویا انہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عمل عطا فرمائے اور ہم کو راضی ومرضی بنائے اور اپنے عباد خاص میں داخل فرمائے اور اپنے مقام قرب میں ہمیں پہنچائے اور ہم سب کو اس مقام کریم میں جمع فرمائے۔ آمین

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ."

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

تعارف اہل حق

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ، اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌ بَصِيْرٌo ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (1)

کچھ اپنے بارے میں...... بزرگانِ محترم! اس مجمع خیر و برکت میں جس میں بہت سے حضرات کی نورانی شکلیں اسٹیج سے نیچے بھی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں کہ انکے چہرے مہرے سے دین ٹپک رہا ہے۔ دین کی علامتیں نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے باہر تک وہ دین کے دِلدادہ ہیں۔ انہیں حضرات میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں، جو ہم سے کچھ حسنِ ظن نہ رکھتے ہوں، کچھ خیالات کا تفاوت رکھتے ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔ تاکہ اشتباہ باقی نہ رہے اور جسے ہماری بات سنّی اور ماننی ہو، بصیرت کے ساتھ مانے اور نہ مانے تو نہ مانے۔ مگر ہم اِشتباہ میں نہ ڈالیں۔

اس سپاسنامے میں یا نظم میں، یا حضرت العلّامہ دام ظلہ، کی زبان پر جو چیزیں بطور تعارف کہی گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں میرا تعارف نہیں تھا۔ انہوں نے یہ اپنا تعارف کرایا ہے اس ناکارہ کے لئے اپنی عالی ظرفی، اپنی عالی حوصلگی، اپنی اُولوالعزمی اور اپنی ذرہ نوازی و خورد نوازی کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ میرا تعارف نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔

معیارِ تعارف اہل حق...... لیکن تعارف سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تعارف کا کوئی معیار تو ذکر کیا جائے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جائے کہ یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر پرکھ

(1) پارہ: ۲۲،سورۃ الفاطر،الآیۃ: ۳۱-۳۲.

کر ہم یہ کہیں کہ فلاں کی بات سچی ہے یا غلط؟ تو پہلی چیز تعارف اور تعارف سے بھی پہلی چیز تعارف اور کسوٹی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں حق و باطل کا معیار ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ کس کا قول حق ہے کس کا قول غلط ہے۔ کون سچی بات کہہ رہا ہے اور کون بات ہی بنا رہا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کے سامنے اس آیت کا ترجمہ کر دوں۔ اس کے بعد پھر اس کی تشریح عرض کر دوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ①
''اے پیغمبر! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ کی طرف وحی کی، علم قطعی بھیجا اور اپنی کتاب آپ کے اوپر اتاری''۔ تو اللہ نے جو کتاب کی صورت میں آپ کی طرف جو حی کی ہے۔ سچی وہی ہے۔ وہ کسی کے حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ لوگ سامنے ہوں یا گردوپیش میں ہوں ان کو اگر کچھ پرکھنا ہے تو رائے سے نہ پرکھا جائے، محض عقل سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ اس کسوٹی پر پرکھا جائے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ﴿هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ② یہ ہماری کتاب ہے، جو حق اور سچی ہے اور تمہارے سامنے اور تمہارے گردوپیش کے حالات کی تصدیق اور تکذیب کا معیار ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ کتاب بھی آ گئی اور پیغمبر بھی آ گئے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں وہ تعلیم دے کر پردہ فرما گئے۔ تو کیا آگے دین ختم ہو گیا؟ اس لئے فرمایا ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے لوگوں کو وارث بنایا کہ جن کو وراثت میں یہ کتاب اللہ ملی اور وراثت میں یہ حق ملا اور جنہوں نے اس حق کو قبول کیا اور وہ بھی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کا وعدہ دیا کہ وہ آتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ. ④ ہمیشہ سلف کے بعد خلف کھڑے ہوں گے، جو اس علم کو لیتے رہیں گے، جو سلف صالحین لے کر آئے تھے اور اس علم کی روشنی سے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ دروغ بافوں کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کریں گے۔ جاہلانہ اور رکیک تاویلات کا پردہ چاک کریں گے۔ تو قیامت تک یہ دین اصل حالت میں باقی رہے گا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ: ''اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا'' ⑤ ہر قرن کے بعد جب دوسرا قرن شروع ہوگا۔ تو اللہ ایسے لوگ بھیجے گا، جو دین کی

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱. ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ④ مشکل الآثار للطحاوی، باب بیان مشکل ماروی یحمل ھذا العلم..... ج: ۸، ص: ۳۷۳، رقم: ۳۲۶۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے مشکاۃ المصابیح بالتعلیق للالبانی کتاب العلم ج: ۱ ص: ۵۳. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم باب مایذکر فی القرن المائۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۶۲ رقم: ۳۷۴۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۹۱ رقم: ۴۲۹۱.

تجدید کریں گے، اس کو نکھار دیں گے اور جتنی رکیک تاویلیں تھیں، ان کو کھول کر الگ کر دیں گے اور دین پھر اصل حالت میں آ جائے گا۔ ہر قرن پر ایسے لوگ آئیں گے جن کا نام مجدد ہے۔

قرن کی قید اس لئے لگائی کہ قرن عموماً سو سال کی مدّت کو کہتے ہیں اور سو سال میں ایک نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اگلی نسل شروع ہوتی ہے نئی نسل آتی ہے تو کچھ نئے نظریات بھی آتے ہیں، نئے افکار پیدا ہوتے ہیں، نئے حوادث اور واقعات سے دنیا دوچار ہوتی ہے۔ اس وقت ممکن تھا کہ نئے نظریات اور نئے افکار کی وجہ سے دین دب جائے یا ختم ہو جائے یا مشتبہ ہو جائے اس لئے اللہ نے ہر قرن پر ایک مجدّد رکھا۔ تا کہ ان نئے نظریات کے اندر دین کو پھر نکھار دے اور انہی نظریات کے مطابق ایسے دلائل کو پیش کرے، کہ دین پھر تازہ تازہ ہو جائے اور نئے افکار کا کوئی اثر دین کے اوپر نہ پڑے تو ہر قرن پر وعدہ دیا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: ''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ '' ① ''میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت باقی رہے گی، جو وہی چیز کہے گی جو میں نے کہی، وہی عمل کر کے دکھلائے گی جس نوع کا عمل میں نے کیا ہے۔ انہیں رسوا کرنے والے رسوا نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا اَمر آ جائے اور دنیا ختم ہو جائے''۔ دین اسی رنگ میں باقی رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا تو پوری امّت کے لئے وعدہ دیا کہ ایک جماعت حقّہ قائم رہے گی۔ ہر قرن پر وعدہ دیا کہ مجدّد آئیں گے پھر قرن کے اندر وعدہ دیا کہ سلف کے بعد خلف آئیں گے، جو علم لیتے رہیں۔ گے اور سلسلہ علم کا منقطع نہیں ہوگا تو فرمایا کہ: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ② نبی کے بعد اور کتاب کامل اتر آنے کے بعد ہم ایسی قوم اور ایسے افراد کو وارث بنائیں گے، جن کو ہم منتخب کریں گے اور پسند کریں گے۔ لوگوں کی رائے پر نہیں ہوگا کہ وہ کہیں یہ مجدد ہیں، یہ معلم ہیں۔ ہم قلوب میں براہ راست ڈالیں گے کہ حق کہنے والے یہ ہیں۔

دین نقلی ہے عقلی اور اختراعی نہیں ہے...... بہر حال اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ دین نقلی اور روایتی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ یعنی دین اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ کسی پارٹی یا مجلس کا ریزولیشن نہیں ہے۔ جنہوں نے بیٹھ کر دین بنا لیا ہو، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔ عقلی اختراعات دین کی بنیاد نہیں ہیں۔ نقل و روایت دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کی جب بھی کوئی بات سامنے آئے گی تو پہلا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ تم عقل سے اس کو کیا سمجھے؟ تم نے اپنے فکر سے کیا جانا؟ اللہ کی وحی کے مقابلے میں ہمارا فکر کیا چیز ہے؟ اور ہماری عقل نارسا کیا ہے کہ اس معیار پر دین کو پرکھا جائے، دین معیار ہے جس پر ہماری عقلوں کو پرکھا جائے گا کہ یہ عقل ناقص

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ ج: ۱، ص: ۱۲، رقم: ۱۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۱ ص: ۷۸ رقم: ۷۸. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.

ہے یا کامل، اس میں کھوٹ ہے یا اصلیت تو دین معیار بنے گا، عقل معیار نہیں بنے گی۔ عقل کو دین اور وحی خداوندی کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دین روایتی اور نقلی ہے۔ عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔

نقلی کے معنی یہاں وہ نہیں جو ہماری اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اردو میں نقلی اصلی کے مقابلے میں آتا ہے کہ یہ چیز اصل ہے۔ اور یہ چیز نقل ہے۔ اس میں اصلیت ہے اور اس میں ملمع سازی ہے نقلی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ نقلی کے معنی روایت سے منتقل ہونے والی چیز کے ہیں۔ تو دین روایت کے ذریعے سے منتقل ہونے والی چیز ہے۔ عقل کی تجویز سے دین نہیں بنا۔

دین ایک غیبی حقیقت ہے عقل اس کی موجد نہیں ہوسکتی...... وجہ اس کی یہ ہے کہ دین ''اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰہِ...... '' کا نام ہے، وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچائے، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کی طرف جائے گا تو راستہ اتنا لمبا اتنا کٹھن ہے کہ جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یہ اس راستے کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنا راستہ خود بتلایا کہ یہ میرا طریق ہے: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ① یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور بعد میں جو عقلی اختراعات سے نئے نئے راستے نکلیں ان کی پیروی مت کرو۔ ورنہ تشتت، پراگندگی اور پارٹی بازی میں پڑ جاؤ گے۔ اصل دین کی تلاش کرو۔ تو ''اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰہِ'' جو اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہو۔ اللہ ہی بتائے گا جب اس کی مرضیات معلوم ہوں گی تو خدا کی مرضی عقل سے نہیں سمجھ سکتے اور محض گریبان میں منہ ڈال کر ہم پتہ نہیں چلا سکتے کہ اللہ کس چیز سے راضی ہے اور کس چیز سے نہیں۔

دو حقیقی بھائی ہوں جنہوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہوں۔ وہ سینہ سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے قلب کی بات دوسرے کے قلب میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہی خود نہ بتائے کہ میرے ضمیر میں یہ بات چھپی ہوئی ہے تو دو انسان ایک نوع، ایک جنس اور ایک اصل کی دو شاخیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے۔ لیکن جب تک ایک ظاہر نہ کرے، دوسرا اس کے باطن کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو اللہ رب العزت کے باطن سے جو بات چلی ہے۔ اسے محض دور بیٹھ کر ہم کیسے سمجھ لیں گے؟ جب تک وہ خود نہ ظاہر کرے تو اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ اسی کے کلام سے چل سکتا ہے ہماری عقل سے پتہ نہیں چل سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ اس آگ پانی کے گھروندے میں کام کرے گی محسوسات تک پہنچے گی اور محسوسات تک پہنچتی ہوئی بھی ٹھوکریں کھائے گی جو عقل محسوسات کے دائرے میں بھی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ غیب کی چیزیں کس طرح سے جان لے گی۔ وہ اس کا دائرہ ہی نہیں۔ وہ اپنے دائرہ کی بات کرے گی۔

آپ کی آنکھ ہے، وہ شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کان ہیں، وہ آواز سن سکتے ہیں۔ زبان ہے جو ذائقے

---

① پارہ:۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳۔

چکھ سکتی ہے اور یہ سب چیزیں دو تین انچ کے اندر جمع ہیں۔ لیکن آنکھ کے دائرے میں کان قدم نہیں رکھ سکتا کہ کان یوں چاہے، میں صورتیں دیکھ لوں، نہیں ہو سکتا آنکھ چاہے کہ میں آوازیں سن لوں، تو کان کی طرف آنکھ کو رجوع کرنا پڑے گا۔ آنکھ صورتیں دیکھنے کے لئے ہے، آوازیں سننے کے لئے نہیں اگر آپ ذائقہ چکھیں گے تو آنکھ لاکھ کوشش کرے کہ میں کھٹا میٹھا سمجھ لوں، نہیں سمجھ سکے گی۔ تو اس چہرے میں دو انچ کے فاصلے پر ساری قوتیں جمع ہیں۔ مگر ایک قوت دوسری قوت کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اسی دائرے میں جانا پڑے گا۔ اس سے اوپر عقل کا درجہ ہے تو اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں۔ تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے، وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ علم کی موجد و ایجاد کنندہ نہیں ہے۔ وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے۔ کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے۔ لیکن خود اصول و جزئیات بنالے یا واقعہ بنادے تو عقل موجد نہیں ہے جو واقعات کی ایجاد کرے۔ پیدا شدہ واقعات میں عقل غور کر سکتی ہے، مگر واقعات کو پیدا نہیں کر سکتی۔ دین اللہ کی خبر اور حقیقت غیبی ہے۔ اسے نہ عقل بنا سکتی ہے نہ اس میں اختراع کر سکتی ہے۔ اس کا تو اسے ساتھ دینا پڑے گا غلامی کرنی پڑے گی۔

عقل کو مغیبات میں وحی کا اتباع ضروری ہے...... عقل کو اسلام نے بیکار نہیں ٹھہرایا، یہ بہت کار آمد ہے۔ اللہ نے عقل کے فضائل بیان کئے اور فرمایا، "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ" ① سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا، "اَقْبِلْ" سامنے آ، وہ سامنے آگئی فرمایا، "اَدْبِرْ" پشت پھیر اس نے پشت پھیری۔ فرمایا: تو ہی ہے جس کے ذریعے سے میں بہت لوگوں کو عزت دوں گا اور بہت کو ذلیل کروں گا۔ تو عقل کوئی بے کار چیز نہیں لیکن اپنے ہی دائرے میں کام دے گی۔ آنکھ بے کار چیز نہیں۔ مگر صورت ہی میں کام دے گی، آوازیں نہیں سنے گی، کان بے کار نہیں ہیں۔ مگر خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ اپنے دائرے میں کام کریں گے۔ عقل سے بالاتر جب مغیبات کی چیزیں آئیں گی۔ وہاں وحی اور خدا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اللہ جو غیب کی چیزیں بتلائے وہ ہم مانیں گے۔ آپ کی عقل دنیا کی چیزوں میں اختراعات کر سکتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں دے سکتی کہ عرشِ عظیم کیسا ہے یہ نہیں بتا سکتی کہ کرسی کی شان کیسی ہے۔ جس کی قرآن کریم نے خبر دی۔ جنت کی نعمتیں کیا ہیں؟ جہنم کے عذاب کی کیا کیفیت ہے۔ یہ عقل کا دائرہ ہی نہیں ہے جو لوگ عقل سے اس دائرے کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ ایسے ہیں جیسے آنکھ سے خوشبو سونگھنا چاہیں۔ کان سے صورتیں دیکھنا چاہیں۔ انکی عقل کے اوپر ماتم کیا جائے گا اس طرح ان کی عقلوں پر بھی ماتم کیا جائے گا جو غیبی چیزوں کے دائرے میں عقل کو لڑائیں جہاں اس کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے لامحالہ

---

① ذکر ھذا الحدیث الصغانی فی الموضوعات لہ والسخاوی فی الموضوعات و المقاصد الحسنۃ. وابن الجوزی فی تذکرۃ الموضوعات واصحاب اُخَرفی کتب الموضوعات ولایصح الحدیث ولاالروایۃ بہ الامع صراحۃ البیان لوضعہ،نعم ذکرہ الرازی فی تفسیرہ ولم یذکر قولہ. حدیث موضوع (من گھڑت) ہے۔ دیکھئے: المقاصد الحسنہ ج: ۱ ص: ۷۵، وغیرہ.

عقل کو غیبی امور میں اِتباع کرنا پڑے گا۔ وہاں اس دائرہ میں رہ کر پھر عقل موشگافیاں کرے گی۔ طرح طرح کے نکتے پیدا کرے گی۔ لیکن مقصد کو پیدا کر دے یہ کام عقل کا نہیں۔ یہ تو مقصد معلوم کر کے اس کی تشریح کرے گی۔ اس میں سے نئے نئے علوم پیدا کرے گی۔

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علیٰ وجہِ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے...... بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین روایتی اور نقلی چیز ہے۔ جو منقول ہو کر آیا ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی دین کا دعویٰ کرے گا۔ تو سب سے پہلے سند کا مطالبہ کیا جائے گا کہ یہ چیز تم تک کیسے پہنچی؟ کس راستے سے پہنچی؟ روایت کرنے والے کون ہیں؟ ان کا کردار اور کیریکٹر کیا ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے اس کی سند کا اہتمام فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا کلام ہے۔ ہم دباؤ ڈالتے ہیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ فنی طور پر اس کی سند بیان کی کہ سند کے ساتھ جب یہ ثابت ہوگا کہ یہ کلام خداوندی ہے، پھر ماننا فرض ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دباؤ سے منوالیں یہ اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا مانو، ہم یہ زور نہیں ڈالتے، ہم فنی طور پر سمجھائیں گے۔ اس قرآن کریم کے اللہ سے آنے تک سند کے دو مرتبے ہیں۔ ایک اللہ سے رسول تک اور ایک پھر رسول سے ہم تک سند کے دو دائرے ہیں، دونوں دائروں میں حق تعالیٰ نے ہماری تسلی فرمائی ہے کہ سندِ متصل کے ساتھ پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ ہمارا کلام ہے پھر ماننے کا فیصلہ کرو۔ محض عقل اور خود رائی سے فیصلہ مت کرو۔

پہلی سند کہ اللہ سے کس نے کلام سنا ہے؟ اور کون ہے جو نبی تک لے کر آیا؟ اس سند کو حق تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا اور تفصیل بھی فنی طور پر کی۔ یعنی راویوں کے جو اوصاف ہیں۔ جن سے ان کی روایت معتبر ہوتی ہے۔ ان کا کردار جس سے بات سچی سمجھی جائے وہ بیان کی یہ نہیں کہا کہ ہمارا کلام ہے۔ تم ماننے کے لئے مجبور ہو۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام بیچ میں واسطہ ہیں۔ جو اُولوالعزم فرشتوں میں سے ہیں۔ سیّد الملائکہ ان کا لقب ہے۔ وہ واسطہ ہیں تو اللہ کا نام امین ہے، جبرئیل علیہ السلام کا لقب امین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی امین ہے۔ تو امین سے کلام چلا، امین کے واسطے سے آیا، امین پر اُترا۔ یہ جو بیچ میں امین ہے۔ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ حق تعالیٰ نے اسے ظاہر فرمایا اور سورۃ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ میں اس کی تفصیل فرمائی۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ① جبرئیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رسولِ کریم کا قول اور اس کا پڑھایا ہوا ہے۔ تو اوّل تو رسول کا لفظ استعمال کیا کہ جو کلام لے کر آیا، وہ ہمارا قاصد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سفیر یا قاصد، حکومت اسے بناتی ہے جس پر پورا اعتماد اور اطمینان ہو اس میں بغاوت کی بُو تک نہ ہو۔ حکومت کی ساری پالیسیوں کا دِلدادہ اور ان کا امین ہو۔ اگر گورنمنٹ کو ذرا بھی یہ شبہ ہو جائے کہ جس کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جا رہا ہے، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے یا اس کے اندر کچھ سرکشی کی خو بو ہے۔ وہ کبھی بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔

سفیر نہیں بنایا جائے گا۔ تو اللہ کی گورنمنٹ نے بھی اپنے کلام کے لئے ایسا سفیر و قاصد بنایا، جس کے اوصاف خود حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔ اس سے زیادہ امین اور کون ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلا لفظ تو یہ فرمایا کہ یہ کلام رسول کا ہے۔ رسول کے معنی ہی پاکباز کے ہیں۔ قاصد خداوندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ اس کے اندر سرکشی کی بو نہ ہو، بغاوت کا رنگ ذرہ برابر نہ ہو۔ اس لئے اوّل رسول کہنا، یہ خود ان کی تصدیق اور توثیق ہے۔ جو شخصیت ہمارا قرآن لے کر آئی ہے یہ باوُثوق ہے۔

پھر رسول کے آگے "کَرِیْمٍ" کا لفظ بھی بولا کہ رسول کرامت اور بزرگی والا ہے۔ دیکھا جائے تو رسول کے لفظ میں ہی ساری بزرگیاں آجاتی ہیں اور جب آگے یہ بھی فرمایا کہ کریم النفس ہے تو دو وصف جمع ہوگئے کہ اللہ کا قاصد اور اپنی ذات سے کریم النفس، اس کے اندر کوئی خدشہ نہیں، بغاوت کی بو نہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص کہے کہ رسول بھی ہو، قاصد بھی ہو، کریم النفس بھی ہو، لیکن دبّو قسم کا ضعیف آدمی ہو، پیام لے کے آیا۔ قوم نے جھڑ جھڑا کے کہا: کیا کہا تو نے؟ اپنی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر کے کہہ دے کہ جی میں یہ نہیں کہہ رہا تھا، تو ہوسکتا ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو رسول تھے اور کریم النفس بھی تھے۔ مگر ضعیف اور دبّو قسم کے آدمی تھے۔ کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کلام کو بدل دیا ہو۔ اس لئے ایک جملہ آگے بڑھایا فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ﴾ ① طاقت ور فرشتہ ہے۔ ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اسے دبالے کوئی اسے دھمکی دے اور جو چاہے کہلوالے تو کریم النفس رسول کا قول ہے جو طاقت ور ہے۔

جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قوم لوط پر جب عذاب خداوندی نازل ہوا تو مجھے امر فرمایا گیا: میں نے ان کی ساری بستیاں ہتھیلی پر اوپر لے جاکر پلٹ دیں اور پوری قوم تباہ ہوگئی۔ یہ اس فرشتے کی طاقت ہے۔ ایسا آدمی دب کر کلام بدل سکتا ہے۔ جس کی یہ طاقت ہو؟ یہ عقلی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ کسی سے دب کر کلام کہہ دے۔ جیسے بعض لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ نیک تو تھے۔ مگر ضعیف قسم کے تھے۔ انہوں نے آکر کہا کہ بھئی! سچی بات یہ ہے تو دوسرے نے لاٹھی اٹھائی۔ اس نے کہا نہیں نہیں میرا مطلب تو یہ تھا، یہ نہیں تھا جان بچانے کے لئے بات بدل دی۔ تو جبرئیل علیہ السلام ان میں سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد ممکن ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، کریم النفس بھی ہیں، طاقت ور بھی ہیں۔ مگر اللہ کا کلام بہت دور سے سنا، معلوم نہیں صحیح سنا ہے یا غلط سنا، کچھ کا کچھ سمجھ گئے ہوں۔ کچھ کی کچھ بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تو ایسے راوی کی روایت کا کیا اعتبار، چاہے وہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو۔ مگر دس میل سے بات سن رہا ہے۔ کیا خبر پوری بات کان میں پڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰.

مَکِیْنٍ﴾ ① ان کا مقام عرش والے کے پاس ہے کہیں دور نہیں ہے۔اس لئے وہ ہمارا کلام قریب سے سنتے ہیں، کہیں دور سے نہیں سنتے کہ آواز کے سننے میں فرق پڑ جائے۔اگر کوئی راوی روایت کرے اور اسے اپنے شیخ سے ملاقات نصیب نہ ہو۔اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی یا ملاقات ہو مگر دور سے ایک آواز سنی، دس احتمال ہیں کہ صحیح آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔اس لئے راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کے قریب ہوتا کہ پوری طرح سے سن کر آئندہ روایت کر سکے۔اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے مان لیا کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، بہت پارسا ہیں، کریم النفس بھی ہیں، ان پر کریمی برستی ہے، طاقت ور بھی ہیں اور عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں، کہیں دور سے نہیں سنا۔لیکن ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔اس لئے ان کا وقار اور حیثیت عرفی کچھ نہیں ہے۔لوگ اعتماد کیسے کریں؟

اس لئے کہ کلام میں حیثیت عرفی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔وہی بات میں کہوں اور وہی بات آپ کو انگلستان کی ملکہ کہے اس کا اور اثر ہوگا۔بادشاہ یا وزیراعظم اگر بات کرے تو عالم کی سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے۔اس کے معنی نکلتے ہیں، حکومتیں اس سے نتائج مرتب کرتی ہیں وہی کلام میں بولوں، کوئی اثر نہیں کہ ہاں بھئی! اچھی بات ہے ایک نیک آدمی نے کہا ہے۔ٹھیک کہا ہوگا۔تو وہی کلام صاحب حیثیت کہے اور وہی کلام بے حیثیت کہے۔اثرات میں فرق پڑ جاتا ہے۔اس بنا پر جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی یوں کہے کہ ان کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے۔اس لئے آگے فرمایا، ﴿مُطَاعٍ﴾ ② وہ "سَیِّدُ الْمَلٰئِکَه" ہیں۔سارے ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔آسمانوں میں ان کی سرداری مسلّمہ ہے۔تو سارے ملائکہ جن کی شان یہ ہے کہ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ﴾ ③ اللہ کے پاکیزہ بندے ہیں۔﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ﴾ ④ وہ عمل کرنے کے لئے اللہ کے قول کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔منشاء دیکھتے ہیں کہ منشاءِ خداوندی کیا ہے اور اطاعت میں جھک پڑتے ہیں اور ﴿وَلَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ ⑤ کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔جو امر کیا جاتا ہے اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔اپنی طرف سے اضافہ و کمی نہیں کرتے۔تو سارے ملائکہ کمال امانت و کمال دیانت کے پیکر ہیں۔ان ملائکہ کے سردار جبرئیل علیہ السلام ہیں۔تو اتنے پاکباز بندے کسی کی سرداری کو کیسے مان سکتے تھے جب تک کہ اس کی حیثیت اعلیٰ نہ ہو۔آپ ذرا سا ایک امیر بنائیں تو اس کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔امیر حکومت اور بادشاہ الگ چیز ہے۔میں کہتا ہوں کہ امامت کے سلسلے میں دیکھیں کہ کسی کو آپ امام بنائیں گے تو خیال کریں گے کہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہئے کہ مقتدی اس کی اقتدا

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰. ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱.

③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۶. ④ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۷.

⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶.

کرتے ہوئے کراہت نہ کریں۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ'' ''امام اسے بناؤ جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو''۔ ''فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَآءَةِ سَوَآءً'' اگر قرآن دانی اور قرآت میں سب برابر ہیں۔ تو ''فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ'' ① جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے امام بناؤ اور اگر قرآن اور سنت میں سب برابر ہیں، پھر اسے بناؤ جو مسائل صلوٰۃ سے پورا واقف اور کامل العلم ہو۔ حتیٰ کہ لکھتے ہیں اگر اس میں بھی سب برابر ہوں، علم اور اخلاق میں بھی سب یکساں پھر اسے بناؤ جو زیادہ خوبصورت اور حسین و جمیل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اقتدا کرنے والوں میں کوئی گریز اور اعراض پیدا نہ ہو۔ تو جس کو آپ نماز کا امام بنائیں گے، اس میں بھی خصوصیات کا خیال کریں گے۔ اگر آپ کسی کو ملک اور قوم کا امام بنانے لگیں۔ تو اس میں کیا کسی خصوصیت کی رعایت نہیں کی جائے گی؟ سب سے زیادہ رعایت کی جائے گی۔ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سردار بنایا اور ملائکہ وہ ہیں کہ عِفّت، عصمت اور پاکدامنی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اگر جبرئیل علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی۔ ملائکہ ان کی اقتدا نہ کر سکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ جبرئیل صاحبِ حیثیت ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا، مطاعِ وہ واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا ہم نے اپنا نائب یا سفیر بنا دیا۔ ایسا نہیں، بلکہ تمام آسمانوں میں واجبُ الاطاعت ہیں سیّد الملائکہ ہیں۔ تو اب گویا جبرئیل امین، رسول، کریم النفس، طاقت ور، عرش کے پاس مقیم اور واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔ لیکن اب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں مان لیں۔ مگر بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وصف امانت میں کوئی خرابی ہوتی ہے ان تمام اوصاف کے باوجود یہ کمی ہے کہ رازداری کے اندر کچھ زیادہ کامل نہیں۔ بعض لوگ نیک اور صالح ہوتے ہیں۔ مگر پیٹ ان کا ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ ان سے کوئی رازداری کی بات کہو، وہ چند دن میں دنیا جان لیتی ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے، نیکی اور بزرگی میں کلام نہیں۔ مگر پیٹ کا ہلکا ہونا اور چیز ہے۔

جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا حبیبُ الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھ سے پہلے مہتمم تھے۔ وفات کے دن چند باتیں بطور وصیت مجھ سے فرمائیں۔ ایک بزرگ کا نام لے کر فرمایا، جو ہمارے استاذوں میں ہیں۔ نہایت، پارسا، متقی اور صالح فرمایا ان کو راز کی بات کبھی مت کہنا۔ اگر راز فاش کرنا ہو، تب تو کہنا اور اگر چھپانا ہو، تو ہرگز مت کہنا تو ساری خوبیاں تھیں۔ مگر پیٹ کے ہلکے تھے۔ جس چیز کا افشاء کرانا ہو۔ بس ان سے کہہ دو۔ اگلے دن وہ سارے بازار میں مشہور۔ وہ ایک ایک کے کان میں ڈال دیتے تھے۔ غرض سارے اوصاف کے باوجود پیٹ کا ہلکا ہونا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا: ﴿ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ وہ امانت میں بھی کامل ہیں، گھٹیا درجے کے نہیں۔ تو رسول، کریم، واجبُ الاطاعت، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں اور ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہیں حتیٰ کہ ان کا لقب ہی جبرئیل امین ہے۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب من احق بالامامة، ج: ٣ص: ٣٢٨رقم: ١٠٨٧.

اب ظاہر بات ہے کہ جب راوی میں یہ اوصاف ہوں کہ رسالت و بزرگی الگ صلاح وتقویٰ الگ اور قربِ خداوندی الگ تو کیا وجہ ہے کہ ان کی روایت کو نہ مانا جائے اور ٹھکرایا جائے۔ اگر پھر بھی کوئی ٹھکرائے۔ اس کے اوپر عقل خود ملامت کرے گی کہ یہ عقلی اصول کے خلاف ہے۔ روایت کے بارے میں روای کے کیریکٹر اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ جب کردار صحیح ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے۔

تو اللہ ربّ العزّت کلام کے نازل کرنے والے اور اللہ کی ذات بے عیب ذات ہے وہاں ادنیٰ نقص وکمی کی گنجائش نہیں۔ مصدر خیر و برکت ہے۔ ''اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ'' ① حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! خیر ساری تیری ہے اور تیری ہی طرف لوٹ جانے والی ہے اور شر و برائی تیرے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ حق تعالیٰ شانہٗ جو کلام فرمادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں کسی قسم کے تامل کی گنجائش ہوتی تو راوی کی وجہ سے ہوتی کہ راوی میں خدانخواستہ کھوٹ ہے تو راوی کے فنی طور پر اوصاف بیان کئے کہ محض ہماری خدائی کی وجہ دبِ کرمت مانو جس کے ذریعے سے روایت کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے اوصاف کو فنی طور پر پرکھو۔ کیا وجہ ہے کہ تم اس کی روایت نہ مانو جس کے یہ کامل اوصاف ہیں۔ تو اللہ بھی امین اور واسطہ بھی امین۔

اب آگے پیغمبر ہیں پیغمبر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو معصوم ہو۔ جو ہر برائی سے بری اور بالاتر ہو۔ جو ہر وقت حق تعالیٰ شانہٗ کے اندر فانی ہو۔ ہر وقت رضائے خداوندی کے اندر مستغرق ہو کہ ذرہ برابر شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ اللہ کی نارضگی کو لے سکتے ہیں۔ جن کی شان فرمائی گئی ہے۔ ''کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ'' ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب مبارک میں یاد، زبان سے ذکر الگ، قلب مبارک سے الگ، روح پر فتوح سے الگ، جسمانی حرکات سے الگ کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت حضوری اور جلال و جمال کا مشاہدہ ہے تو جو دربار خداوندی میں ہر وقت حاضر ہو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان ہوسکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ غلط گوئی کرے گا؟ اور غلط گوئی بھی اللہ کے اوپر؟ عقل اس سے گریز کرتی ہے اور نہیں مانتی تو نازل کرنے والا اللہ، کلام کو لے کر آنے والے جبرئیل امین اور جن پر نازل ہوا، وہ پیغمبر اور نہ صرف پیغمبر بلکہ خاتم پیغمبراں، خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نبوّت کے جتنے کمالات ہیں۔ وہ سب اس ذات پر لا کر مکمل کر دیئے گئے۔ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں کہ کسی اور نبی کو لاکر اس درجہ کو پورا کر دیا جائے۔ سارے کمالات، علمی، اخلاقی اور عملی ان سب کا منتہی ایک ذات کو بنادیا گیا۔

خاتم الدیانت والامانت کی روایت کی تکذیب ممکن نہیں...... اس لئے آپ کا نام خاتم ہے کہ خاتم الرسل اور خاتم الانبیاء ہیں۔ تو خاتم کے معنی یہ نہیں کہ نبوت کو ختم کر دیا اور نبوت قطع ہوگئی۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل ج:۴ص:۱۶۹ رقم:۱۲۹۰۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ فی کل حال، ج:۲ ص:۲۹۷ رقم:۵۵۸۔

نبوت کی ایسی تکمیل ہوگئی کہ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے جو آپ کی ذات پر لا کر پورا نہ کر دیا گیا ہو تو خاتم کے معنی منتھائے کمالات کے ہیں جس پر آ کر کمالات منتہی ہو جائیں۔ اس لئے خاتم نبوت کے معنی قاطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت قطع کر دی بلکہ خاتم کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ ایک ذات کے اوپر تمام مراتب نبوّت کے ختم کر دیئے گئے۔ اب اس کا نور قیامت تک کافی ہے کوئی درجہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نبی کو لاکر اس درجے کو پورا کر دیا جائے۔ ایک ہی آفتاب کا نور ہے۔ جو آخر تک جائے گا۔

جب رات میں آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایک ستارہ نکلا، دوسرا، تیسرا، اربوں کھربوں ستارے نکلے۔ سارے ستارے مل کر کتنا ہی نور پھیلائیں۔ وہ دن نہیں بنتا رات ہی رہتی ہے لیکن جب آفتاب کی آمد شروع ہوئی۔ ابھی نکلا نہیں صبح صادق ہوتی ہے کہ ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہو گئے اور جب آفتاب نکل آیا تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں پڑتا۔ اب آفتاب اگر یوں کہے کہ انا خاتم الانوار میں سارے انوار کا ختم کرنے والا ہوں۔ تو کیا یہ مطلب ہوگا کہ آفتاب نے نور ختم کر کے اندھیرا پھیلا دیا۔؟ خاتم کا مطلب یہ ہوگا کہ سارے ستاروں کے جتنے انوار تھے وہ تنہا میری ذات کے اندر جمع ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میرا دور باقی ہے میں ہی تنہا کافی ہوں۔ چاند مشتری اور زہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سارے انوار کے پھیلانے کے لئے کافی ہوں۔ تو خاتم کے معنی مکمل کے ہیں نہ کہ قاطع کے۔ خاتم الانوار کے معنی قاطع الانوار کے نہیں کہ انوار قطع کر کے اندھیرا پھیلا دیا بلکہ تکمیل انوار کے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے شروع بھی ہوتا ہے۔ وہی فاتح بھی ہوتا ہے، وہی خاتم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ آفتاب خاتم ہے۔ یعنی سارے انوار اس پر ختم ہو گئے۔ تو فاتح انوار بھی وہی ہے کہ اسی کے نور سے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ سارے فلاسفر لکھتے ہیں کہ چاند اور دوسرے ستاروں میں کوئی ذاتی روشنی نہیں ہے آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، وہ چمک اٹھتے ہیں۔ ذات میں اگر روشنی ہے تو آفتاب کے ہے آفتاب اگر خاتم الانوار ہے تو فاتح الانوار بھی ہے۔ اس نے نور کی ابتدا کی ہے اسی پر آ کر انتہا ہوگئی۔

آپ یوں کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خاتم الآباء ہیں۔ یعنی آپ بھی باپ ہیں۔ آپ کے باپ بھی باپ تھے۔ ان کے باپ بھی باپ تھے ایک لمبا سلسلہ ہے تو سب کا باپ ہونا آدم علیہ السلام کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ آگے کوئی باپ نہیں نکلتا جو خاتم الاباء ہیں وہی فاتح الاباء بھی ہیں۔ وہیں سے باپ ہونے کی رسم چلی ہے؟ اگر وہ نہ ہوتے۔ اگلے بھی باپ پیدا نہ ہوتے۔ اس لئے جو کسی وصف کا خاتم ہے وہی اس وصف کا فاتح بھی ہوگا۔

آپ یوں کہیں کہ حق تعالیٰ شانہ خاتم الوجود ہیں۔ آپ کا وجود میرا وجود، زمین و آسمان کا وجود سارے وجود اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے کوئی نہیں ہے کہ وجود کا سلسلہ چلے، وجود کے سارے مراتب اللہ پر منتہی ہو گئے تو فاتح الوجود بھی وہی ہیں۔ وہیں سے وجود چلا جس سے ہم اور آپ موجود ہوئے اگر وہ وجود نہ دیتے۔ ہم

آپ کہاں سے موجود کہلاتے؟

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبوّت کہا گیا یعنی وصف نبوّت کے سارے کمالات آپ پر ختم کر دیئے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جیسے آپ خاتم ہیں فاتح بھی آپ ہیں۔ نبوّت کی ابتداء بھی آپ سے ہی ہوئی ہے جس کو آپ فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَوَّلُهُمْ خَلْقًا وَّاٰخِرُهُمْ بَعْثًا" ① میں سب سے پہلا ہوں بلحاظ تخلیق کے اور سب سے آخری ہوں بلحاظِ بعثت کے کہ میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ خاتم النبوّت اور آپ ہی فاتح النبوّت بھی ہیں۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نبوّت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔ اس لئے نہ جدید نبی آ سکتا ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ کوئی درجہ ہی باقی نہیں کہ نبی کے ذریعے اس کی تکمیل کرائی جائے۔ تنہا آپ کی ذات بابرکات کافی ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ نبوّت کے اوصاف میں امانت، دیانت، راست بازی، سچائی، عفت وعصمت اور پاکدامنی علیٰ وجہ الکمال ہونی چاہئیں۔ تو جب آپ خاتم النبوّت ہیں، تو پھر خاتم الحیاء بھی ہیں کہ حیاء کے مراتب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم الشجاعت بھی ہیں کہ بہادری کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم السخاوت بھی ہیں کہ سخاوت کے سارے مراتب آپ کے اوپر ختم ہیں۔ گویا آپ تمام کمالات پاکیزہ کا منتہی ہیں۔ اس واسطے جب آپ کو خاتم النبوّت کہا گیا تو خاتم الامانات بھی کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر امین بھی کوئی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمن کفار مکہ بھی آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ تو امین کی طرف سے وحی آئے، امین لے کر آئے، امین کے اوپر اتری۔ جب ایک خبر تین امینوں کے بیچ میں ہے تو اس کے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا ایسی ایسی چیزوں کو مان رہی ہے کہ سند کا بھی پتہ نہیں کہ اللہ سے کب چلی؟ کون لے کر آیا؟ کس نے لکھا؟ کہاں پہنچایا؟ تو جس کی سند اللہ سے لے کر نبی تک متصل ہے۔ اس کو بدرجہ اولیٰ ماننا چاہئے۔ پھر اس کے بعد آگے جو سند چلی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے ایک دو نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سینے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک حرف اس کا محفوظ ایک ایک اعراب اس کا گنا ہوا، ایک ایک تشدید، جزم، زبر، زیر اور پیش اس کا گنا ہوا۔ اسی طرح رکوع، سورتیں سب گنی ہوئی ہیں۔

اِمتیازی حفاظت...... اور حفاظت اللہ نے کہاں کرائی؟ محض کاغذ سے نہیں کرائی۔ کاغذ کو سمندر میں ڈال دو، نوشتہ بھی گل جائے گا۔ کاغذ بھی گل جائے گا۔ کاغذ کو زمین میں دفن کر دو، زمین کھا جائے گی، کاغذ اور حروف بھی گم ہو جائیں گے۔ محض کاغذ ہو، اس کو دیمک بھی کھا سکتی ہے حروف ختم ہو جائیں گے۔ یہ سب آفات کاغذ اور تختی پر

① علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه البزار ورجاله موثقون الا ان الربيع بن انس قال عن ابی العالية اوغيره فتابعية مجهول، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱ ص: ۷۱-۷۲.

ممکن تھیں۔اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے حفاظت نہیں کرائی بلکہ فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بیّنات وہ ہیں جو ہم نے اہلِ علم کے سینے میں محفوظ کی ہیں۔تو کاغذ کو دیمک کھاسکتی ہے مگر مومن کے دل کو دیمک نہیں کھاسکتی۔وہاں آگ پہنچ سکتی ہے، یہاں آگ نہیں پہنچ سکتی۔اس کو پانی گلاسکتا ہے۔قلب پر پانی اثر نہیں کرسکتا۔اس لئے قلب کے اندر محفوظ کیا گیا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ۔﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''ہم نے ہی یہ ذکر مبارک اتارا۔ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔پچھلی کتابوں کے بارے میں اللہ نے ذمہ داری نہیں لی تھی بلکہ اقوام کے اوپر ذمہ داری ڈالی تھی۔جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ﴾ ③ تورات ہم نے اتاری۔اَحبار اور رُہبان پیدا کئے۔جن کو تورات سکھلائی گئی: ﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا﴾ اَحبار اور رُہبان کو حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ تمہیں اس کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تم اس کی حفاظت کرو۔تو وہ نہیں کرسکے،اصلیت باقی نہ رہی۔قرآن پاک کے بارے میں یہ نہیں کہا اس لئے کہ یہ آخری کتاب تھی۔اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آنے والی تھی۔آخری دین تھا اس کے بعد کوئی دین آنے والا نہیں تھا۔آخری پیغمبر تھے۔کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔اگر اس کی حفاظت ہمارے اور آپ کے سپرد ہوتی تو وہی حشر ہوتا، جو پچھلی امتوں نے اپنی کتبِ سماویہ کا کیا،قرآن میں ردوبدل بھی ہوتا،محفوظ بھی نہ رہتا۔آخری کتاب کی حفاظت اللہ نے اپنی ذمہ لی ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ ہم نے اسے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔اس حفاظت کو اللہ نے واقعی کس عجیب طریق سے پورا کیا۔یعنی عموماً حفظ کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔بڑے آدمی اکثر حفظ نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو کچا رہتا ہے۔بچے ایسا محفوظ کرتے ہیں، جو پورا پکا یاد ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر بڑے حفظ کیا کرتے،تو کہا جاسکتا تھا کہ بھائی یہ قرآن کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اس ذمہ داری کو جانتے ہیں۔سمجھ دار، دانا اور عالم ہیں۔قرآن کریم کی حفاظت کررہے ہیں۔تو حفاظت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتی،لوگوں کی طرف منسوب ہوجاتی کہ بڑے علماء اور بوڑھے مشائخ مکتبوں میں بیٹھ کر یاد کررہے ہیں۔لیکن مکتبوں میں ایک بوڑھا نہیں ملے گا۔پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ہیں اور دس سال کی عمر میں قرآن کریم محفوظ۔انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ قرآن ہے کیا؟ انہیں یہ خبر نہیں کہ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ان کے ذریعے جو حفاظت کرائی جارہی ہے۔یہ حفاظت خداوندی کہلائے گی۔بچے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت نہیں کررہے۔اگر بوڑھے

① پارہ: ۲۱،سورۃ العنکبوت،الآیۃ: ۴۹۔ ② پارہ: ۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ: ۹۔
③ پارہ: ٦،سورۃ المائدۃ،الآیۃ: ۴۴۔ ④ پارہ: ۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ: ۹۔

کرتے تو حفاظت ان کی طرف منسوب ہوتی۔ بچوں کے ذریعے سے حفاظت کرائی گئی۔ اس واسطے اللہ کی حفاظت کہی جائے گی۔ اور ہر قرن میں لاکھوں کی تعداد میں حافظ موجود رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص عیاذ اُباللہ سارے قرآن کریم خرید کر دریا برد کر دے، قرآن مٹ نہیں سکتا ایک دن میں پھر لکھا جائے گا۔ وہ سینوں میں لکھا ہوا ہے۔ لکھے ہوئے سے ہم اپنی یادداشت کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی متشابہ لگ گیا، کوئی غلطی ہوئی حافظ نے لکھا ہوا دیکھ لیا۔ مگر مدارِ حفاظت لکھا ہوا نہیں ہے۔ مدار حفاظت اہلِ علم کے سینے ہیں۔

پھر روایت تواتر کی ہے اور تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین تین آدمی بھی روایت کرتے چلے آئیں۔ وہ خبر متواتر کہلاتی ہے۔ یہاں تین تین سو اور تین ہزار نہیں بلکہ ہر دور میں لاکھوں روایت کرتے آ رہے ہیں۔ تو لاکھوں کی تعداد میں جب حافظ موجود ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ وہ کلام ختم ہو سکے۔ یا اس کے اندر کوئی ردو بدل ہو سکے۔ بہرحال قرآن کریم کی اس شان سے حفاظت کرائی گئی کہ نازل کرنے والے نے خود حفاظت کی۔

مرادِ خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعین نہیں کی جاسکتی......اب ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم دستورِ اساسی ہے۔ اس میں اصول بیان کر دیئے گئے۔ ساری جزئیات اس میں نہیں بیان کی گئی۔ اصول کلیہ ہیں ان سے جزئیات نکالتے رہو۔ ان کی شرح کرتے رہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث پاک سے آیتوں کی شرح کی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ، مراد ربانی یہ ہے تو حدیث درحقیقت مبین ہے۔ اللہ کی مراد کو بیان کرتی ہے۔ محض اپنی رائے سے ہم سمجھ لیں کہ یہ مراد ہوگی۔ یہ ممکن نہیں ہے جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ میری مراد یہ ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے لغت عرب سے الفاظ لئے ہیں۔ ایک لفظ کے لغت میں اور معنی ہیں۔ قرآن نے اس میں دوسرے معنی ڈالے۔ وہ مراد ہوں گے لغوی معنی مراد نہیں ہوں گے مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے دعا کرنے کے معنی ہیں تو آپ گھر بیٹھ کر دعا مانگ لیا کریں بس نماز ہوگئی۔ شریعت نے صلوٰۃ کا لفظ لغت سے لیا اور معنی اس میں اپنے ڈالے اس طرح نیت کرو، اس طرح ہاتھ باندھو، اس طرح رکوع وسجود کرو۔ یہ صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃِ لغوی محض دعا مانگنا ہے اور صلوٰۃ شرعی وہ خاص افعال ہیں جو اللہ کے رسول نے بتلائے اگر رسول خود نہ بتلائیں کہ صلوٰۃ سے اللہ کی یہ مراد ہے، وہ مراد نہیں ہے جو تم نے لغت میں پڑھی تو صلوٰۃ کے معنی ہم کیسے سمجھیں گے؟ بس لغت میں جو لکھا ہے، وہ سمجھ لیں گے۔

یا مثلاً حج کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ بس گھر بیٹھ کے آپ نے قصد کر لیا اور حاجی ہو گئے۔ یہ ہزاروں روپے خرچ کرنا اور ہوائی جہازوں سے مکہ پہنچنا اور عرفات میں جانا، یہ سب ضائع اور دوراز کار ہو جائے گا۔ شریعت نے جب اس لفظ کو لیا تو اس کے معنی مرادی بیان کئے کہ حج سے مراد ہماری یہ ہے کہ یوں احرام باندھو، طواف کرو، عرفات جاؤ، منیٰ اور مزدلفہ جاؤ، ذبیحہ کرو، اس سارے مجموعہ کو کہا کہ اللہ کی حج کے لفظ سے مراد یہ ہے اگر کوئی شخص محض لغت کے بل بوتے پر قرآن کا حج کرنے لگے اور حدیث کو ترک کر دے۔ جو اس کی شرح اور بیان

ہے تو مراد ربانی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس کی نفسانی مراد ہوگی اور دنیا کو دھوکہ دے گا کہ اللہ نے یہ کہا حالانکہ لفظ اللہ کے لے رہا ہے اور معنی اپنے نفسانی بیان کر رہا ہے۔ یہ تلبیس اور دھوکہ دہی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کبھی یہ نہیں فرماتے کہ اس آیت کے ایک معنی یہ بن سکتے ہیں، ایک معنی یہ بن سکتے ہیں اور زمانے کے مناسب حال یہ معنی ہیں۔ لہٰذا اللہ کی یہ مراد ہے۔ جس طرح اللہ نے لفظ نازل کئے اللہ ہی نے اس کی مراد اور اس کا علم آپ کے قلب مبارک پر اُتارا جس کو آپ نے کھولا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ رٹنا شروع کر دیتے تھے تاکہ الفاظ خداوندی میرے سینے میں محفوظ ہو جائیں، کہیں بھول نہ جاؤں۔ حق تعالیٰ نے روکا، فرمایا ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ”اے نبی! اپنی زبان کو حرکت مت دو۔ تم اسی لئے تو جلدی کرتے ہو کہ بھول نہ جاؤں“۔ فرمایا ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ”یہ ہمارا ذمہ ہے کہ تمہارے سینے میں محفوظ کر دیں گے تمہاری زبان سے پڑھوا دیں گے تم اس کی فکر مت کرو“۔

﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ جب ہم قرات کرنے لگیں، تمہارا کام یہ ہے کہ تم سنتے رہو۔ جمع و محفوظ کر دینا اور زبان سے پڑھوا دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ جیسے لفظوں کا نازل کرنے والا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح معانی کا بھی ذمہ دار ہے۔ نبی کے قلب کے اوپر معانی بھی خود ہی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلا جملہ یہ ہے۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا اور اس کو بیان کر دینا۔ قرات پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے ہے اور بیان کہتے ہیں کھول دینے کو۔ اس کا تعلق سینے اور قلب سے ہے۔ تو لفظ زبان سے پڑھے جائیں گے اور معنی سینے سے سمجھے جائیں گے۔ حق تعالیٰ نے الفاظ کی حفاظت میں جو لفظ استعمال کیا وہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ﴾ کہ ہم پر لازم ہے ہم حفاظت کریں گے۔ وہی لفظ معانی کے لئے بھی استعمال فرمایا کہ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ⑤ ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کرنا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ⑥ ”اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا تاکہ تم کھول کھول کر مخلوق کو سمجھا دو کہ اس لفظ سے اللہ کی یہ مراد ہے، اس لفظ سے یہ مراد ہے“۔ جب مراد وحی سے متعین ہو گئی۔ اب اس میں غور و تدبر کرو۔ تو وہ علوم و معارف کھلیں گے جو اللہ کی مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراد کو عقل اور فکر سے متعین نہیں کریں گے مراد علم الٰہی اور کلام پیغمبر سے متعین کریں گے پھر اس میں عقل سے غور و فکر کریں گے۔ اس میں نئے نئے علوم پیدا ہوں گے۔ وہ

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ⑥ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

قرآنی علوم ہوں گے اور اگر مراد ہی عقل سے متعین کرو، وہ نفسانی مراد ہوگی، خدائی مراد نہ ہوگی، لغت کی مراد ہوگی شریعت کی مراد نہیں ہوگی۔ حاصل یہ کہ سنتِ نبوی مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے میں بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کرو، تو یہ نصیحت فرمائی کہ خوارج کے مقابلے میں قرآن سے کوئی دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے پیش کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے امیر المومنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب کا علم اور حکمت دے''۔

تو میرا خاص مضمون کتاب اللہ کے علوم ہیں اور انہی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں ان سے دلیل نہ پکڑوں۔ سنت سے دلیل پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ ''اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْہٍ'' ② قرآن کے جملے بلیغ ہیں اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر خوارج کے مقابلے میں ایک آیت سے ایک معنی بیان کرو گے۔ وہ اسی آیت سے دوسرے معنی بیان کریں گے اور تم پر حجت قائم کریں گے۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں، وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق و باطل واضح نہیں ہوگا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے مراد متعین کرو گے۔ اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ مراد متعین ہو جائے گی تو سنت درحقیقت مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے کہ اللہ کے یہ معنی مراد ہیں۔

اور سنت میں بھی اگر عموم ہو تو پھر اس کی مراد مجتہد فقہ سے متعین کرتا ہے جو ائمہ مجتہدین ہیں وہ آیتوں میں غور و فکر اور تدبر کرتے ہیں۔ رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا قران کی آیتوں میں تفکر و تدبر کرنا ہے اور قرآن میں سے وہ ایسے مسائل نکال لیتے ہیں کہ ہمارا فہم وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ علم کے درجات ہیں۔ ﴿وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ③ سارے عالم ایک ہی درجے کے نہیں ہوتے بعضے ادنیٰ، بعضے اوسط، بعضے اعلیٰ اور بعضے افضل ہیں۔ جب انبیاء میں بھی درجات قائم ہیں۔ ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ④ بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ تو علماء تو بعد کی چیز ہیں ان میں بھی تفاضل موجود ہے، بعض ادنیٰ و اوسط درجے کے اور بعض اعلیٰ مرتبے کے۔ تو اعلیٰ مرتبے کے علماء قرآن کریم سے جو اس کے حقائق سمجھیں گے ادنیٰ و اوسط مرتبے کے نہیں سمجھیں گے اور ان سب سے اوپر جن کو اللہ نے ملکہ اجتہاد دیا ہے وہ جو سمجھیں گے، وہ عوام علماء بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب ایک فقہ کا مسئلہ سامنے آجائے گا کہ واقعی یہ آیت سے نکل رہا ہے تو ہماری بھی سمجھ میں آجائے گا۔ اس لئے وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتا۔ تو قرآن کریم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کنواں ہو، اس سے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس رضی اللہ عنہما، ج: ۱۲ ص: ۱۰۰ رقم: ۳۴۷۳. ② الدر المنثور ج: ۱ ص: ۱۰. ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۱. ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۳.

پانی جاری ہے اور اجتہاد ایسے جیسے ڈول رسی تو آپ ڈول ڈال کر پانی نکالیں گے تو وہ پانی جو ڈول دے رہا ہے۔ وہ کوئی الگ پانی نہیں ہے۔ اس کنویں میں سے نکل کر آیا ہے ڈول اس کے نکالنے کا ذریعے بن گیا۔ اسی طرح امام مجتہد کا اجتہاد قرآن کے مخفی علوم نمایاں کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قرآن پر کسی خاص قسم کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ زیادتی کمی کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ: ''اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ'' ''قیاس کسی مسئلے کو ثابت نہیں، ظاہر کر سکتا ہے، قرآن میں چھپا ہوا تھا قیاس کرنے والے مجتہد نے اسے نکال کر سامنے رکھ دیا''۔ بہر حال اوّل کتابُ اللہ، پھر سنتِ رسول اللہ۔ سنت رسول اللہ کے بعد مجتہد کا اجتہاد ہے۔ اس کے بعد اجماعِ امّت ہے۔ تو ہم جس مسئلہ کو بھی دیکھیں گے پہلے قرآن میں تلاش کریں گے، پھر قرآن کی شرح جو حدیث ہے، اس میں تلاش کریں گے۔ پھر اس کی شرح میں جو فقہ ہے، تلاش کریں گے۔ اس کے بعد پھر امّت کا تعامُل دیکھیں گے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم کا کیا عمل رہا، اس سے کٹ نہیں سکتے، جہاں ایک طرف علمی دائرہ ہے۔ وہ محض لفظوں تک محدود ہے لیکن اس کے ساتھ ایک عملی دائرہ ہے کہ تمام سلفِ صالح اجماع کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی چیز سمجھتے آ رہے ہیں۔ تو تعامل اور عمل امّت کو معتبر سمجھا جائے گا اور امّت کے عمل کا مطلب زید، عمرو، بکر اور میرا تمہارا عمل نہیں۔ ان علماء ربانی اور صلحاء و مشائخ حقانی کا عمل ہے۔ جنہوں نے قرآن و حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ، تبع تابعین رحمہم اللہ علیہ، مجتہدین رحمہم اللہ علیہ، محدّثین رحمہم اللہ علیہ وفقہاء رحمہم اللہ علیہ ہیں۔ یہ اجماع کریں اور عمل کا راستہ ڈال دیں تو یقیناً اس عمل کا ماخذ کتاب وسنت میں ہے اور غور کرتے ہیں تو وہ ماخذ نکل آتا ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔

مسائل دینیہ میں مطالبہ سند اس امّت کا ذوق ہے...... بہر حال اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ادھر تو قرآن کی سندِ متواتر، ادھر حدیث کی سندِ متواتر۔ یعنی کلام رسول کی اس امت نے وہ حفاظت کی ہے کہ دوسری قومیں اپنے کلام خداوندی کی وہ حفاظت نہیں کر سکیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ اور راویوں کی پوری سند علماء بیان کرتے ہیں۔ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ'' مجھ سے فلاں، اور فلاں نے اس سے، اس نے اس سے اور اس سے فلاں نے بیان کیا۔ یہاں تک کہ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے جملے کے لئے بھی یہی طریق کار ہے۔ تو ایک ایک حدیث کی سند محفوظ حتی کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار راویان حدیث کا کیریکٹر اور تاریخ مرتب کر دی اور ایک فن بنا دیا۔ جس کو فن اسماء الرّجال کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے نام اور کردار و کیریکٹر جو حدیث کے راوی ہیں ان کا حافظہ ایسا تھا۔ تقویٰ ایسا تھا، خاندانی نسبت ایسی تھی تو ایک ایک چیز لکھی اور اسے تاریخ کا جز بنا دیا۔

تو جب قرآن کی سند متواتر، کوئی حدیث سند سے خالی نہیں، پھر فقہ میں بھی یہی صورت ہے۔ یعنی اس امت کی عادت یہ پڑ گئی کہ بے سند کے کوئی چیز نہ مانے مثلاً ''الهدایة'' (جو فقہ کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب ہے۔

ایک عرصہ سے داخل درسِ نظامی ہے) اس کی سند دی جاتی ہے کہ ہدایہ کی روایت مصنف ہدایہ سے کس نے کی اور اس سے کس نے اور اس سے کس نے روایت کی ہے؟ ہماری سند صاحب ہدایہ تک متصل ہے۔ حتیٰ کہ تصوف میں جو محققین صوفیاء ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھیں تو تصوف کے مسائل میں بھی اسی طرح سند بیان کرتے ہیں جس طرح سے حدیث کی سند بیان ہوتی ہے۔ کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، ان سے جنید نے اور ان سے شبلی نے بیان کیا، وہ بھی سند سے پیش کرتے ہیں۔ تو اس امت کا گویا ذوق ہی قرآن نے یہ بنا دیا کہ بے سند کسی چیز کو جو دین کے بارے میں ہو مت قبول کرو۔ آج بھی اگر کوئی دین کا مسئلہ پیش کرے گا۔ پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ بھئی! قرآن و حدیث فقہ اور تعامل اِمّت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ کا عمل اس پر تھا؟ ان میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو بات رد کر دی جائے گی ان سب میں موجود ہوگا تو کہیں گے کہ سر آنکھوں پر، ضرور قبول ہے۔

سندِ صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اِتّباع فرض ہے...... اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور امّت کے اکابر کی سند تک کے محتاج ہیں اور ایک ایک جز میں کہتے ہیں کہ ان کی سند لاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی سب سے پہلی محبت تو اللہ سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت ائمہ مجتہدین سے قائم ہے۔ ان کے بعد علماء ربانی اور مشائخ حقانی سے قائم ہے۔ محبت سے ہی یہ سارا سلسلہ چلتا ہے۔ اگر ائمہ محبوب نہ ہوتے تو ایک ایک جزئی میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگر مشائخ طریقت محبوب نہ ہوتے۔

تو ان کی کسی بات کی یہ روایت نہ کرتے۔ حالانکہ اسے سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ اگر ائمہ مجتہدین محبوب نہ ہوتے، ان کا اجتہاد کبھی نہ قبول کرتے۔ تو اللہ سے الگ محبت، رسول سے الگ محبت، ائمہ، مجتہدین سے الگ محبت، فقہاء امّت اور مشائخ طریقت سے الگ محبت۔ یہ تو سب کی محبت میں گرفتار ہو کے عاشق کل ہیں۔ انہیں کوئی یوں کہے کہ ان کے دلوں میں بزرگوں سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس سے سے زیادہ دھوکہ دینے والا کون ہے؟ یہ تو اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ تو علماء، مجتہدین اور فقہاء تک محبت رکھتے ہیں، مشائخ طریقت سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بات کی بھی سند لاتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا: یہ ہمارے مقتدا ہیں۔ سند سے ایک بات ثابت ہوتی، ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو تصوّف، حدیث، تفسیر سب ان کے سر آنکھوں پر، سب کی محبت کے اسیر ہیں اور یہ سب کے عشاق اور سب کی محبت میں غرق ہیں۔ بہر حال سب سے پہلا مطالبہ سند کا ہوگا اور سند کے بعد جو درجہ رہ جاتا ہے وہ اِتباع کا ہے۔ تو جب سندِ صحیح سے ایک مسئلہ ثابت ہو جائے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اِتباع کریں۔ اب خود رائی یہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔ دین میں رائے زنی یا کسی مسئلہ کو رائے سے بنانا، یہ کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ

﴿يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ ① ”کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ و رسول کا حکم آ جانے کے بعد وہ اس کے اندر اپنی رائے زنی کرے“۔ اس کا اختیار حکمِ خداوندی آ جانے کے بعد سلب ہو جاتا ہے۔ نہ اس کا ارادہ باقی نہ اختیار باقی، اگر ہے تو اتباع باقی ہے کہ پیروی کرو کہ جس اللہ سے ایک چیز ثابت ہوگئی۔ تو اب اس میں رائے کی گنجائش نہیں اور فقہ و تعامل امّت سے ثابت ہوگئی اب اس میں بھی رائے زنی اور ٹال مٹول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب صرف عمل کرنا ہے تو قانون شریعت عمل کے لئے ہے، تجویز کے لئے نہیں ہے۔ تجویز تو اللہ پاک کر چکا۔ ہمارا کام تجویز نہیں بلکہ تفویض ہے کہ اپنے کو سونپ دیں اور حوالے کر دیں کہ جو اللہ نے کہا وہ میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی نجات ہے اور اسی میں گروہ بندی اور پارٹی سازی قطع ہوتی ہے۔ پارٹی بندی کبھی نقل، سے نہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ تخیلات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نص صریح، نص فقہ، یا نص حدیث موجود ہے یا امت کا تعامل موجود ہے تو اختلاف کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔

رائے زنی کبھی غلو محبت سے ہوتی ہے کہ کسی بزرگ سے بے حد محبت ہے۔ اس کا کوئی فعل دیکھا۔ اسے قانون کی صورت میں پیش کر دیا کسی سے عداوت ہے، اس کا کوئی قول دیکھا اسے رد کر دیا تو رد و قبول بعض دفعہ غلو محبت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ غلو عداوت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بدفہمی اور بعض دفعہ بدنیتی سے ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے کہ دین میں رخنہ ہی ڈالنا مقصود ہے۔ لیکن جب نصِ صریح آ گئی یہ ساری چیزیں قطع ہو جاتی ہیں۔ خیال آرائی کا دین میں کوئی تعلق نہیں، وہ منتقل دولت ہے جو آئی ہے، ہمارا کام اس کے سامنے گردن جھکانا ہے۔

بہر حال یہ معیار ٹھہرا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں تو کوئی چیز نہیں، لاشی محض ہوں۔ نہ کوئی عالم نہ فاضل، علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے والا ہوں۔ مگر علماء سے ایک نسبت ہے ان کا ایک ڈھنگ دیکھا ہے۔ یہ جو اکابر دیو بند کہلاتے ہیں۔ ان کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ، فقہ حنفی، یا جس فقہ کا تابع ہے۔ فقہ حنبلی یا شافعی، اس کے بعد تعامل امت اور امت کا ذوق کہ کس ذوق پر امت چل رہی ہے کس ذوق پر سلفِ صالحین چلے ہیں۔ ان سب کو لے کر ایک مسلک بنتا ہے۔ جس میں قرآن بھی داخل، حدیث، فقہ، تصوّف، طریقت و شریعت بھی داخل ہے۔ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے، اس کا اتباع ہو۔ تو میں تو نہ کوئی عالم، نہ فاضل، دارالعلوم دیو بند کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ مگر ان بزرگوں سے نسبت حاصل ہے۔ ذرے کو بھی آفتاب سے نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ذرہ چھوٹی اور حقیر چیز ہے۔ مگر جب آفتاب روشنی ڈالتا ہے۔ ایسے چمکنے لگتا ہے جیسے ہیرا۔ حالانکہ وہ چمک اس میں نہیں۔ وہ چمک آفتاب کی ہے۔ ایک نسبت آفتاب سے قائم ہوگئی جس سے وہ چمک رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ ان حضرات نے سپاسنامے میں جو تعارف کرایا۔ وہ میرا تعارف ہی نہیں تھا۔ وہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم ایسے عالی حوصلہ ہیں کہ خوردوں کو بڑھا سکتے ہیں، اپنے چھوٹوں کو

① پارہ: ۲۲، سورة الاحزاب، الآية: ۳۶.

عزت دے سکتے ہیں۔ اپنے علو حوصلہ اور عالی ظرفی کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف صرف یہ ہے کہ میں لاشی محض ہوں مگر ایک نسبت رکھتا ہوں ؎

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ ذرّهٔ آفتا بے تابا نیم

ہم اگرچہ حقیر و ذلیل ہیں۔ مگر نسبت بڑی ہے۔ جن بزرگوں سے وابستہ ہیں۔ وہ بے شک بڑے تھے۔ ان کی وجہ سے کوئی ہمارا نام بھی لے لیتا ہے، ہمیں پوچھ لیتا ہے۔ ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہمارے سامنے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، تعامل امت، فقہ اسلامی اور اکابرِ طریقت و شریعت کی محبت اور ان کی عظمت، یہ چیزیں ہیں جن پر فی الحقیقت دین کا مدار ہے۔

ادب و عظمت دین کی بنیاد ہے...... دین کی بنیاد ادب پر قائم ہے۔ بے ادبی اور گستاخی پر قائم نہیں ہے ؎

بے ادب محروم ماند از فضل ربّ

جو جسارت اور بے باکی برتے گا، وہ آخرت سے کبھی حصہ نہیں پائے گا۔ کبھی اللہ والوں کا اعتماد نہیں پائے گا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿يَآ يُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ ① ''اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں بیٹھ کر نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو اس جرأت و گستاخی کی وجہ سے تمہارے سارے عمل ضائع کر دیے جائیں''۔

یہ رسول کا ادب بتلایا۔ قرآن کریم کا ادب بتلایا ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ قرآن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جب کہ تم باوضو اور پاک نہ ہو۔ مساجد اللہ کا ادب بتلایا کہ جب مساجد میں آؤ، ادب کے ساتھ آؤ: ''لَا تَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ'' ﴾ ② مسجد میں دوڑے ہوئے مت آؤ۔ جیسے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ سبک حرکتی ہے۔ متانت، وقار اور سکون کے ساتھ آؤ۔ نیز فرمایا گیا، مساجد کے اندر دنیا کے جھگڑے اور باتیں مت کرو۔ ذکر اللہ کرو، نماز میں مشغول ہو جاؤ، درود شریف پڑھو یا تلاوت کرو۔ جو جھگڑے گھروں میں چھوڑ کے آئے تھے، انہیں مسجد میں بھی لے آئے۔ یہ مسجد کا احترام ہوا یا بے احترامی؟ جس کو فرمایا گیا ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ بدنصیب، بدقسمت اور ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں کو ڈھا دے۔ مسجد کی ایک صورت ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ صورت اینٹیں ہیں۔ انہیں کوئی ڈھا دے، یہ بھی مسجد کا ڈھانا ہے۔ ایک یہ کہ اینٹیں تو نہیں ڈھاتا۔ مگر دنیا کی باتیں اور لغو شغل اتنے زور سے کرتا ہے کہ ذکر اللہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲.

② روح المعانی، سورۃ الجمعۃ، ج: ۲۱ ص: ۹.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۴.

کرنے والوں کے ذکر کرنے میں خلل پڑ رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والوں کی نماز وتلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔ اس کو بھی فقہاء نے منع لکھا ہے۔ بلکہ تلاوت بھی اتنے زور سے مت کرو کہ دوسرے کے ذکر میں خلل پڑے۔ یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانا ہے۔ اس لئے کہ مسجد کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب تم ذکر اللہ میں آڑے آ گئے اور دوسرے کو روک دیا تو مسجد کی صورت نہیں ڈھائی مگر حقیقت تم نے ڈھادی۔

یعنی روایات میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنا ایسا ہے جیسے مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا۔ یعنی مسجد کو آلودہ اور گندہ کر دیا۔ اس لئے مسجد، بیت اللہ، حرم محترم، اولیاء اللہ، انبیاء اللہ اور کتب اللہ، ان سب کا ادب بتلایا۔ سارے دین کی بنیاد ادب وعظمت کے اوپر قائم ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ جن کا ذکر ابھی آپ نے سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ہمارا یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہما سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان حضرات کے اوپر چشتیت غالب ہے۔ گو تربیت قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق پر بھی کرتے ہیں ان کے اذکار بھی بتلاتے ہیں اور جس کی جیسی مناسبت دیکھتے ہیں۔ ویسی ہی اس کی تربیت کرتے ہیں۔ تو چاروں سلسلے ان کے پاس ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر سال دو سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتے۔ تو رُڑکی سے نہر کی پٹڑی پر کنارے کنارے کلیر شریف کو راستہ جاتا ہے۔ وہاں سے کوئی پانچ چھ میل ہے۔ حضرت جب نہر کی پٹڑی پر پہنچتے، جوتے اٹھا کر بغل میں داب لیتے۔ پانچ میل ننگے پیر طے کرتے تھے۔ یہ کیا چیز تھی؟ مشائخ طریقت کا ادب کہ جن کی جوتیوں کے صدقے ہم نے اخلاق سیکھے، جن کی بدولت ہمارے نفوس پاک ہوئے۔ ان کے احسان کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کس طرح انہیں سر پر نہ بٹھلائیں۔ اس لئے پانچ میل کی مسافت ننگے پاؤں طے کرتے۔

حضرت مولانا جب حج کو گئے ہیں تو یہ وہ قافلہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ صاحب وغیرہ۔ یہ سارے حضرات ایک ساتھ گئے تھے۔ مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) جب قریب آتا ہے تو بیر علی ایک منزل ہے۔ اس پر جب اونٹ چڑھتے ہیں تو چڑھتے ہی حرم شریف کے مینارے نظر پڑتے ہیں۔ اب موٹروں کی سورایاں ہیں۔ اس زمانے میں اونٹوں کی سواریاں ہوتی تھیں۔ یہ سب حضرات اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ مکہ سے گیارہویں دن مدینے پہنچتے تھے۔ گیارہ راتیں راستے میں لگ جاتی تھیں۔ یہ قافلہ جب "بیر علی" پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سواری سے ایک دم اچھل کر نیچے کودے اور ننگے پیر چلنا شروع کیا حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی نوکیلی ہیں کہ ایسی چبھتی ہیں جیسے سوئیاں چبھتی ہیں۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہاں

چل سکے۔ حضرت کی دیکھا دیکھی سینکڑوں آدمی نیچے کود گئے کہ ہم بھی پیدل چلیں گے۔ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ یہ بے وقوفی نہیں ہے؟ ان پر تو محبت نبوی کا حال غالب ہے۔ انہیں نہ کانٹوں کی پرواہ نہ چبھن کی پرواہ۔ یہ نقل اُتار رہے ہیں، یہ کہاں تک چلیں گے؟۔ چنانچہ کوئی سو قدم، کوئی ڈیڑھ سو قدم چلا، پھر اونٹ پر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا جیسے بالکل محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ربودہ اور غرق ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں پیر لہولہان ہو گئے اور انہیں کچھ پتہ نہیں وہ جا رہے ہیں۔ تو ادب کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کے منارے دیکھ کر یہ جرات نہیں ہوئی کہ اونٹ پر بیٹھیں۔ ننگے پیر کنکریوں میں چلے جس سے معلوم ہوتا ہے ان حضرات کے دلوں میں شریعت کا ادب کتنا غالب تھا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ جو اس پوری جماعت کے شیخ طریقت ہیں۔ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کے بعد مکہ مکرمہ میں ہجرت فرمائی لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ جوتا نہیں پہنتے پہلے تو اتفاقی بات سمجھے مگر جب کوئی لے کے آیا، اسے رد کر دیا۔ سرخ یا زرد رنگ کا پہنتے۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ارادی فعل ہے، اتفاقی نہیں ہے۔ حضرت سے عرض کیا، حضرت کیا سیاہ جوتا ممنوع ہے۔ فرمایا نہیں۔ آپ کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا ادب کے خلاف ہے۔ جو رنگ بیت اللہ کے غلاف کا ہے میں اسے پیروں میں ڈالوں؟ شرعاً سیاہ جوتا پہننا ممنوع نہیں۔ مگر جب ادب غالب ہوتا ہے، آدمی قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔

ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود قانون نہیں..... مگر یہ سمجھ لیجئے کہ قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا۔ یہ خود قانون نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں۔ تم بھی سیاہ جوتا پہننا چھوڑ دو، تم بھی ننگے پیر چلا کرو۔ یہ ایک شخص کا حال ہے اگر وہ حال آپ میں پیدا ہو جائے۔ آپ یہ کام ضرور کریں گے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر نقالی کریں گے پھر پیغمبر کی نقل اصل ہے۔ لوگوں کی نقل اصل نہیں ہے۔ صاحب حال کا مقام اور نقال کا اور نقل کرنے والے سے کہا جائے گا کہ تو فلاں کی نقل مت کر، قانون شریعت کی نقل کر، سب کے لئے جو عام حجت ہے، وہ قانون شریعت ہے طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ وہ قانون نہیں ہوتے کہ دنیا کو پابند کیا جائے، طریقت کے اوراد بتائے جائیں گے اور ادا کرتے کرتے کوئی حال تک پہنچ گیا۔ اس کے لئے مبارک ہو پھر وہ اس حال کے مطابق عمل کرے گا۔ کسی کو ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن قانون بہر حال نہیں بنے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دے۔ منصور رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب ہوا اور غلبہ حال میں کہا کہ ''انا الحق''۔ میں حق ہوں یہ مطلب نہیں تھا کر خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ انا الحق کا یہ مطلب ہے کہ حق ہی حق موجود ہے۔ میں اپنے اندر دیکھتا ہوں، حق ہی کا جلوہ پاتا ہوں۔ خود میری ذات کوئی چیز نہیں جگہ جگہ حق ہی نظر آتا ہے۔ تو ''انا الحق'' کے معنی یہ لئے کہ حق کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ اپنی ہستی گم ہو گئی۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے آپ آفتاب کو دو منٹ ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اب جو نگاہ ہٹائیں گے

جدھر نظر پڑے گی، آفتاب کی ٹکیا سبز، سرخ اور سیاہ رنگ کی نظر پڑے گی۔ ساری چیزیں اوجھل ہو جائیں گی۔ آفتاب ہی آفتاب نظر آئے گا حتی کہ آپ اپنے آپ کو دیکھیں، وہاں بھی آفتاب ہی نظر آئے گا۔ ایسے میں اگر کوئی یوں کہہ دے کہ میں آفتاب ہوں تو یہ مطلب نہیں کہ میں آفتاب بن گیا۔ بلکہ یہ کہ آفتاب میرے اوپر اتنا غالب آ گیا کہ آفتاب کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تو منصور پر فنائیت کا غلبہ ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ کی تجلیات اور انوار اتنے غالب ہوئے کہ اپنے اندر دیکھتے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا تھا ادھر ادھر دیکھتے تھے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا۔ بہر حال منصور کا ایک حال تھا جو انہوں نے ’’انا الحق‘‘ کہا۔ کیا یہ قانون ہے کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں کہ تم بھی ’’انـا الـحـق‘‘ کہا کرو۔ اگر لوگ کہیں گے تو انہیں پھانسی دی جائے گی قابل گردن زنی ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ منصور نے کہا، ہم کہیں گے۔ منصور کا حال بھی تو پیدا کرو۔ جب حال پیدا ہو گا۔ تم خود بخود اس کو انجام دو گے۔ بلا حال نقل کرو گے تو قانون شریعت کی نقل لازمی رہے گی۔ شخصی حالات قانون نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر کوئی بزرگ بیمار ہوا اور اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ بیٹھ کر نماز پڑھ لی۔ مریدین معتقد تھے۔ انہوں نے سب کو جا کر کہا کہ شیخ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے لہذا سب بیٹھ کر پڑھا کرو۔ سب نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چھوڑ دی کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ انہیں کہا جائے گا کہ شیخ کی بیماری کا وہ حال بھی اپنے اندر پیدا کرو جب بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ حال کا نشان نہیں اور شیخ کی نقالی کر رہے ہیں یہ حرکات وجدی ہیں۔ وجد جب پیدا ہوتا ہے جب وہ حرکت سرزد ہوتی ہے۔ وجد آپ کے اندر رہے ہی نہیں اور ان کی نقلیں اتاریں۔ وہ نقل بھونڈی ہوگی۔ پھر شریعت اور احکام شرعیہ کی نقل اتاری جائے گی ان احوال کی عظمت کی جائے گی۔ صاحب حال کو سر پر بٹھایا جائے گا۔ ان کی تعظیم کی جائے گی مگر قانون کے طور پر نہیں پیش کریں گے۔

مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع پیدا ہوتا ہے..... مگر یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس کے اندر معرفتِ کامل ہو۔ حق کی پہچان کامل ہو، قرب خداوندی حاصل ہو، وہ یہ کر سکتا ہے کہ اتنی چیز میرے کرنے کی ہے اتنی چیز میرے قبضے سے باہر ہے۔ میں نہیں کر سکتا کسی کے ذاتی حال کو قانون بنا کر پیش کرنے سے جنگ شروع ہوتی ہے کہ علماء کھڑے ہوں گے، کہیں گے یہ ناجائز ہے، دوسرے کہیں گے یہ بزرگوں کے خلاف کر رہے ہیں، ہم تو بزرگوں کا حال پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہیں گے بزرگوں کا حال قانون نہیں۔ قانون شریعت پر عمل کرو۔ عمل کرتے کرتے اس حال پر آ جاؤ، جو ان بزرگ کا ہے پھر ہم تمہیں کوئی ملامت نہیں کریں گے بلکہ گردن جھکا دیں گے۔ مگر تم بلا حال کے کرو تو قانون شریعت کی نقالی کی جائے گی لوگوں کے احوال کی نقالی نہیں کی جائے گی۔

بعض احوال شخصی ہوتے ہیں قانون نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے اولیائے کاملین میں سے ہیں۔ ایک تو خواجہ نظام الدّین سلطان الاولیاء ہیں۔ دوسرے مولانا نظام الدّین ہیں۔ ایک شخص جو ان کے مریدین میں سے تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ’’حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو

خواب میں دیکھ لوں۔کوئی تدبیر بتلا دیجئے''۔

فرمایا''فرض نماز چھوڑ دو''۔یہ حیران ہوئے کہ فرض نماز چھوڑنے سے اللہ کا قرب پیدا ہوگا یا بعد؟ نماز پڑھنے سے قرب پیدا ہوتا ہے، نہ کہ نماز چھوڑنے سے؟ حضرت فرمارہے ہیں کہ نماز چھوڑ دو، اللہ میاں کی زیارت ہوجائے گی۔ادب سے بول کچھ نہیں سکا۔مگر عمل کرنے کی جرات نہیں کی، اس لئے کہ یہ بالکل خلاف شرع ہے کہ ترک نماز کا حکم دیا جائے۔مگر وہ جذبہ اندر تھا کہ کسی طرح حق تعالیٰ کی زیارت ہو۔تین چار دن کے بعد پھر حاضر ہوا کہ حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اللہ کو خواب میں دیکھ لوں، کوئی تدبیر؟ فرمایا۔بیوقوف بتلا تو دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔اب یہ بے چارہ پھر چپ کہ شیخ کیسے فرمارہے ہیں۔پھر جرات نہیں ہوئی۔

تیسری دفعہ چند دن کے بعد پھر کہا۔فرمایا تو احمق میرا وقت ضائع کررہا ہے۔تدبیر بتلا دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ایک دن جا کے یہ جرات تو نہ ہوئی کہ فرض چھوڑ دے۔فرض پڑھ لئے سنتیں چھوڑ دیں۔رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ فرمارہے ہیں کہ بھائی! ہم نے کیا قصور کیا تھا جو ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔یہ جلدی سے گھبرا کے اٹھا، وضو کیا، عشاء کا وقت باقی تھا۔جلدی جلدی سنتیں ادا کیں۔صبح کو حضرت شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔عرض کیا حضرت یہ واقعہ گزرا فرمایا''اگر فرض چھوڑتا تو اللہ میاں آکے پڑھواتے تو نے سنتیں چھوڑنے پر قناعت کی''۔

شریعت وطریقت کو محقق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے......اب یہ ایک مسئلہ آیا۔اس میں دو پہلو نکلتے ہیں۔بے ادبی کا یہ پہلو ہے کہ مولانا شیخ نظام الدین نے سخت غلطی کی فرض نماز چھڑانے میں۔اللہ تو نماز فرض کرے، وہ کہیں چھوڑ دو۔ہم نہیں ان کی بات مانتے۔ان کی بات کو دیوار پر مارو۔یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے کہ ایک شیخ وقت کی شان میں گستاخی کی جائے۔اور ایک راستہ یہ نکلتا ہے کہ بھئی! ہم نہیں جانتے قرآن وحدیث میں کیا ہے۔نماز فرض ہے یا نہیں؟

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

شیخ وقت جو کہہ دے وہ قرآن ناطق ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ہمیں خبر نہیں قرآن وحدیث میں کیا ہے۔یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔کہ شیوخ طریقت کی وجہ سے قرآن وحدیث کو ترک کیا جائے یا قرآن وحدیث کا نام لے کر شیوخ کے طرق کو رد کر دیا جائے۔دونوں راستے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔نہ قرآن وحدیث کی بے ادبی جائز نہ اکابر اولیاء اللہ کی بے ادبی جائز۔معتدل حق راستہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن رہے اور ایک ہاتھ میں بزرگوں کا دامن رہے اور جامع راستے پر چلے۔مگر یہ راستہ محقق سمجھ سکتا ہے، غیر محقق کے بس کی چیز نہیں ہے۔

مجھے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہی واقعہ پیش کیا گیا بعض نے تو کہا ہم نہیں مانتے۔یہ قرآن وحدیث کے

خلاف ہے اس بات کو رد کرو۔ بعض نے کہا ہم مانتے ہیں، ہم نہیں جانتے ان کاغذوں میں لکھے ہوئے قرآن و حدیث کو۔ فرمایا یہ دونوں راستے تباہی کے ہیں۔ معتدل اور حق راستہ یہ ہے کہ دونوں کی عظمت قائم رہے اور آدمی بیچ میں سے نکلے۔ فرمایا وہ (معتدل اور حق راستہ) کیا ہے؟

واقعی یہ تحقیق کی بات ہے۔ فرمایا پہلے ایک بات سمجھ لو، اس کے بعد مسئلہ سمجھ میں آجائے گا۔ فرمایا اولیاء اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اپنی ریاضت، محنت اور مجاہدے کرتے کرتے کسی بڑے مقام پر پہنچ جائے۔ کوئی قطب، کوئی غوث بنا، محنتیں اور ریاضتیں کیں اور بڑے مقام تک پہنچ گئے۔

اور ایک وہ ہے کہ حق تعالیٰ اسے منتخب فرمالیں کہ اسے اس مقام کے اوپر لانا ہے۔ وہ نہیں بھی چاہے گا تو زبردستی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقام پر پہنچے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اپنی محنت، دیانت سے بڑے عہدوں تک پہنچ جائے۔ سپاہیوں میں ملازم ہوا۔ دیانت داری سے کام کیا تو وہ ہیڈ کانسٹیبل بن گیا اور محنت سے کام کیا تو اور اوپر کا عہدہ مل گیا اور محنت سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا اور اونچے مقام تک پہنچ گیا۔ اور ایک وہ ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہے اور حکومت نے چاہا کہ یہ ولی عہد ہو اس کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگے گا بھی، زبردستی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کو نیابت کے عہدے پر لائیں اور ولایت عہد سپرد کریں۔ اولیاء میں یہ دونوں طریقے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے مقامات طے کرتے ہیں۔ بعض منتخب ہوتے ہیں کہ وہ نہ بھی آنا چاہیں تو زبردستی انہیں لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، آپ مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ مسکرائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یَا رَسُوْلَ اللہِ! "مَا یُضْحِکُکَ"؟ کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں، بعض لوگ جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر جنت میں لے جانے کے لئے کھینچا جا رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔

تو صوفیاء کی اصطلاح میں جو اپنی محنت سے مقامات طے کرے اسے مرید کہتے ہیں اور جو اللہ کی طرف سے منتخب ہو اسے مراد کہتے ہیں۔ تو ایک مرید ہے جو اپنی ارادت اور عقیدت سے ترقی کر رہا ہے اور ایک مراد ہے کہ جس کو منتخب کر لیا گیا ہے وہ نہیں چاہے گا تو زبردستی اسے اونچے مقام پر پہنچائیں گے۔

قرآن کریم میں بھی یہ دونوں مقامات بیان کئے گئے مگر قرآن کی اصطلاح دوسری ہے جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں قرآن میں مُنِیب کہتے ہیں۔ یعنی "اِنَابَتْ اِلَی اللّٰہِ" اور "رُجُوْع اِلَی اللّٰہِ" کے راستے سے ترقی کر کے پہنچتے ہیں اور جو منتخب کئے جاتے ہیں انہیں مجتبیٰ کہتے ہیں۔ جس کو ارشاد فرمایا: ﴿اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ﴾ (1) اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، اسے مقامات پر پہنچاتا ہے اور جو ہدایت، اِنابت اور محنت کا راستہ اختیار کرے، اسے ہدایت دیتا ہے۔ اسے مدد دے کر مقامات تک پہنچا دیتے ہیں،

(1) پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۳۔

تو ایک مجتبین کی جماعت ہے اور ایک منیبین کی جماعت ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایک مریدین اور ایک مرادین کی جماعت ہے۔

یہ فرما کر اب حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کیا ہے کہ نہ مولانا نظام الدین کی بے ادبی لازم آئے نہ کتاب وسنت کی۔ فرمایا کہ یہ شخص جس نے یہ درخواست کی تھی کہ اللہ کو خواب میں دیکھوں اس بارے میں مولانا نظام الدین نے پہچان لیا تھا کہ یہ مریدین میں سے نہیں ہے، مرادین میں سے ہے اگر یہ نماز ترک کرے گا۔ اس سے زبردستی پڑھوائیں گے۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں منتخب کیا جا چکا ہے، اس لئے تدبیر بتلائی کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ اس سے پڑھوائیں گے اور زیارت بھی ہو جائے گی۔ اب اس میں کتاب وسنت کی عظمت بھی اپنی جگہ قائم رہی اور اکابرین کی عظمت بھی قائم رہی۔

بلا تربیت وصحبت محقق نہیں ہوسکتا..... مگر اسے محقق سمجھے گا غیر محقق نہیں۔ غیر محقق یا مولانا نظام الدین کی توہین کرے گا یا کتاب وسنت کو ترک کر دے گا اور یہ دونوں راستے تباہی و بربادی کے ہیں۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان کی عظمت بھی اور کتاب اللہ کی عظمت بھی دل میں جاگزیں ہو۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تربیت ہو، محققین کی صحبت میسر ہو۔ اولیائے کاملین کی زیارت کے ساتھ ساتھ ان کا معالجہ نصیب ہو۔ تب آدمی کہیں محقق بنتا ہے۔ محض کتاب دیکھ لینے اور بزرگوں کا کلام سن لینے سے محقق نہیں بنتا جب تک کہ محنت کر کے تربیت نہ پائے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ

ماہ ہا بدید تا یک پنبہ دانہ بعد کشت ‏ ‏ ‏ ‏ جامہ گرد و شاہدے رایا شہیدے را کفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ ایک بنولے کا دانہ منوں مٹی کے اندر جائے۔ اپنی ہستی کو فنا کرے اس میں سے پودا پیدا ہو۔ اس میں سے روئی نکلے، اس سے لباس بنے پھر کہیں جا کے کسی محبوب کا لباس بنے اور دنیا اس کی قدر کرے۔ تو بنولہ کا دانہ اگر اپنی ہستی کو مٹا کر روئی کی صورت میں اپنے کو نہ پیش کرتا۔ نہ شہید کے لئے کفن میسّر آتا اور نہ محبوب کے لئے لباس اور کہتے ہیں کہ

قرنہا باید تا یک سنگ خاراز آفتاب ‏ ‏ ‏ ‏ لعل گرد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

قرنہا قرن کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک ٹکڑا آفتاب کی گرمی سہتے سہتے صدیوں میں جا کے لعل بدخشان بنے اور بازار میں لاکھوں روپے اس کی قیمت اٹھے۔ مگر جب تک وہ سنگِ خارا آفتاب کی گرمی اور آفتاب کی تپش کو نہیں سہے گا اور اپنے کو جلا کر پھونک نہیں دے گا لعل بدخشانی نہیں بنے گا۔ اور اسی طرح سے کہا ہے کہ

سالہا باید تا یک کود کے از درس علم ‏ ‏ ‏ ‏ عالمے گردد نکو ، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت ومحنت چاہئے کہ ایک نادان بچہ سات آٹھ برس میں جا کے عالم بنے یا شاعر شریں سخن بنے۔ گھر بیٹھے علم کی دولت نہیں ملتی۔ بلا محنت کے باتیں بنانے سے یہ مقام میسر نہیں آتا اپنی جان کو سوہان لگانی

پڑتی ہے، جان کو جلانا پڑتا ہے، تب جا کے وصل کا مقام میسر آتا ہے۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

باطن کے بادشاہ......اور۔

مبین حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

یہ ملاّ نے اور درویش بے چارے، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں گو سر پہ تاج نہیں ہے۔ یہ بادشاہ ہیں گو کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہوا نہیں ہے۔ مگر سلاطین ان کے آگے جھکے ہیں۔ یہ سلاطین کے آگے نہیں جھکے ان کو اللہ نے بڑی دولت دی ہے۔ جو باطن کی دولت ہے ظاہری دولت والے نہیں جانتے کہ انہیں کیا دولت میسر ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ محدث ہیں۔ جلیلُ القدر عالم اور امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ جب کوئی فقہ کا مسئلہ حاصل ہوتا تو بعض دفعہ وجد میں آ کے کہتے کہ "اَیْنَ اَبْنَآءُ الْمُلُوْکِ مِنْ ھٰذِہِ النِّعْمَۃِ" کہاں ہیں بادشاہ زادے کہ ہماری اس دولت کو دیکھیں اچھا ہوا کہ یہ اندھے ہیں اگر یہ اس دولت کو سمجھ لیتے تو شاید اس دولت کو چھیننے کے لئے تلواریں لے کر ہم سے جہاد کرتے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہیں اس لئے ہماری دولت محفوظ ہے۔ تو ایک باطنی دولت کے اور ایک ظاہری دولت کے بادشاہ ہیں۔ ظاہری دولت والے باطن والوں کے آگے جھکے ہیں۔ بشرطیکہ، ارباب باطن ہوں، ارباب بطن نہ ہوں۔ محض پیٹ کے بندے نہ ہوں کہ کھا پی لیں۔ ارباب باطن ہوں تو اربابِ ظاہر ان کے آگے جھکتے ہیں۔

اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے...... حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا روزانہ دونوں وقت ہجوم رہتا تھا۔ نواب میر خاں جو ریاست ٹونک کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی، میرے شیخ کے ہاں ہزار دو ہزار مہمان رہتے ہیں بڑی پریشانی رہتی ہوگی۔ شیخ کی کوئی جائداد نہیں اور تجارت و ملازمت نہیں ہے۔ بڑے پریشان رہتے ہوں گے کہ مہمانوں کو کہاں سے کھلاؤں تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک پورا ضلع جس کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تھی۔ پیتل کے پترے پر لکھ کر بھیجا کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تا کہ آپ کو مہمانوں کی مہمانی میں دشواری نہ ہو۔ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس پیتل کے پترے پر جواب لکھا۔ عجیب جواب تھا۔ لکھا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو نہیں کھونا چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے آسمان سے آ رہی ہے۔ تیرے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے حکومتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور حکومت والے پیش پیش ہیں۔

اسی مقام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ و رسول کا ہو جاتا ہے تو "اَتَتِ الدُّنْیَا

وَهِيَ رَاغِمَةٌ '' دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں میں آ کر پڑتی ہے، وہ ٹھکراتے ہیں اور وہ زبردستی قدموں میں گرتی ہے۔ دنیا کے بندے خود دنیا کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ ٹھوکریں مارتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک غنی بن کے کماتا ہے ایک محتاج بن کے کماتا ہے۔ اہل اللہ بھی کماتے ہیں مگر غنی بن کر۔ اہل دنیا بھی کماتے ہیں مگر محتاج و فقیر بن کر ایک فقیر الی اللہ ہے، ایک فقیر الی الدّنیا ہے۔ جو اللہ کا فقیر ہے دنیا سے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔

اس دنیا کا حاصل یہی ہے کہ آدمی پیٹ بھرلے، لباس سے تن ڈھانپے کون سا اللہ والا ہے جسے کھانے کو میسر نہیں؟ اب رہا یہ کہ انکے پاس بڑی کوٹھی بنگلہ نہیں۔ وہ چاہتے ہی کب ہیں کوٹھی بنگلے کو؟ وہ تو ایک جھاڑ کے نیچے گزر بسر کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔ یہ تو جب ہو جب وہ آپ کے بنگلوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ انہیں لالچی کہیں مگر انہیں کوئی لالچ نہیں۔

اہل اللہ تارک الدنیا ہیں...... حقیقت میں یہ لوگ تارک الدنیا ہیں کہ دنیا پر قابو پاتے ہیں اور پھر ترک کرتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں ہی دنیا نہ ہو اور وہ کہے کہ میں ترک کر رہا ہوں وہ متروک الدنیا ہے، تارک الدنیا نہیں ہے دنیا نے اسے ترک کر دیا۔ دل میں اس کے ہے کہ دنیا آئے مگر دنیا اس کو چھوڑ چکی۔ اسلام نے لوگوں کو تارک الدنیا بنایا ہے، متروک الدنیا نہیں بنایا۔ دنیا پر قابو پا کر، پھر اس کو ترک کرو۔ خواہ ہاتھ سے خواہ قلب سے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم دولت مندمت بنو اور بھک منگے بنو۔ مسلمان بھک منگا اور سائل بننے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا کو دینے کے لئے آیا ہے، دنیا سے مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کماؤ: ''كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ '' ① نیک اور پاک کمائی ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے اور اللہ اس میں برکت دے دے تو یہ نہیں کہ جا کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنے مصرف میں خرچ کرو، دولت مند بھی بنو۔ خدا اگر کروڑ پتی بنائے بن جاؤ اسے ضائع مت کرو۔ مگر قلب کا تعلق اس سے نہ رکھو۔ قلب کا تعلق اللہ سے رکھو، ہاتھ پیر کا دنیا سے رکھو۔ دنیا ترک نہیں کرائی کہ تم بھک منگے بن کے بیٹھ جاؤ۔ دنیا کو قلب سے ترک کرایا۔ ان کی شان یہ ہے کہ۔

دل بیار دست بکار

ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہو یہ اسلام کی تعلیم ہے نہ یہ کہ تم دنیا ترک کر کے پہاڑوں میں جا کے بیٹھ جاؤ اس کو رہبانیت فرمایا۔ اسلام میں گوشہ گیری نہیں دنیا کے اندر کماؤ بھی۔ چاہے خدا کروڑ پتی بنائے، اس کی قدر کرو اور اسے اپنے مصارف میں خرچ کرو۔ مگر دل کا تعلق اللہ سے ہو۔ اولیاء اللہ کا یہی کردار اور کیریکٹر تھا۔ یہی ہیں وہ علمائے دیوبند جو ان اکابر اولیاء اللہ کے جانشین ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ، مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے۔

---

① مشکوۃ المصابیح، کتاب البیوع ،باب الكسب وطلب الحلال، ج: ۲ ص: ۱۲۸ رقم: ۲۷۸۱. حدیث ضعیف ہے لیکن معناً درست ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں۔ دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۲ ص: ۴۹ .

حضرت عبداللہ ابن مبارک تقریباً دو ہزار اشرفی ہر وقت پاس رکھتے اور بعض دفعہ مجلس میں بیٹھ کر انہیں خوب اُچھالا کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت آپ یہ اشرفیاں اس طرح اچھال رہے ہیں؟ فرمایا: ''لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوكُ'' ① اگر یہ درہم اور دنانیر روپیہ پیسہ ہاتھ میں نہ ہو یہ بادشاہ زادے تو ہمیں ناک پوچھنے کا رومال بنالیں۔ ہم بتلا دیتے ہیں جو تمہیں میسر ہے، وہ ہمیں بھی میسر ہے ہم تمہارے محتاج نہیں۔ لیکن جو ہمیں میسر ہے وہ بقدرِ ضرورت بھی تمہیں میسر نہیں۔ تم ہر حالت میں محتاج ہو کہ ہم سے آ کر سیکھو۔

تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سائل و مفلس بنانا مقصود نہیں، غنی بنانا مقصود ہے۔ ''وَخَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ'' غنی اور امیری قلب کی امیری ہے۔ ہاتھ پیر میں چاہے لاکھوں روپے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بیٹھ کر ایک ایک دن کے اندر کئی کئی لاکھ روپے اپنے دست مبارک سے تقسیم کئے ہیں۔ تو یہ شان بتلائی گئی کہ دنیا قبضے میں بھی کرو۔ پھر قلب سے ترک کرو اور اگر دنیا ملتی نہیں اور کہا ہم تارک الدنیا ہیں، تو تارک الدنیا نہیں متروک الدنیا ہو دنیا نے تمہیں ترک کر رکھا ہے۔ جیسے نامرد اور عنین یوں کہے کہ میں بڑا پارسا ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ لوگ کہیں گے تجھ میں جانے کی طاقت کہاں ہے؟ تو کہاں سے متقی بن گیا۔ متقی وہ ہے کہ جانے کی طاقت ہے پھر بھی نہیں جاتا۔ اللہ کے خوف سے ڈرتا ہے نہ کہ نامرد ہونے کا نام متقی ہے۔ بہر حال تارک الدنیا وہ ہے کہ دنیا قبضے میں ہے پھر ترک کر رہا ہے۔ وہ تارکُ الدنیا نہیں کہ دنیا ہاتھ میں نہیں، للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے کہ میں تارک الدنیا ہوں۔

ادب و عظمت کے حامل کتاب اللہ کے سچے وارث ہیں...... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد ادب و تادب پر ہے، عظمت شریعت کا ادب، اولیاء اللہ اور علماء ربانی کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، مدارسِ دینی اور خانقاہوں کا ادب۔ ان سارے ادبوں پر دین کا مدار ہے۔ بے ادبی اور گستاخی میں آدمی کا دین نہیں بنتا۔

پھر ادب کے بعد اِتباع ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اجماعِ امت کا اِتباع اور اس ذوق کا اِتباع جس کے اوپر پوری امت کے صلحاء چل رہے ہیں اس سے الگ ہو کر خیال آرائی اور تخیل سے کوئی پگڈنڈی بنانا، اسلام نے ان سب کو رد کیا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین وہی ہے کہ نقل صحیح، ذوق سلیم کے ساتھ اِتباع اور ادب کے ساتھ اسے قبول کیا جائے اسی کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا کہ حق و باطل کا معیار یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ② ''اے پیغمبر! جو ہم نے آپ کی طرف کتاب کی وحی کی ہے۔ وہی ہے حق، وہی مصدق ہے۔ اس کی تصدیق اور تکذیب سے آدمی سچا اور جھوٹا سمجھا جائے گا''۔ اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے ایک جماعت کو اس کتاب اللہ کا وارث بنایا۔ کن لوگوں کو بنایا؟ جن کو ہم

① مشكوة المصابيح، كتاب الرقاق، باب استحباب المال و العمر للطاعة، الفصل الاول، ج:۳ ص:۱۴۷ رقم: ۵۲۹۱.
② پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآية: ۳۱. ③ پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآية: ۳۲.

نے منتخب اور پسند کیا تھا کہ ان میں سے ہمیں دین کا کام لینا ہے، اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وارثت تو باپ سے ہی ملتی ہے کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو، تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اجنبی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا، جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے، اس کا شیخ یہ۔ اس کا آگے شیخ وہ، سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو، تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے، وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ① ''پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا، جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا''۔

اب فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ ② بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے حیلے کر کے معنوی تحریف شروع کی فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ ③ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر ادھر نہیں ہٹتے، بٹیہ اختیار کر لی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ بھی نجات پائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ④ بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے، ہر حیثیت سے دین کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دین کی طاقت ہاتھ میں لے کر فراٹے بھر رہے ہیں وہ سابق خیرات ہیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگا دیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے، کوئی لپک رہا ہے، کوئی معمولی چال چل رہا ہے، کوئی اِدھر اُدھر ہٹ کر اس بٹیہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع و اقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنی میں کتاب اللہ کے وارث بنیں انہی معنی پر چلتے رہیں جو روایت ہو کر چلے آ رہے ہیں۔ جس میں سلف کا ذوق اور سلف کا تعامل شامل ہے اور جس میں وہ مذاق دینی شامل ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.

علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں معنی بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آ رہا ہے۔جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کی چار شانیں ہیں۔﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ﴾ ① اللہ کی آیتیں بامانت الفاظ آپ نے پہنچادیں۔﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② پھر تعلیم کے ذریعے ان کی مرادات ربانی بیان کیں۔﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ پھر عملی اُسوہ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا:﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ④ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔کجی نکال دی اور زیغ نکال دیا۔ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔نہ یہ کہ آدمی نے چند حرف دیکھ لئے۔کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔یہ چھچھورپن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔جس کا آدمی علم نہیں رکھتا اس میں کبھی رائے نہ دے۔مثلاً سنار کا کوئی مسئلہ آئے گا،اگر آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنار کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو۔آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھئی! میں لوہار نہیں۔اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ۔مگر جب دین کی بات آتی ہے تو لوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔اس میں رائے زنی کے لئے تیار ہیں۔گویا دین ایک کھلونا ہے۔جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔میرے پاس بھی وقت کم ہے،آپ کے پاس بھی۔اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ایک کسوٹی پیش کر دی۔اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پرکھتے رہیں اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے۔یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔وقت میں نے زیادہ لے لیا۔خود میں اتنی ہمت اور طاقت بھی نہیں تھی۔مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگایا ہو۔جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں۔بہر حال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہو۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم وعمل کی توفیق عطا فرمادے،صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔زیغ اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تخیلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے،جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آ رہی ہیں۔(آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ."

① پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲۔ ② پارہ:۲۸ سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲۔
③ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲۔ ④ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲۔

تسکین فطرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَـنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ:......

تین فطری سوال...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے میرے ایک عزیز نے چند سوالات نقل کئے جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور اس آنے اور جانے کے درمیان ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ جب تک ان تینوں سوالوں کا جواب شفا بخش طریقے سے نہیں مل جاتا۔ انسان میں بے چینی رہتی ہے سکون قلب پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین سوال جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت جو ہمارے محترم قاری صاحب نے رکوع تلاوت کیا۔ ان تینوں سوالات کا جواب اس رکوع کے اندر موجود ہے۔ تو فرق اتنا ہوگیا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے بعد میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا ہوگیا (۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) کہ پہلے جواب پڑھا گیا بعد میں سوال کیا گیا۔

یہ جو پورا رکوع ہمارے محترم قاری صاحب نے پڑھا ہے، یہ دس احکام پر مشتمل ہے۔ دس ہدایتیں اس میں حق تعالیٰ نے دی ہیں اور پھر ایک ایک ہدایت بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ تو مجموعے کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصولاً اس میں دس باتیں بیان کی گئی ہیں اور وہ دس باتیں انہی سوالات کے جوابات ہیں کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ کس کی رضا مندی اور کس کو خوش کرنے کے لئے ہم زندگی گزاریں اور وہ مبدا کیا ہے جس سے ہماری ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ تو اسی رکوع میں انجام بھی بتا دیا گیا ہے۔

غرض مذہب کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ ایک مبدا، ایک معاد، ایک میعاد۔ مبدا کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء کہاں سے ہوئی۔ معاد کا مطلب یہ کہ لوٹ کر کہاں جانا ہے۔ میعاد کا مطلب یہ کہ درمیان میں کس طرح زندگی گزاری

جائے۔تو اس رکوع میں مبدا کا بھی ذکر ہے کہ وہ کون سی ذات ہے جو تمہاری اصل ہے۔معاد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارا انجام کیا ہونا ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ درمیان کی زندگی کس طرح گزارنی ہے۔اس لئے اس وقت کسی تقریر کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفسیر کی ضرورت ہے کہ اس رکوع کی تفسیر کردی جائے۔ترجمہ وشرح میں تقریر بھی ہو جائے گی۔

اِنسان کا مبدا کیا ہے؟......تو ابتدا یہاں سے کی گئی ہے کہ ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ① برکت والی وہ ذات ہے جس نے آسمان میں برج قائم کئے،منزلیں قائم کیں اور ان منزلوں میں سے سورج اور چاند کو گزارا،جس سے رات اور دن پیدا ہونے لگے،موسم بننے لگے، سردی گرمی اور برسات آنے لگی۔یہ گویا مبدا کا ذکر ہے کہ اصل ابتداء جس ذات سے ہے۔اس کی قدرت آسمانوں،زمین میں کام کر رہی ہے۔آسمان بنادیئے،چاند،سورج پیدا کر دیئے اور ان میں حرکت پیدا کردی۔

رحمان کے بندوں کی چال......اس کے بعد دس احکام شروع کئے کہ اس کی رضا کے لئے کس طرح زندگی گزاری جائے ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کا دنیا میں کیا ڈھنگ ہونا چاہئے؟

رحمٰن لغت میں اور شریعت میں بھی اس ذات کو کہتے ہیں جو ساری نعمتوں کا مالک ہو۔ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں دینے پر قادر ہو۔ہر نعمت اس کے قبضے میں ہو۔ساری نعمتوں کا والی،وارث اور مالک ہو۔تو اس رحمٰن کے بندے کس طرح سے دنیا میں زندگی بسر کریں۔فرمایا،رحمٰن کے بندوں کا ڈھنگ یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ زمین میں چلیں تو نرم چال چلیں۔اس میں ہدایت دی گئی کہ زندگی کی بنیاد تواضع اور خاکساری پر رکھی جائے۔کبر و نخوت پر نہ رکھی جائے۔تکبّر اور اپنے کو بڑا بنانا یہ نہیں بلکہ چال سے واضح ہو کہ کوئی خدا کا بندہ جا رہا ہے۔یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی جبار قہار جا رہا ہے۔انسان کی شان نہیں ہے اور انسان کی شان یہ کیوں نہیں ہے؟

اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ: ”کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ“ ③ ”تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے“۔مٹی کا یہ کام نہیں ہے کہ اچھل اچھل کر اوپر جائے یہ جب تک پست اور پامال رہے گی جبھی تک اس کی قدر ہوگی۔مٹی جوتوں میں روندی جاتی ہے مگر چوں نہیں کرتی۔جبھی تک اس کی قدر ہے کہ جس طرح ہم تصرف کریں بلا چون و چرا اس تصرف کو قبول کرے،اگر مٹی اوپر اڑی،کسی کی آنکھ میں پڑی،وہ لعنت کرے گا۔کسی کے کپڑے پر گرے گی وہ کپڑے کو جھٹک دے گا۔کہے گا کہ کمبخت گرد کہاں سے آ گئی تو مٹی نے ذرا ابھرنے کا نام لیا تو اس پر لعنتیں برسنا شروع ہو گئیں۔

---

① پارہ:۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ:۶۱۔ ② پارہ:۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ:۶۳۔ ③ مسند بزار،ج:۷ ص:۴۲۱ رقم:۲۵۵۱۔حدیث حسن ہے،دیکھئے:صحیح وضعیف الجامع ج:۷ ص:۱۱۵ رقم:۲۶۶۸۔

تو جس مٹی سے انسان پیدا کیا گیا، اگر وہ اینٹھنے لگے، غرور کرنے لگے، کبر ونخوت اختیار کرنے لگے۔ ہر شخص اس انسان کو برا کہے گا اور جو تواضع وخاکساری اختیار کرے اور مٹی بن کر رہے، سب اس کو سر پر بٹھائیں گے کہ یہ بڑی کیمیا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی مجلس میں جو بڑا بول بولتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ وہیں اس کو سزا مل جاتی ہے اور جو تواضع کا کلمہ بولتا ہے، سب اس کی قدر کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی عادتِ کریمہ بھی یہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی بندہ عبادت کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! میرے سے کچھ نہیں بن پایا۔ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ تیرا فضل ہے کہ یہ کام تو نے مجھ سے کرادیا۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ شانہٗ فوراً فرماتے ہیں کہ نہیں عمل تو نے ہی کیا تھا۔ مسجد کی طرف چل کر تو ہی گیا تھا۔ حج کے لئے بیت اللہ کی طرف تو نے ہی سفر کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کیا اور اگر کوئی کبر ونخوت سے یوں کہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے عبادت کی، میں نے یہ کام کیا۔ فرماتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا بدن، روح اور طاقت ہم نے دی۔ تو نے کیا کیا؟ جو خود دعوے کرتا ہے اسے پست کر دیتے ہیں اور جو دعویٰ چھوڑ کر کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے فرماتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا۔ اس لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جو آدمی خاکساری برتے، عجز و نیاز برتے، بندگی کی شان سے آئے۔ اسے اونچا اٹھاتے ہیں، اسے عزت دیتے ہیں اور جو خود ابھرنے لگے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ۔

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست   اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تو انسان کی فطرت یہی بنائی گئی کہ تیرے سامنے مٹی ہے۔ اگر وہ ابھرتی ہے تو لعنت بھیجتا ہے۔ یہ جوتیوں کے نیچے رہتی ہے تو تو عزت کرتا ہے۔ تو جس چیز سے تو بنا ہے تیرا مزاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جتنی تو خاکساری برتے گا تیری عزت ہوگی۔ جتنا تو غرور کرے گا، اتنا ہی تجھے پست کر دیا جائے گا۔ تو پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ رحمٰن کے بندوں کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔ جب گھر سے باہر نکلیں اور چلیں تو زمین پر ہلکی چال چلیں نخوت وکبر کی چال نہ چلیں اس کو دوسرے موقع پر قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ ① اپنی چال میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور زیادہ زور سے چلا کر مت بولو حسبِ ضرورت آواز بلند کرو۔ بہت زیادہ شور مچا کر بولنا، کبر ونخوت کی علامت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کی آواز ہی خلقۃً بلند ہو، وہ دوسری بات ہے۔ لیکن ارادہ کر کے آدمی چلائے، یہ سمجھ کر کہ دوسرے کے اوپر میری آواز کا دباؤ پڑے یہ ممنوع ہے۔ بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ آواز بلند کرے۔ تو بولنے اور چلنے دونوں میں اعتدال ہونا چاہئے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کا جو نقشہ حدیث میں آتا ہے کہ "اذا مشی تکفأ کأنما ینحط من صبب" ① آپ اس طرح چلتے تھے کہ عجیب شان تھی۔ اس طرح کہ گردن تو جھکی ہوئی جس کو خاکساری کی چال کہتے ہیں۔ مگر ساتھ میں قوت اتنی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا زمین کو کھود کر اندر گھس جائیں گے۔ اتنی قوت سے قدم پڑتا تھا۔ تو قوت بھی ہو، شجاعت بھی ہو اور خاکساروں کی طرح نیاز مندی بھی ہو، وقار بھی اور تواضع بھی ہو۔ نہ بیماروں کی چال چلے جیسے کوئی مریض جا رہا ہے کہ ذرا کوئی تھپڑ مار دے تو گر پڑے، یہ بھی نہیں اور نہ ابھر کر چلے جیسے کوئی متکبر جا رہا ہے۔ بیچ کی چال ہو کہ اس سے خودداری اور خاکساری بھی ٹپکے ﴿یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ چلے، بلکہ یہ کہ تواضع سے چلے چاہے تیز چلے گویا یہ پہلا نقشہ بتلایا گیا کہ جب گھر سے نکلو تو ایسی چال چلو۔ اس لئے کہ مسلمان بے فکرا نہیں پیدا کیا گیا کہ جس طرح اس کا جی چاہے چل پڑے۔ قدموں پر نگاہ ہونی چاہئے کہ یہ کس طرح سے چلیں اس لئے کہ مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔

قران کریم میں فرمایا گیا: ﴿مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا﴾ ③ تم تین آدمی تنہائی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ سرگوشی کرو گے تو چوتھا خدا وہاں موجود ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ تمہاری باتوں کا سننے والا کوئی نہیں۔ تم چار ہو گے پانچواں خدا ہوگا۔ تو زیادہ ہو گے تب خدا موجود، کم ہو گے تب خدا موجود۔ جب اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہے تو آدمی کو ہر جگہ ادب سے چلنا پڑے گا۔ بے ادبی وہ کرے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسجد میں خدا ہے اس لئے میں ادب کرتا ہوں اور سڑک پر گویا خدا نہیں تو میرا جی جس طرح چاہے چلوں۔ یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے۔ ہر جگہ کے مناسب ادب ہوگا اور عجز و نیاز مندی اختیار کی جائے گی۔ تو زندگی گزارنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں قدم قدم پر نگاہ رکھیں کہ ہماری چال ڈھال کیا ہے۔

رحمٰن کے بندوں کا قال ...... اس کے بعد آگے فرمایا، چلتے چلتے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تو اس میں اچھے بھی ملتے ہیں اور برے بھی بعضے تو ایسے ملتے ہیں جو بڑے مہذب اور شائستہ ہیں۔ آپ نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا، آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا، محبت بڑھ گئی۔ اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جو جھگڑے اور فساد کی بات اٹھاتے ہیں کہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ لیا یا کسی پر پھبتی کس دی۔ ایسے موقع پر ہماری رفتار کیا ہونی چاہئے اس پر فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ ④ "اگر جاہل ملیں اور جاہلانہ حرکتیں کریں تو تم ان کے ساتھ جاہل مت بنو"۔ تم سلام کہو۔ یعنی جب وہ جاہلانہ بات کریں۔ بس ان سے کہہ دو کہ بھئی!

---

① الجامع للترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی صفة النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۲ ص: ۸۹.

② پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳. ③ پارہ: ۲۸، سورة المجادلة، الآیة: ۷. ④ پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳.

ہمارا اسلام ہم یہ باتیں نہیں جانتے تمہارے لئے بھی زیبا نہیں، ہمارے لئے بھی اور اگر آپ بھی جھگڑے میں لگ گئے تو وہاں اچھی خاصی لاٹھی چل جائے گی۔ جھگڑا اٹھ جائے گا اور جھگڑا اٹھانا بہت آسان ہے۔ مگر اس کا مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے صبر و تحمل کرنا پڑتا ہے۔ تو فرمایا گیا جب چلو تو چال میں نرمی پیدا کرو۔ نرم چال رکھو کہ ہر ایک آدمی محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ جھگڑا جب کرے گا جب آپ متکبرانہ انداز سے جائیں اور جب تواضع سے گئے تو اول تو سب عزت کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بے وقوف آدمی مل جائے اور جاہلانہ باتیں کرے، تو آپ کہیں گے: قَالُوْا سَلٰمًا بھئی! ہم یہ بات نہیں جانتے، ہمارا اسلام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔

سلام کی برکات اور آداب...... اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ایک ایسی عظیم چیز ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سلام آدمی نہ کرے تو برا سمجھا جاتا ہے اور اگر سلام کر لے تو جاہل بھی ہوں گے، وہ بھی جھک جائیں گے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے سلام کر رہا ہے۔ اس واسطے فرمایا گیا اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں، عداوتیں بھی ہوں۔ اگر دشمن کو آپ سلام کریں گے دشمنیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ ''وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ'' کہنے پر مجبور ہوگا۔ جس کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے بھی سلامتی ہو۔ جب سلامتی کی دعا دے گا تو جھگڑا اٹھائے گا کیوں؟ خود کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ تو دعا بھی دے اور اوپر سے جھگڑا بھی اٹھائے؟ اس سلام نے ساری دشمنی ختم کر دی۔

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ''تقرأ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ'' ① ''سلام کرنے کی عادت ڈالو، خواہ تعارف ہو یا نہ ہو'' ۔ آج کے زمانہ کا تمدن یہ ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرائے نہ بول نہ چال نہ سلام نہ کلام۔ یہ متکبرانہ تمدن ہے۔ یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے۔ اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم میں اور تم میں اسلام کا رشتہ مشترک ہے، اسلامی اخوت اور بھائی بندی پھیلی ہوئی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے۔ پہلے سے ہی تعارف حاصل ہے۔ یہ ہمارا بھائی مسلمان ہے۔ اس میں اسلام بھرا ہوا ہے۔

ہمارا تعارف بھی اسے حاصل ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں جب دونوں کے اندر ایک رشتہ مشترک ہے، پھر تیسرے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تعارف کرائے۔ اگر گھر میں دو حقیقی بھائی موجود ہوں وہ دونوں یوں کہیں کہ کوئی تیسرا محلے والا آ کر تعارف کرائے کہ یہ آپ کے حقیقی بھائی ہیں اور یہ آپ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ تب ہم کلام کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری رشتہ داری ہے۔ مجھے کیا مصیبت ہے کہ میں تیسرے آدمی کو بلاؤں کہ بھئی! میرا تعارف کرا دو۔ یہ تکلف اور بناوٹ ہے تو نسبتی رشتے سے زیادہ قومی رشتہ اسلام کا ہے۔ دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے۔ جتنے دینی رشتہ کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کوئی چوتھا تیسرا آدمی تعارف کرائے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام، ج: ۱ ص: ۱۹۔

ہاں البتہ اس زمانے ایک مصیبت پڑگئی کہ ہم صورت سے یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں؟ بعض اوقات سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔لیکن سوچتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے۔ یہ مصیبت آ کے پڑگئی اس سے معلوم ہوا کہ ہیئت اور وضع بھی ایسی ہو جس سے دور سے سمجھ لیا جائے کہ مسلمان آ رہا ہے تا کہ سلام و کلام کی نوبت آ جائے۔

بہر حال اس حدیث میں ہدایت کی گئی کہ پہچان پہچان کر سلام نہ کرو۔اس واسطے کہ تعارف کرانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ہوا۔اس کا تو تعارف ہو گیا اور اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی آئے تو اس کا کوئی تعارف نہیں کراتا۔گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہو گا چھوٹے کو نہیں ہو گا، یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منہ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر سوار جا رہا ہو اور لوگ سڑک پر سامنے بیٹھے ہوں۔تو سوار ہونے والے کا فرض ہے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سلام کرے۔اپنے اندر خاکساری پیدا کرے۔ایسی صورت نہ پیدا ہونے دے جس میں یہ انتظار ہو کہ یہ مجھے سلام کریں۔کیونکہ یہ میرے سے چھوٹے ہیں یہ چھوٹائی بڑائی کہاں کی؟ آدمی خود ہی چھوٹا ہے۔بڑا اللہ ہے۔سب سے بڑی ذات وہ ہے۔اس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔اس لئے ہر شخص یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں اور وہ بڑا ہے جب یہ سمجھے گا تو سلام کی ابتداء کرنے کی کوشش کرے گا۔اس لئے سلام کے آداب میں سے یہ ہے کہ جب دو آدمی ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کہے کوشش کرے کہ پہلے میں سلام کہوں۔یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے کہ دوسرا مجھے سلام کرے۔اسی کو فرمایا گیا: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ① رحمٰن کے بندے جب چلیں تو خاکساری کی چال چلیں اور جب لوگوں سے ملیں تو سلام کی عادت ڈالیں۔اگر نیک لوگ ہیں تو سلامتی کی دعا ہو گی۔اگر برے اور جھگڑالو لوگ ہیں۔تو یہ سلام رخصت کا ہو گا کہ بھئی! ہمارا سلام ہم جاتے ہیں۔ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔تو سلام ہر صورت میں انسان کے لئے لازم رہا۔

پھر یہ اتنی پاکیزہ چیز ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ''**لاتسلموا تسليم اليهود والنصارى فان تسليمهم بالاكف والرؤس والاشارة**'' ② یہودیوں کا سلام انگلیوں سے ہے، نصاریٰ کا سلام ہتھیلی سے ہے اور مسلمانوں کا سلام ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ'' ہے۔تو یہود و نصاریٰ کا سلام اشارہ محض ہیں اور مسلمانوں کا سلام ایک مستقل دعا ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں، برکتیں تم پر نازل ہوں۔ہر مسلمان جو دوسرے کو دعا دے۔اس سے اس کی خیر خواہی اور محبت ظاہر ہو گی۔تعلق بھی مضبوط ہو جائے گا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳. ② الجامع للترمذی، کتاب الاستئذان والآداب، باب ماجاء فی کراھیۃ اشارۃ الید بالسلام ج: ۹ ص: ۳۱۷.

وہ مثل مشہور ہے کہ کسی آدمی کے سامنے کوئی جن آ گیا۔ تو اسے خطرہ لاحق ہو گیا کہ یہ تو کھا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ماموں جان! سلام۔ اس نے کہا بھانجے وعلیکم السلام اور کہا کہ میرا ارادہ تجھے کھانے کا تھا۔ لیکن تو نے ماموں کہا اور سلام کہا۔ میرے دل میں رحم آ گیا۔ میں نے چھوڑ دیا اب تو آزاد ہے جہاں چاہے چلا جا۔ تو سلام نے جان بچائی یہی صورت دشمن کی بھی ہے۔ اگر کسی سے پکی دشمنی ہے اور آپ کہیں السلام علیکم وہ پسیج جائے گا دشمنی ڈھیلی پڑ جائے گی تو یہ بہت بڑی نعمت اور عظیم دعا ہے۔

تو زندگی گزارنے کے طریقے میں پہلی چیز چال ہے دوسری چیز قال ہے کہ قال میں دعا ہو، چال میں تواضع ہو اور جھگڑالوؤں سے بھی جب کلام کرو، سلام کے ساتھ کرو کہ ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① ہمارا سلام ہو، ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔ گویا اسلامی شریعت نے رہن سہن کے لئے ابتدائی دو چیزیں بتلائیں۔ ایک زبان کو قابو میں رکھو، دوسرے قدم کو قابو میں رکھو۔ بے ڈھنگا چلو بھی مت اور کلام بھی مت کرو۔

رحمٰن کے بندوں کی تنہائی...... یہ تو لوگوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اب آگے اور چلے تو آ گئی مسجد۔ یا تنہائی آ گئی یا رات کا وقت آ گیا جس میں لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں، پھر کیا کرے آگے اس کی ہدایت دی ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ رات گزارتے ہیں تو سجود اور قیام کے ساتھ گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام اور رکوع میں ہیں، اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ گویا مخلوق کے آگے مہذب بن کر آتے ہیں اور خدا کے سامنے عابد بن کر آتے ہیں، یہاں عبادت کی ضرورت ہے، وہاں شفقت کی ضرورت ہے۔ شفقت کا اثر یہ ہے کہ سلام کرے اور عبادت کا اثر یہ ہے کہ سجدہ و رکوع کرے۔ ناک اور پیشانی کو اللہ کے سامنے سجدے میں رگڑے۔

یہ گویا جانی عبادت بتلائی گئی کہ جب تم اپنے گھر میں آؤ۔ یعنی مسجد میں تو سبھی عبادت کرتے ہیں، اس کو تو ساری دنیا جانتی ہے ہے۔ لیکن اگر گھر میں مبیت (رات گزارنے) کے لئے آؤ۔ مبیت کہتے ہیں رات گزارنے کو۔ رات گزارنے میں ہر انسان تنہا ہوتا ہے جب سو گیا تو وہ تن تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جاگتا ہوا ہو گا، مجلس کرے گا۔ دوستوں میں بیٹھے گا، باتیں بھی کرے گا اور جب سو گیا تو ایک لاکھ آدمی اگر ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں، ہر ایک ان میں سے تن تنہا ہے۔ اس وقت ہر ایک کا سابقہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بندوں کے ساتھ نہیں۔ اس واسطے اس موقع کا ادب بتلایا کہ جب تم تن تنہا ہو اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس وقت سجود و قیام اور طاعت و عبادت کو اپنا شیوہ بنا لو تاکہ تمہاری بندگی نمایاں ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں کہ "ثَلٰثُ دَرَجَاتٍ" تین چیزیں ہیں جن سے انسان کے

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۵.

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۴.

درجات بلند ہوتے ہیں۔ عنداللہ بھی اس کا رتبہ اونچا ہے اور خلقت کے نزدیک بھی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ ''اِفْشَآءُ السَّلَامِ وَ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلٰوۃُ بِالَّیْلِ وَ النَّاسُ نِیَامٌ'' ① سب سے پہلی چیز افشاء السلام ہے۔ یعنی مخلوق کو سلام کرنا ہے۔ اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اتنی بلندی کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہوگا اسے اللہ جانے یا بندہ آخرت میں جانے گا۔ دنیا میں یہ ہے کہ کثرت سلام سے لوگوں کے دلوں میں عزت و وقار پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز فرمائی: ''اِطْعَامُ الطَّعَامِ...... '' حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔ اس میں مسکین، غریب، سائل، مسافر، مہمان سبھی آتے ہیں۔ کھانا کھلانا سب کے لئے عام ہے۔ یعنی حقوق قائم کر دیئے گویا یہ فرمایا گیا کہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ خواہ کوئی سائل بن کر آئے یا مہمان بن کر آئے یا ان میں سے کوئی نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ فلاں حاجت مند ہے۔ از خود آپ اس کو کھانا کھلائیں۔ اس سے بھی درجات بلند ہوتے ہیں۔

تیسری چیز رات کو نماز پڑھنا، جب کہ دنیا پڑی سو رہی ہو۔ اس لئے کہ یہ نماز انتہائی خلوص کی ہوگی۔ نہ اس میں نام و نمود کا جذبہ ہوگا نہ ریاء و شہرت پسندی کا جذبہ ہوگا نہ لوگوں کو دکھلاوے کے لئے ہوگی۔ دکھلاوے بھی کس کو؟ سب تو سو رہے ہیں، لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔ اس وقت جو نماز پڑھتا ہے تو بجز اس کے کہ اللہ ہی کی محبت اس کو اٹھا کر جگائے اور کچھ نہیں۔ علماء لکھتے ہیں کہ جس کو بھی جو کچھ ملا ہے وہ رات کی نماز سے ملا ہے۔ دنیا بھی ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ آخرت بنی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا﴾ ② سکون و آرام کا وقت وہ رات ہی کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تہجد آداب صالحین میں سے ہے کیونکہ دن میں ریا کاری اور دکھلاوے کا وہم ہو سکتا ہے۔ رات کی نماز میں دکھلاوے اور ریا کاری کا کوئی دخل نہیں۔ غرض جس کو جو ملا وہ رات کی نماز سے ملا۔

حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ کو ہنسی آتی ہیں جیسی ہنسی اس کی شان کے مناسب ہے۔ یہ ایسی ہنسی نہیں جیسے ہم اور آپ ہنستے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جسم سے پاک ہے مگر ہماری جسمانی ہنسی کی حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خوشی پیدا ہو جب ہنسی آتی ہے۔ غم دل میں بھرا ہوا ہو تو کون ہنسا کرتا ہے۔ تو رونا غم کی اور ہنسنا خوشی کی علامت ہے۔ غرض خوشی ایک کیفیت ہے۔ اسے ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے ہنسی رکھ دی چونکہ ہمارے پاس بدن ہے۔ تو جب اندر خوشی ہے تو باہر بدن پر ہنسی آتی ہے۔ حق تعالیٰ چونکہ بدن و صورت سے پاک ہیں۔ اس لئے جب اس کو بیان کریں گے تو کہیں گے، ہنسی درست ہے مگر ہنسی کا وہ مطلب نہیں ہوگا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

تو حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ ایک میدان حج میں جب ننگے سر، ننگے پاؤں، گرد پڑا ہوا، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خوشبو اور نہ زینت اور لبیک لبیک کہتے ہوئے بندے پھر

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ ج: ۱۹ ص: ۲۵۲ رقم: ۵۷۶۷.

② پارہ: ۲۹، سورۃ المزمل، الآیۃ: ۶.

رہے ہیں۔حق تعالیٰ کواس موقع پرہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کو ان کے گھروں سے نکال کرلائی ہے۔ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑا۔ آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح سے بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ یہ میری محبت میں گھروبار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں کریم ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ گھربار چھوڑ دیں اور میں توجہ نہ کروں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی تو خوش ہوکر مغفرت فرماتے ہیں۔اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری ہنسی کب آتی ہے؟ جب مکبّر تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کے آرہے ہیں کہ صف اول میں جگہ ملے۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے گویا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں۔ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں، یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہو جائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔اس سے خوش ہوکر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

اور تیسرا موقع کون سا ہے؟ فرمایا گیا کہ خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تہجد پڑھوں۔اس نے بیوی کے منہ کے اوپر پانی کا چھینٹا مارا وہ ہڑ بڑا کے اٹھی اس نے کہا کیا مصیبت آئی ہے۔خاوند نے کہا دو رکعت نفل پڑھ لے تہجد کا وقت ہے حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے۔آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی ایک دم گھبرا کے اٹھی کہ بارش تو نہیں آ گئی۔خاوند نے کہا۔بارش تو نہیں مگر دو رکعت پڑھ لے تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی۔اس نے بھی کھڑے ہو کے دو رکعتیں پڑھیں یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑ بڑا کے اٹھا تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ کی انتہائی رضا کا وقت ہے۔اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔

تو یہ جو فرمایا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ① کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ رکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں۔اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو میں بڑا عابد زاہد ہوں۔کسی کو دکھلانے کے لئے یہ نہیں اٹھا۔ یہ صرف مجھے دکھلانے اور میری رضا کیلئے اٹھا ہے۔ میں کریم ہوں۔ میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔اب گویا تین باتیں ہوئیں گھر سے نکلو تو تواضع کی چال چلو، قال ہو تو سلامتی کا کلمہ ہو، بُرے کلمات نہ ہوں، جاہلانہ باتیں نہ ہوں اور رات گزارو تنہائی میں جب کہ کسی انسان سے سابقہ نہیں، تو سجود و قیام اور اللہ کے ذکر و اطاعت کرو۔

① پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآية: ۶۴.

رحمٰن کے بندوں کی زبان سے عبادت...... یہ تو عمل ہے کہ قیام کرلیا، سجدہ کرلیا اور قلب کے جذبات کیا ہونے چاہئیں؟ ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ﴾ ① دل میں خوف بھرا ہوا ہو، زبان پر اس کو ادا کرے اور یہ دعا کرے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب ہٹا دے اس کو ہمارے سے دور رکھ۔ ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ② اس لئے کہ یہ عذاب گلے کا ہار ہے۔ جب لٹک جائے گا تو اس کا جدا ہونا مشکل ہوگا۔ کسی کے بس میں نہیں ہوگا کہ اس عذاب کو دور کرے۔ اللہ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ آخرت تو آخرت دنیا میں بھی حق تعالیٰ اگر کسی کو عیاذاً باللہ مبتلا کردیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں ملتی۔ جب تک اللہ ہی پناہ نہ دے کسی قوم کو گھیرے تو چاروں طرف سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے اللہ ہی پناہ دے اور مخرج پیدا کردے اور آخرت میں تو اسباب کا ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو سارا کارخانہ مسبّبُ الْاَسباب کا ہے۔ اس لئے بڑا ڈر وہاں کا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اگر آدمی مبتلا ہو جائے تو کم سے کم خیال تو باندھ لے گا کہ شاید کل کو چھٹکارا ہو جائے، شاید پرسوں کو وہاں تو خیال پر بھی پابندی ہوگی کہ راحت کا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو انتہائی قید و بند ہے کہ دل بھی گرفتار، زبان بھی گرفتار، ہاتھ پیر بھی گرفتار کوئی پناہ کی جگہ نہیں یہ ہے عذاب جہنم۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم ایک تو بدن سے عمل کرو۔ یعنی سجود اور قیام کرو اور ایک زبان سے یہ دعا پڑھو۔ ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ③

غرض پہلے قدموں کو لیا کہ انہیں ٹھیک ڈالو کہ چال درست ہو۔ پھر بدن کو لیا کہ سجدے اور قیام میں لگو۔ پھر زبان کو لیا کہ سلامتی کی بات کرو۔ اللہ سے دعائیں کرو ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ ④ اس لئے کہ جہنم جسے کہتے ہیں وہ بدترین ٹھکانا ہے اللہ اس سے پناہ دے اور نجات عطا فرما دے۔ اب گویا قول، بدن اور قدم کی سب عبادتیں آ گئیں۔

مالیات کے سلسلہ میں رحمٰن کے بندوں کی شان...... اب اس سے آگے انسان کے وسائل اور اسباب ہیں جن کو مالیات کہتے ہیں۔ نقد، سامان، گھر بار یہ سب اموال کہلاتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا سامان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جان اور بدن سے عبادت کریں مال سے نہ کریں، مال اسی کی چیز ہے اس نے ہمیں دیا۔ یہ اس کا فضل ہے مگر اصل مالک وہ ہے۔ تو فرمایا جب بدن سے فارغ ہو گئے۔ بدن کا، قدموں کا، زبان، ہاتھ، پیر اور سونے جاگنے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا۔ اب ایک چیز رہ جاتی ہے جو مالیات ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ ⑤ رحمٰن کے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۶۔
⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۷۔

بندوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ ان کو مال و دولت دے تو وہ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ تو بخیل بنیں کہ ایک پائی بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلے نہ فضول خرچ کریں کہ بے جا اپنی دولت خرچ کر کے محض اپنے نفس کی راحتوں میں گنوا دیں۔ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ اسراف کریں نہ تقتیر کریں۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں۔ ''تَقْتِیر' اِمساک'' اور ''بخل'' کو کہتے ہیں۔ جس طرح اور جگہ فرمایا گیا ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴾ ① نہ تو اپنے ہاتھ کو اتنا سکیڑو کہ تمہارا ہاتھ مونڈھے کو لگ جائے کہ دینے کے لئے کچھ نہیں اور نہ اتنا پھیلاؤ کہ جو کچھ ہے سب دے ڈالو کل کو بھیک مانگنے لگو۔ دونوں چیزیں ممنوع ہیں۔ درمیانی چال یہ ہے کہ دو بھی اور نہ بھی دو۔ یعنی یہ پہچان کر کہاں دینا جائز ہے کہاں ناجائز ہے۔ کہاں موزوں ہے کہاں ناموزوں ہے کہاں دینا حق ہے۔ کہاں دینا ناحق ہے۔ لہو و لعب' کھیل تماشے میں مت دو۔ وہاں بخیل بن جاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اگر عمل خیر ہو یہاں دینا بہتر ہے جب آدمی اعتدال کے ساتھ خرچ کرے گا تو حدود معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کہاں خرچ کروں کہاں نہ کروں؟

اسلام کا اصول ہی اعتدال ہے، عمل میں بھی اعتدال ہو۔ چنانچہ یہ اسراف ہے کہ آدمی نفل پڑھنے پر آئے تو ساری رات پڑھتا رہے اور جب چھوڑ کے بھاگے تو فرضوں کی بھی خیر نہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں، عبادت کرے، نفل پڑھے۔ مگر اس طرح کہ پھر عمر بھر اس کو نبھائے۔ اسی کو فرمایا گیا: ''خَيْرُ الْأُمُوْرِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ ② آدمی کا بہترین عمل وہ ہے، جس پر وہ ہیشگی کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ ''نہ دوڑ کے چلے نہ اکھڑ کے گرے'' چلے تو آدمیوں کی طرح چلے۔ نہ دوڑے نہ بالکل ضعیف بن جائے بیچ کی چال چلے۔ اسی کو فرمایا گیا کہ نفل، تلاوت، ذکر کرنے میں اعتدال ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ ایک قرآن روز ختم کیا کروں؟ فرمایا: ہرگز نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا کم کرو، عرض کیا: یا رسول اللہ! دو دن میں ایک ختم کر لیا کروں گا؟ فرمایا: نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ دس پارے روز پڑھوں اور ہر تیسرے دن ختم کروں؟ فرمایا: نہیں! نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے زیادہ خوشی سے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ مگر جب اصرار دیکھا تو فرمایا اچھا۔ عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب میرا بڑھاپے کا زمانہ آیا۔ اب مجھے قدر ہوگئی کہ پانچ پارے روز بھی نہیں پڑھ سکتا تھا تو میں کہتا تھا کہ اگر میں روز کا ایک قرآن شریف شروع کر دیتا۔ تو چھوڑتے بن پڑتی اور محرومی اختیار کرتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی سچی بات فرمائی تھی۔ کیسی پاک نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی منشاء نہیں تھا کہ پانچ پارے روزانہ پڑھوں مقصد نبھانا تھا۔ اب ان پانچ کا نبھانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے آدمی کام اتنا کرے جو نبھ سکے۔ ③

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹۔ ② الحدیث اخرجہ الامام الترمذی ولفظہ: کان احب العمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مادیم علیہ، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحۃ، ج: ۱۰، ص: ۷۸، رقم: ۲۷۸۳۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان تفاضل الاسلام... ج: ۱ ص: ۱۴۷۔

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرّہ ہیں، یہ مسجدِ نبوی میں عبادت کیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے دیکھا کہ چھت میں ایک رسّی لٹک رہی ہے۔ فرمایا: یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا گیا کہ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہیں، اونگھ آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا لے کر بیٹھتی ہیں، پھر عبادت کرنے لگتی ہیں۔ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے پڑ کے سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو بشاشت ہو۔ پھر اللہ کو یاد کرو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ نیند آرہی ہے، اونگھ آرہی ہے۔ کہیں رسی کی آڑ، کہیں دیوار کی آڑ۔ اس تصنع اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ اتنا کام کرو جتنا نبھ جائے۔ تو اقتصاد یعنی عمل میں میانہ روی یہ معتبر ہے۔ خواہ جان کے خرچ کرنے کا عمل ہو یا مال کے خرچ کرنے کا، اعتدال ہونا چاہئے۔

رحمٰن کے بندوں کی قلبی عبادت ...... یہاں تک گویا اعمال آگئے۔ چال ایسی ہو، سلام کرنا ایسا ہو وغیرہ۔ یہ گویا ہاتھ، پیر اور زبان کی عبادت آگئی۔ آگے قلب کی عبادت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مبداء اور معاد کے درمیان میں جو زندگی گزارو تو دل کیسا ہونا چاہئے۔ دل کی عبادت کیا ہو؟ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو پکاریں تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، کسی کو ساجھی نہ ٹھہرائیں، نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں۔ ذات بھی اس کی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ صفات وکمالات بھی اس کے یکتا ہیں کہ کوئی اس جیسا نہیں۔ افعال میں بھی وہ یکتا ہے کہ کوئی اس جیسا نہیں۔

ذات لامحدود ہے پس اس کی حد نہیں اس کے سوا جو بھی ہے اس کی ایک حد ہے۔ سب سے بڑی مخلوق انسان ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ ڈیڑھ گز کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک حد میں ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔ آپ اپنی حد میں ہیں اس سے باہر نہیں۔ میں اپنی حد میں ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جہاں جاؤ وہ موجود، کہیں پہنچ جاؤ وہ موجود ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور ان کی تہوں میں گھس جاؤ تب اللہ موجود ہے، اس کے وجود کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو اللہ کے سوا کون ہے کہ اس کے وجود کی حد نہ ہو۔ جسے دیکھو اس کی ایک حد ہے۔ پہاڑ ہیں گو کتنے بڑے ہیں، مگر ایک حد میں ہیں۔ سمندر ہیں ان کی ایک حد ہے۔ جہاں کنارہ آگیا سمندر ختم ہوگیا آگے زمین شروع ہوگئی۔ یہ نہیں کہ سمندر ہر جگہ موجود، آسمانوں، زمینوں، فضا میں بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے اپنے دائرے کے اندر ہے۔ زمین اپنے دائرے میں ایک حد میں ہے۔ حد سے آگے کچھ نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس کی کہیں حد نہیں ہے کسی عالم میں پہنچو اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس جیسی دوسری ذات نہیں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

اسی طرح اس کی صفات بھی یکتا ہیں۔ مثلاً: اس کی صفت علم ہے۔ آپ کا علم ہوگا کہ سو مسئلے معلوم ہوں گے، ہزار ہوں گے، دس ہزار معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد پھر جہالت آگے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اللہ کی ذات کا علم لامحدود ہے کوئی ذرہ نہیں ہلتا کہ اسے علم نہ ہو۔ کوئی پتہ نہیں حرکت کرے گا کہ اس کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی اور ہماری قدرت

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ٦٨.

ایک حد میں ہے۔ہم یہ لاؤڈ اسپیکر اٹھالیں گے، جائے نماز تہہ کر کے اٹھالیں گے۔لیکن اگر کوئی کہے کہ مسجد کو اٹھالو۔ آپ ہم کہہ دیں گے کہ یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ایک جن مسجد کو اٹھالے گا لیکن اس کو اگر کہا جائے کہ ساری زمین کو اٹھالے وہ کہے گا میرے قبضے میں نہیں۔ملائکہ علیہم السلام زمین کا ایک ٹکڑا اٹھا کے پھینک دیں۔جبرئیل علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں الٹ دیں۔لیکن ان سے کہا جائے کہ آسمانوں کو پلٹ دو۔وہ کہیں گے میری قدرت ہی نہیں۔غرض بڑے سے بڑے طاقت والے کی طاقت کی ایک حد ہے۔مگر اللہ کی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے،قدرت،علم،سماعت،بصارت ساری صفات اس کی ایسی ہیں۔

ایسے ہی وہ اپنے افعال میں بھی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی بھی نہیں کرسکتا۔وہ ماں کے پیٹ میں بچے کو بنا دیتا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔اس نے چاند،سورج بنائے ہمارے آپ کے بس میں نہیں ہے۔ساری زمین کے حکماء ملیں تو چاند تو بڑا اونچا ہے زمین کا ایک ذرہ بنا دیں۔جس میں وہ خاصیتیں ہوں جو اللہ کی زمین میں ہیں۔زمین کے ٹکڑوں کو جوڑ توڑ کر کچھ بنالیں گے لیکن خود زمین کی ایجاد کریں ایک ذرہ بھی نہیں کرسکتے۔ساری دنیا کے فلاسفر جمع ہو جائیں سورج کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے اور اللہ نے بنایا ہے۔معلوم ہوا اس جیسا فعل کوئی نہیں کرسکتا۔

تو ذات،صفات اور افعال سب کچھ یکتا اور بے مثل ہے۔اس لئے جب جھکیں گے تو اس کے آگے جھکیں گے۔اگر اس کا کوئی شریک اور ساجھی ٹھہرالیں تو یہ کیسے درست ہوگا؟ کیوں کہ جب اس کی ذات وصفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں تو عبادت میں کون شریک ہوسکتا ہے؟ سب عبادتیں اسی کے لئے ہوں گی۔سجدہ،رکوع اور فریاد اسی کے سامنے کریں گے۔رزق،اولاد اسی سے مانگیں گے اس کی ذات کے سوا دینے والا کوئی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام اتنے مقدس بندے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ افضل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ساری کائنات سے آپ برتر ہیں۔لیکن عبدیت کا یہ حال ہے کہ آپ سے یہ فرمایا گیا کہ تم خود اپنی زبان سے کہو ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ ”اے پیغمبر! اعلان کرو کہ میں نہ تمہارے نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا“۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کر کے فرمایا: ”یَافَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ لَآ اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا“ ① ”اے فاطمہ! بیٹی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے قبضے میں کچھ نہیں ہے تیرے اندر ایمان اور عمل ہوگا تو نجات پا جائے گی میں نجات نہیں دلا سکوں گا۔نہ دنیا میرے قبضے میں ہے نہ آخرت“۔جب سید الاوّلین والآخرین یہ فرمائیں کہ میرے بس میں کچھ نہیں تو میں آپ کیا چیز ہیں؟ پوری مخلوق کیا چیز ہے؟ جو اس سے نمٹ لے۔بالکل کسی کے بس میں کچھ نہیں۔تو اسی کو مانو،جس کے بس میں سب کچھ ہے وہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الوصایا، باب هل یدخل النساء والولد فی الاقارب ج:۹ ص:۲۹۱. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج:۸ص:۲۱۸ رقم:۳۷۱۸.

اللہ کی ذات ہے۔

ہارون الرشید کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت قحط پڑا۔ ایک دیہاتی آیا کہ میں بھی جا کر بادشاہ سے کچھ مانگوں۔ تاکہ میری اصلاح حال ہو بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ میں جا کر بادشاہ سے کہوں کہ اپنے خزانے سے مجھے کچھ دے۔ جب آیا تو دیکھا کہ ہارون الرشید نماز میں مصروف ہے۔ تو چوب دار نے کہا ذرا ٹھہر جا۔ یہ دیہاتی بے چارہ ٹھہر گیا۔ ہارون الرشید جب سلام پھیر چکے اور دعا مانگ چکے تو ہارون الرشید نے پوچھا کہ چودھری صاحب کیوں آئے؟

چودھری صاحب نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیوں آیا پہلے یہ بتا کہ تو کر کیا رہا تھا یہ کیا بات تھی۔ اس نے کہا میں اپنے اللہ کے آگے جھک رہا تھا۔ اس نے کہا اچھا تیرے سے بھی کوئی بڑا ہے؟ اس نے کہا میرے سے بڑے اللہ میاں ہیں۔ میں ان سے مانگتا ہوں۔ بس دیہاتی وہیں سے لوٹا کہ مجھے تجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے کیوں نہ مانگوں، جس سے تو مانگ رہا ہے۔ جب تو بھی اس کا محتاج ہے تو میں محتاج کا محتاج کیوں بنوں؟ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی سب کے کام کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ وہی دیتا ہے، اسی کو چھیننے کی قدرت ہے۔ آدمی کو اگر کچھ لینا ہے تو اپنے معاملے کو اللہ میاں سے درست کرے سب کچھ مل جائے گا۔ ان سے بگاڑ لی تو ملا ملایا بھی چھن جائے گا۔

ہارون الرشید ایک دفعہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہی کا جوش جو آیا تو ہارون الرشید نے کہا آج جس کا جو جی چاہے مانگے اسے وہی دوں گا۔ بس لوگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دو۔ اس نے کہا دے دیا کسی نے کہا مجھے فلاں صوبے کی گورنری دے دیجئے اس نے کہا دے دی۔ کسی نے کہا، مجھے وائسرائے بنا دیجئے۔ اس نے کہا بنا دیا۔ کسی نے کہا مجھے قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دیا۔ جو جس نے مانگا۔ ہارون نے حکم دیا کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ ہارون الرشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے گردن پھیر کر باندی سے کہا کہ تو نے کچھ نہیں مانگا۔ سب درباری مانگ رہے ہیں۔ باندی نے کہا ان بے وقوفوں سے نمٹ لیجئے۔ بعد میں میں بھی مانگوں گی۔ اس نے کہا۔ اچھا! یہ میرے وزراء، امراء سب بے وقوف، پاگل اور احمق ہیں۔

ہارون الرشید کو برا معلوم ہوا کہ اس نے میرے سارے وزراء، امراء کو پاگل بنا دیا۔ ان امراء کو بھی برا لگا۔ مگر امیر المومنین کی باندی تھی اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ پہلے یہ احمق لے لیں۔ اس کے بعد میں بھی آپ سے مانگوں گی۔ جب سب دربار والوں کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ ہارون نے کہا، اب مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے کہا، جو کچھ میں مانگوں گی آپ دے سکیں گے۔ ہاں میں دوں گا۔ میرا اعلان ہے ضرور دوں گا۔ اس نے ہارون الرشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ جب آپ میرے ہو گئے تو ملک، قلعے، دولت اور خزانے سبھی کچھ میرے ہیں۔ یہ سارے بے وقوف تھے۔ اس لئے کہ جس نے خزانہ لیا۔ اسے خزانہ

مل گیا آگے کچھ بھی نہیں قلعہ مانگا، قلعہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں کسی نے گورنری مانگی، گورنر بن گیا باقی کچھ نہیں۔ تو انہوں نے ایک ایک چیز مانگی اور میں نے وہ چیز مانگی کہ ساری چیزیں میرے قبضے میں آجائیں۔

یہی شان اہل اللہ اور اہل دنیا کی ہے۔ مثلاً اہل دنیا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! مجھ کو لکھ پتی بنا دیجئے یا کروڑ پتی بنا دیجئے۔ تو وہ بنا دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے جاگیر دے دیجئے۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ کر دے دی۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ آپ میرے ہو جائیے تو سب کچھ میرے قبضے میں ہے۔ وہ کروڑ پتی بھی ہے، لکھ پتی بھی ہے۔ تو دانش مندی کی بات یہ ہے کہ جڑ اور بنیاد کو آدمی پکڑے۔

اس لئے آدمی کو اگر مانگنا چاہئے تو اللہ سے مانگے۔ اس سے کیا مانگے جو خود مانگنے والا اور محتاج ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو تنہا اللہ کی ذات کو پکارتے ہیں کسی کو بھی ساجھی نہیں سمجھتے، اس لئے کہ اللہ کا کوئی اور مددگار تو نہیں ہے۔ جب انھوں نے آسمان بنایا تھا تو کسی سے کہا تھا کہ اتنا کام تم کردو، اتنا کام میں کرلوں گا۔ جب پیٹ میں بچے کو بنایا تھا تو کیا کسی سے مدد مانگی تھی کہ آ تو بھی شریک ہو جا۔ مجھ اکیلے سے نہیں بنتا، تو شریک ہو جائے گا تو بن جائے گا۔ جب کسی کام کی تخلیق میں کوئی شریک نہیں ہے تو عبادت میں کیسے شریک ہو گئے؟ وہ تنہا بناتا ہے تو تنہا وہ معبود بھی ہوگا۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ② "تنہا آپ ہی کی عبادت کریں گے۔ تنہا آپ ہی سے مدد مانگیں گے" مسلم کو اللہ نے یہ شان دی ہے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ یہ ذلت پیش کرے گا تو اللہ کے سامنے کرے گا۔ بندہ بندہ کے آگے ذلیل ہونے کے لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ اسی واسطے شریعت نے بھیک مانگنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ کوئی کسی کے آگے بھیک نہ مانگے۔ اس لئے کہ مانگنے سے زیادہ ذلت کسی چیز میں نہیں ہے۔ بھیک مانگنا اپنے کو بے آبرو کرنا ہے۔ بندہ کو حق نہیں ہے کہ اپنے جیسے بندے کے آگے بے آبرو بنے۔

ایک دوستی میں مانگنا ہے۔ جیسے آپ کسی سے بے تکلفی میں یوں کہیں کہ بھئی! یہ چیز مجھے دے دو۔ یہ تعلق کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ ③ فرماتے ہیں اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھروں میں جس طرح تمہارا جی چاہے کھا سکتے ہو۔ ماں کے گھر سے مانگ کے کھا سکتے ہو۔ نہ مانگنا تکبر اور مانگنا تعلق کی علامت ہوگا۔ باپ، حقیقی بھائی، بہن، چچے، پھوپھی، ماموں، خالہ یا ایسے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھر سے بھی مانگ کر کھا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ ان سے مانگ کرلو گے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ جب انہوں نے اپنا سمجھا، جب مانگا۔ کوئی دنیا کے آگے تو

① پارہ: ۱۹ سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۵۔ ③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱۔

یہ مانگتا نہیں پھرتا۔ اس طرح بے تکلفی سے اگر کوئی مانگ لے تو یہ بجائے بے آبروئی کے آبرو کا ذریعہ بنتا ہے اور تعلق کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک ہے بھیک مانگنا یعنی محتاج و مفلس بن کے کسی کے آگے آنا کہ تم ہمارا کام پورا کردو۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس ذلت کے اظہار سے ممانعت کی گئی ہے۔ وقار کے ساتھ مانگنا جو ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال سوال میں چونکہ ذلت تھی کہ ایسی ذلت صرف اللہ کے آگے اختیار کی جا سکتی ہے، غیر کے آگے نہیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے اور مانگو تو صرف خدا سے مانگو۔ فریاد اس سے کرو۔ اولاد، رزق، صحت سب کچھ اس سے مانگو۔

اس لئے کہ ہر چیز کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کو شریک نہیں مانتے۔ تنہا اسی کو پکارتے ہیں۔

حقوق العباد کے بارے میں رحمٰن کے بندوں کے طرزِ عمل...... تو یہاں تک چال ڈھال، زبان، ہاتھ، پیر، مال و دولت اور روح کی سب عبادت آ گئی۔ اب آگے دوسرے کے ساتھ معاملہ، دوسرے کے حقوق کو بتلایا گیا اس بارے میں رحمٰن کے بندوں کی کیا شان ہے؟ ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ② ''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو ناحق قتل نہیں کرتے''۔ کہ کسی کی جان لے لی، کسی کی گردن اڑا دی۔ یہ رحمٰن کے بندوں کی شان نہیں ہے۔ یہ فُسّاق و فُجّار کی شان ہے کہ دوسروں کو ایذا پہنچائیں۔ اپنی بڑائی جتلانے کے لئے دوسروں کی حقارت چاہیں معاملات میں دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ یہ متکبروں کی شان ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں۔ لیکن دنیا ہی میں ایسے لوگوں کا انجام برا ہو جاتا ہے۔ جو دوسروں کی تحقیر کرنے کے در پے ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ ہی حکم دیں کہ قتل کرو، پھر قتل کرنا فرض ہے جیسے قصاص میں قتل کریں۔ کسی نے ناحق قتل کیا تھا تو سزا میں اس کا قتل کرنا یہ جائز ہے۔ یا کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے۔ اس کا قتل کر دینا جائز ہے یا اسی طرح سے کوئی زنا کار ہو پتھروں سے سنگسار کر دینا۔ یہ اس کا قتل کر دینا ہے یہ بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے پتھروں سے قتل کیا جائے۔ غرض زنا کاری یا قاتلوں کو دنیا سے پاک کرنے کے لئے یا مرتدین جو دین کی کوئی اہمیت نہ سمجھیں اور اپنے دین کو بدل ڈالیں۔ ایسے لوگوں سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے قتل کرنا جائز ہے یہ قتل حق ہے۔ ناحق وہ قتل ہے کہ قتل کا کوئی استحقاق نہیں تھا اور چار پیسے کی خاطر گردن ماردی یا ڈاکہ ڈالنا تھا جا کے قتل کر دیا۔ یا جذبہ آیا لڑائی شروع ہوئی۔ اِدھر سے بھی چھری نکل آئی، اُدھر سے بھی نکل ائی۔ قتل و غارت شروع ہو گیا اس کا کوئی حق نہیں۔ تو یہی فرمایا گیا جن کی نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی اور وہ رحمانی ہوں گے وہ یہ کام نہیں کریں گے۔ یہ فساق و فجار کا کام ہے کہ وہ

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔

بیلوں کی طرح پھرتے ہیں۔ بیل کا کام یہی ہے کہ جو سامنے آ گیا اس کے سینگ مار دیا یا شیر کے کے آگے کوئی گیا تو وہ دانت کھول کر پھاڑ کر کھانے کے لئے جا پڑا۔ غرض یہ بہائم کا کام ہے۔ انسانوں کا کام نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ مومن کون ہے؟ مومن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: ''اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ'' ① مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جان، اپنے مال اور اپنی آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے کہ یہ ہماری جان نہیں لے سکتا۔ یہ ہمارے مال کو ضائع نہیں کر سکتا اور ہماری آبرو کو خراب نہیں کر سکتا۔ لوگوں کو اتنا اطمینان پیدا ہو جائے۔ پھر سمجھا جائے گا کہ یہ مومن ہے۔

پھر ''اَمِنَهُ النَّاسُ'' میں لفظ بھی عام ہے کہ لوگ مطمئن ہوں۔ خواہ مسلم یا غیر مسلم ہوں۔ ہر ایک کو اطمینان ہو جائے کہ بھئی! یہ مومن ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ مار دھاڑ کرتا پھرے یا آبروریزیاں کرتا پھرے۔ دنیا اس سے مطمئن رہے کہ یہ صالح آدمی ہے۔ اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ کسی سے کھٹکتے رہیں کہ بھئی کہیں یہ چھری نہ مار دے۔ یہ مومن کیا یہ اچھا خاصا بیل ہے، بیل جب سڑک پر چلتا ہے تو آپ دامن بچا کے چلتے ہیں کہ کہیں پیشاب نہ کر دے کہ کوئی چھینٹ نہ آ جائے، کہیں سینگ نہ مار دے تو اگر مومن سے بھی کوئی یوں بچنے لگے کہ بھئی جیب بچاؤ کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں جیب سے فونٹین پین نہ نکال لے جائے تو یہ مومن کیا ہوا۔ مومن کا یہ کام نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا کہ: رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو نفس انسانی کے درپے نہیں ہوتے۔ قتل و غارت کرتے نہیں پھرتے۔ ہاں خدا کا حکم آ جائے حکم کی تعمیل کے لئے قصاص لے لیں تو قتل کر دیں۔ ویسے ان کا کام نہیں۔

﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾ ② آبروریزی نہیں کرتے۔ سب سے بڑی آبروریزی زنا کاری ہے کہ ایک عورت کی آبرو ختم کر دی اور اس درجے ختم کر دی کہ عمر بھر کے لئے بے آبرو ہو گئی۔ اس سے اگر بچہ پیدا ہوا وہ ولدالزنا ہوگا۔ تو پوری برادری کہے گی کہ یہ حرام کا بچہ ہے اس کو بیٹی مت دو۔ اس سے معاملہ مت کرو۔ تو کتنا عظیم اس نے گناہ کیا کہ ایک عورت کی پوری زندگی برباد و تباہ کر دی۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور آبرو باقی نہ رہی ایسا شخص قابل گردن زدنی ہے۔

پھر آبروریزی ایک کی کی اور امن ساری سوسائٹی سے اٹھا دیا۔ دوسروں کو جرأت ہوگی کہ وہ بھی یہ حرکت کریں، تو دنیا کے اندر بدامنی پھیل گئی۔ آبرو باقی نہ رہی تو ایک کی آبرو جائے گی اور دوسرے کو اس نے آبروریزی کرنے کی جرأت دلائی۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ تو فقط یہ نہیں ہے کہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اس کا نصف حصہ زمین میں گاڑ کر پبلک اکٹھی ہو اور پتھر مار مار کر اسے سنگسار کیا جائے۔ ظاہر میں تو یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وحشت والی سزا ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جرم کی نوعیت کو دیکھو کہ ایک

---

① السنن للترمذی، ابواب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون...... ج: ۹ ص: ۱۵ ۲ رقم: ۲۵۵۱.

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸.

شخص کی آبرو ضائع کی۔ سوسائٹی برباد کی، دنیا سے اس نے امن اٹھادیا۔ ایسے شخص کو تو اس سے زیادہ سزا دینی چاہئے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ نہ وہ کسی کی جان گنواتے ہیں نہ کسی کی آبرو گنواتے ہیں۔ دونوں کی حفاظت کرتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا﴾ ① ''پھر بھی اگر کوئی یہ حرکت کرے گا اسے اثام میں ڈالا جائے گا۔''

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''اَثَام'' ایک وادی اور جہنم میں جنگل ہے۔ اس میں شدید عذاب ہے کہ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے اس میں اس کا ٹھکانا بنایا جائے گا۔ ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ﴾ ② دوگنا تگنا عذاب اس کے اوپر بڑھتا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جیسے اس نے دنیا میں آبروریزی کر کے آبرو کو تہہ و بالا کیا کہ پھر آبرو ابھر ہی نہ سکے۔ اس طرح عذاب بھی تہہ بہ تہہ ڈالا جائے گا تاکہ وہ ابھر ہی نہ سکے۔ اسے بھی وہاں امن نہیں ہوگا۔ ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا﴾ ③ اور ایک لمبی مدت تک ذلت ورسوائی کے ساتھ یہ عذاب بھگتے گا۔

توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ...... ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ ④ سوائے اس کے کہ کوئی توبہ کرے، اس سے آخرت کا عذاب ٹل جائے گا۔ دنیا میں تو عذاب آگیا کہ اسے سنگسار کردیں گے، لیکن ابھی آخرت کی توبہ باقی ہے، اگر توبہ کرلی، وہاں کا عذاب ختم ہوجائے گا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ ⑤ جو توبہ کرے اور توبہ کے بعد نیک راستے پر چلنے لگے۔ فضول حرکتوں کو ترک بھی کر دے۔ پھر فقط گناہ معاف ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کی نیکیاں بدیوں کو بھی مٹا دیں گی اس کی نیکیاں غالب آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں سے بدل دے گا اور اس تبدیلی کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص میدانِ محشر میں حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ اسے بلائیں گے وہ بے چارہ یا تو توبہ کر کے گیا ہوگا یا توبہ نہ کی ہوگی تو حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا۔ اسے فرمائیں گے قریب ہوجا، وہ قریب ہوگا۔ فرمائیں گے اور قریب ہوجا۔ یہ بے چارہ لرز رہا ہے، کپکپا رہا ہے، ہیبت زدہ اور ڈر رہا ہے، فرمائیں گے اور قریب ہوجا، اتنا قریب آئے گا کہ حدیث میں ہے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ یاد دلائیں گے۔ فرمائیں گے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آرہا ہوگا کہ اب میری نجات کی کوئی صورت نہیں اور حکم ہوگا جاؤ جہنم میں۔ اس لئے کہ ابھی تو چھوٹی چھوٹی برائیاں پوچھ رہے ہیں۔ جو میں نے بڑی بڑی حرکتیں کی ہیں۔ ان کی نوبت آگئی تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی باتیں تھیں ان کو پوچھ لیا ہے۔

عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی عرض کرے گا اللہ میاں! میں نے اپنی بدبختی سے ایسی حرکتیں کیں۔ بہت سی بدیاں گنوانے کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے ان سب کے بدلے ہم تجھے نیکیاں دیتے ہیں اور تیرے نامہ اعمال میں وہ لکھی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹۔ ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰۔ ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰۔

جاتی ہیں۔اب وہ حیران ہوگا کہ یہ تو دوسرا قصہ ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے لئے ہلاکت ہے۔ یہاں تو بدیوں کو نیکیوں سے بدلا جارہا ہے۔اب خود ہی کہے گا اللہ میاں وہ جو بہت بڑی بڑی بدی میں نے کی تھی وہ تو آپ نے پوچھی ہی نہیں۔فرمائیں گے حق تعالیٰ وہ کیا تھی؟ بندہ عرض کرے گا وہ یہ تھی۔فرمائیں گے اس کے بدلہ میں اتنی نیکیاں دیں۔تو رحمت متوجہ ہو جائے تو ہلاکت کی کوئی صورت نہیں اور غضب خدانخواستہ متوجہ ہو جائے تو نجات کی کوئی صورت نہیں۔آگے فرمایا ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ① اس سے پہلے تو وہ گناہگاروں سے معاملہ تھا۔اب آگے اصول بیان کیا جس سے جو بھی قصور ہو وہ توبہ ورجوع کرے،توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔مومن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے مایوس نہ ہو۔توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اور قیامت کی بڑی علامت نمایاں ہوں گی اور دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا۔اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوگا۔اسی لئے اگر ستر برس سے بھی معصیت میں مبتلا ہو اور آج دل سے سچی توبہ کرلے۔آج بھی معافی مل جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے زنا کیا اور اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی آئی۔اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اے میرے پروردگار! فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بخش دیجئے۔حق تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ ''اَیَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا '' یعنی یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کو پکڑ کرے گا۔فرماتے ہیں جب یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے۔اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔اور حدیث میں ہے کہ مغفرت مانگ کر گیا اور اب پھر زنا کیا پھر ندامت ہوئی پھر آیا یَـا رَبِّ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اب بھی سمجھ گیا کہ ہے رب؟ پھر مغفرت مانگنے سے پہلے مغفرت کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔لیکن اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے مگر اس کی رحمت کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔تو اس لئے یہ اصولا فرمادیا کہ ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ② اس کے بعد ایک دوسرا معاملہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ③ رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب ان سے کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ جھوٹ میں نہیں پڑتے۔زور کے معنی جھوٹی گواہی دینے کے ہیں۔تو رحمٰن کے بندے جھوٹی گواہیوں اور جھوٹی مقدمہ بازیوں میں نہیں پڑتے اور جب وہ لغو اور فضول مجلسوں سے گزرتے ہیں تو سادگی اور صفائی سے گزر جاتے ہیں،ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔کرام بن کے گزر جاتے ہیں۔

اور ان کی دعا ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ ﴿وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا﴾ ④ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو ہماری بیویوں سے اولاد دے وہ صالح اور پاک اولاد دے اور ہمیں صالح اور

① پارہ: ۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ: ۷۱. ② پارہ: ۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ: ۷۱.
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان،الآیۃ: ۷۲. ④ پارہ: ۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ: ۷۴.

پاک لوگوں سے آگے چلنے والے بنا کہ ہم خود اپنی اولاد اور بیویوں کو راہ دکھلائیں'۔ اور یہ بھی فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ ① اور ان کے دلوں پر دینی سمجھ اور علم اتنا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہوں تو فوراً قلب کی سلامتی کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے ان میں سمجھ پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ان آیات کو اندھے بہروں کی طرح قبول نہیں کرتے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ شنوا و بینا ہو کر قبول کرتے ہیں۔ وہ مطلب سمجھتے ہیں جو اللہ کا مطلب ہے۔

رحمٰن کے بندوں کی معاد...... آگے فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾ ② یہی وہ لوگ ہیں جن کو بالائی منزلوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بلڈنگیں عالم آخرت میں عطا کی جائیں گی مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ محلات اور باغات ان کو عطا کئے جائیں گے اور ان کو اَبدی زندگی دی جائے گی گویا یہ ہمارے مقامات معاد ہیں جہاں ہم کو جانا ہے اور ایک وہ جگہ ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ یعنی اللہ کی ذات بابرکات اور اس کا حکم وہ ہمارے لئے مبدا تھا جس سے ہماری ابتداء ہوئی اور یہ (جزاء غرفات) ہماری معاد ہوگی۔ اور بیچ میں زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے کہ زبان، ہاتھ، پیر، روح اور مالیات کی بھی حفاظت ہو اور ہر چیز اللہ کے حکم کے مطابق صرف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر ہو اور یہ جبھی ہوگا جب شریعت سامنے آئے اس کا علم اور تعلیم ہمارے سامنے آئے، جس کے ذریعے ہم ہاتھ، پیر، قلب، دماغ، روح وغیرہ کو اس راستے پر ڈال سکیں۔

تو یہ جو ابتداء میں کہا گیا تھا کہ تین سوال ہیں اور فطرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہاں سے آئے؟ کہاں جائیں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں؟ تو جہاں سے ہم آئے وہ اللہ ربّ العزّت کی ذات بابرکات ہے جس کے امر سے آئے۔ اس کے وجود سے ہمیں پرتو (عکس) ملا تو ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جا، ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے۔ اور بیچ میں ہم اس کے کہے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول اس کا فرمایا ہوا لے کر آئے ہیں۔ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آ جائیں۔ جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔ اتنا آدمی اندھا رہے کہ اسے راستہ ہی نہ ملے جس کے اوپر وہ چلے اور نہ یہ پتہ ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ بس یہ کہ دنیا یوں ہی چلتی آئی ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں سکون کبھی نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے اگر کوئی یوں کہے کہ بس ایسے چلتے رہیں گے نہ آخرت آئے گی نہ قیامت آئے گی نہ یہ عالم ختم ہوگا تو پھر یہ الجھن پیدا ہوگی، کہ جس چیز کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب اس عالم کی ایک ابتداء

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۵.

ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ عالم کے ہر ہر جز کی ابتداء ہے تو کل کی بھی ابتداء ہے۔ جب ابتداء ہے تو انتہا بھی ہوگی۔ گویا عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ مان اور اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ نہ مان، تو سکون پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر مان لیتا ہے تو سکون قلب پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک راستے پر لگ گیا اسے پھر طمانیت اور بشاشت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس رکوع کی میں نے تفسیر کی۔ بس یہی تقریر تفسیر بھی تھی اس میں میں نے وہ جوابات عرض کئے جس سے فطرت کو تسلی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنی بھیجی ہوئی راہ پر لگا دے اور انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی ہمیں نصیب فرما دے۔ آپ کی زندگی پر ہماری زندگیوں کو منطبق بنا دے۔ ظاہر و باطن ہمارا ایسا بنا دے جس سے اللہ راضی اور خوش ہو۔ ہمارے قلوب کے اندر اطمینان اور سکون پیدا فرما دے اور انجام ہمارا بخیر فرمائے۔ آخرت ہماری درست فرمائے۔ دنیا ہماری صالح فرمائے۔ ہر مصیبت کو دفع فرمائے۔ جن مشکلات میں ہم مبتلا ہیں، ان سے رہائی نصیب فرما دے۔ (آمین)

”اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.“

ادب اوراختلاف رائے

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّـــا بَعْـــدُ:

شعائر اللہ کا ادب...... بزرگان محترم! دین کے لئے ادب ایک بنیادی چیز ہے۔ جس حد تک ادب اور تاذب بڑھتا جائے گا۔ اسی حد تک انسان کا دین قوی ہوتا جائے گا اور جس قدر بے ادبی گستاخی، جرات وجسارت اور بے باکی بڑھتی جائے گی۔ انسان دین سے ہٹتا جائے گا۔ خواہ علم ہو یا غیر علم ان میں شریعت نے آداب کی رعایت رکھی ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَاتَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ ① "اے ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کر بیٹھ کر بلند آواز سے گفتگو مت کرو، اپنی آوازوں کو پست کرو اور ایسی آواز نہ ہو کہ نبی کی آواز سے بڑھ جائے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ نہ اس پر اجر مرتب ہوگا نہ ثواب"۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلقی طور پر بلند آواز اور جہری الصوت تھے۔ آواز ہی اس طرح بلند تھی کہ آہستہ بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ زور سے بول رہے ہیں۔ لیکن اس آیت کے اترنے کے بعد اتنا آہستہ بولنے لگے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا اور فرماتے "مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری آواز بلند ہو جائے اور میرے اعمال حبط نہ ہو جائیں"۔ ②

اس سے مسئلہ نکل آیا کہ ادب سب سے بڑی چیز ہے۔ حقیقتاً تو ادب حق تعالیٰ شانہٗ کا ہے۔ عظمت والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ اس واسطے کہ اس کی بارگاہ میں ادب اور تواضع چاہئے۔ پھر جس جس کو اللہ سے نسبت ہوتی جائے گی، اس کا ادب قائم ہوتا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم کا ادب قائم کیا گیا کہ ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ③

---

① پارہ: ۲۶ ،سورۃ الحجرات ،الآیۃ: ۲ . ② السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۱۲ ص: ۹۱ . ③ پارہ: ۲۷ ،سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹ .

اگر حالت جنابت تک نجاست پہنچ گئی تو تلاوت بھی ناجائز ہوگئی گویا زبان بھی پاک نہ رہی۔ یہ قرآن کا ادب سکھلایا گیا کہ اس کلام کی نسبت اللہ کی طرف ہے جس کا نام کلام اللہ ہے۔ اللہ کا ادب ضروری ہے تو یہ تو کاغذوں کا مجموعہ ہے جو حروف ونقوش لکھے ہیں یہ کلام کی علامات ہیں۔ کلام وہ ہے جس کا تکلم کیا جائے۔ پھر وہ حروف ونقوش جن کاغذات میں درج ہیں انہیں بے وضو ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا، وہ کاغذات جس جلد میں سی لئے جائیں وہ بھی واجب التعظیم بن جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ کلام کا ادب بتلایا گیا لیکن جو چیزیں اس کی طرف منسوب ہوتی گئیں، ان کا ادب بھی واجب ہوتا چلا گیا۔ کلام کی وجہ سے نقوش اور نقوش کی وجہ سے کاغذ اور جلد درجہ بدرجہ سب کی تعظیم ضروری ٹھہرتی گئی۔ اگر ادنیٰ درجہ بھی گستاخی ان میں سے کسی چیز کی کی جائے۔ تو اعمال کے ضبط وحبط ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ بے ادبی کے ساتھ دین قائم رہ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب اللہ کا ادب واجب ہے تو بیت اللہ کا ادب بھی واجب ہوگیا۔ ''اللہ کا گھر'' یہ نسبت جب آ گئی تو ادب لازم ٹھہرا۔ حالانکہ حق تعالیٰ حیز اور جسم ومکان سے بری ہیں۔ لیکن نسبت جب آتی ہے کہ وہ تجلیات ربانی کا مرکز ہے تو اس گھر کا ادب ضروری ہوگیا۔ جب بیت اللہ کا ادب واجب ہوا، تو جس مسجد حرام میں بیت اللہ واقع ہے وہ مسجد بھی واجب التعظیم ہوگئی اور اس درجہ بابرکت بن گئی کہ اگر ایک نماز یہاں پڑھی جائے، تو ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اس کی نسبت کی برکت ہے۔

مسجد حرام جس محل میں واقع ہے، وہ مکہ مکرمہ ہے۔ تو مکہ مکرمہ بھی واجب التعظیم ہوگیا اور اس کا ادب ضروری ہوگیا اور مکہ مکرمہ واقع حجاز میں ہے تو حجاز اور سارے عرب کا ادب واجب ہوگیا۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ'' ① ''عرب سے محبت کرنا ایمان اور بغض رکھنا، نفاق کی علامت ہے''۔ غرض درجہ بدرجہ سارے آداب واجب ہوتے چلے گئے۔ اگر بے ادبی اور گستاخی کسی ایک میں بھی آ گئی، تو دین کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

غیر اختیاری کمالات کا ادب...... اس لئے تادب اور توقیر وتعظیم لازم قرار دی گئی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا'' ② ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا، اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہوگا''۔ اکابر کی تعظیم وتوقیر واجب قرار دی گئی اور دھمکی دی گئی کہ اگر اسے نہ انجام دو گے، ہماری جماعت میں شمار نہیں ہوگا اور یہ توقیر ادب عمر کی بڑائی کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی علم رکھتا ہے تو علم کی وجہ سے ادب ہوگا۔ علم کے ساتھ زہد وقناعت کے جذبات اور اخلاق رکھتا ہے، تو ان کا ادب واجب ہوگا

① المستدرک، کتاب معرفة الصحابة رضی الله عنهم، باب ذکر فضائل القبائل ج:۱۶ ص:۳۱۹۔ امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه.

② السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، ج:۷ ص:۱۵۵ رقم:۱۸۴۲۔

لیکن اگر کوئی بھی کمال نہ ہو، صرف عمر کی بڑائی ہو، اس وجہ سے بھی اس کا ادب ضروری ہوگا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بوڑھا ہونے کی وجہ سے کرے تو وہ اس سے پہلے نہیں مرے گا کہ حق تعالیٰ اس کے لئے چھوٹے پیدا کر دیں گے جو اس کی تعظیم کریں گے۔ حدیث میں فرمایا کہ جو شخص سفید داڑھی والا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے حیاء آتی ہے کہ اسے خالی واپس کر دوں تو یہ اس کی داڑھی کا عنداللہ وقار ہے۔ جو محض عمر کی بڑائی کی وجہ سے اسے حاصل ہو گیا ہے۔ اگر اس بڑائی کے تحت اور بڑائیاں بھی جمع ہو جائیں۔ علم، اخلاق تو ادب بھی بڑھتا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ہنر نہ ہو تو خلقی کمال پر بھی ادب کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد ہے: ''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ لِکِتَابِ اللہِ۔'' امامت کرنے کا حق اس کا ہے، جو سب سے صحیح قرآن پڑھنے، سب سے زیادہ قرآن کا علم ہو۔ ''فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَ ۃِ سَوَاءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ'' ① (پھر) جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے بڑھایا جائے، اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو مسائل صلوٰۃ سے جو زیادہ واقف ہو اسے آگے بڑھاؤ۔ اگر سارے کے سارے حسین وجمیل جمع ہوں۔ فرمایا جس کا نسب اونچا ہو اسے آگے کرو۔ تو کوئی خصوصیت مقدم کرنی چاہئے کہ مقتدیوں کو عار لاحق نہ ہو۔ اگر بڑے بڑے اہل کمال جمع ہیں اور کسی جاہل کو امامت کے لئے بڑھایا، انہیں عار لاحق ہوگا کہ کسے بڑھا دیا؟ اگر سب حسین وجمیل ہوں اور کسی اندھے بہرے کو بڑھا دیا انہیں حقارت پیدا ہوگی کہ یہ کہاں سے آگے بڑھ گیا؟

جب اور کمالات میں سب برابر ہوں پھر خوبصورتی کو آگے رکھا گیا حالانکہ یہ کوئی اختیاری کمال نہیں، خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ لیکن غیر اختیاری چیز بھی بعض اوقات خصوصیت کا سبب بن جاتی ہے۔ تقدم وتقدیم کے لئے آداب کی ضرورت ہے اور ان آداب میں بعض دفعہ تکوینی چیزیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ باوجودیکہ عمر یا حسن اللہ کی دی ہوئی چیز ہے مگر اس کے باوجود فرمایا، اس کا ادب کرو۔ حاصل یہ نکلا ہر بڑھائی تعظیم کی مستحق ہے۔ خواہ وہ تکوینی ہو یا تشریعی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ اگر توقیر نہ کی گئی تو فرمایا کہ ممکن ہے تمہارے اعمال اور دین پر اثر پڑ جائے۔

نسبت کا ادب...... یہاں تک کہ نسبتوں کا ادب سکھلایا گیا، یہ جو اللہ والوں کے ہاں نسبتوں کی توقیر کی جاتی ہے کہ شیخ کی عظمت کرتے ہیں۔ شیخ کی اولاد اور وطن کا بھی نسبت کی وجہ سے ادب کرتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: ''فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِّنِّیْ مَنْ اٰذَاھَا فَقَدْ اٰذَنِیْ'' ② ''فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی توقیر کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی توقیر کی۔ یہ توقیر شرفِ صحابیت کی وجہ سے نہیں سکھلائی گئی، یہ تو اور صحابہ میں بھی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، ج:٣ ص:٤٢٨ رقم: ١٠٧٨.

② الحدیث اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ ولفظہ: یوذینی ما آذاھا، کتاب فضائل الصحابہ باب فضائل فاطمۃ بنت النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

اولاد ہونے کی جو نسبت ہے اسی کا ادب سکھلایا گیا۔ اس لئے فرمایا کہ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے صحابہ میں داخل ہے۔ صحابیت کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی جمع ہوگئیں۔ جو اولادِ رسول ہوتا ہے کہ یہ جزو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو جب قلب میں رسول کا ادب ہوگا، تو اولادِ رسول کا بھی ہوگا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دار العلوم دیوبند کے متعلق سنا کہ ان کی عادات میں ادب کا لحاظ بے حد ہوتا۔ اگر سادات کا کوئی نابالغ بچہ بھی آ جاتا تو سرہانہ چھوڑ کر پائنتی کی طرف بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ دنیا مخدوم زادوں کی عزت کرتی ہے۔ یہ سارے عالم کے مخدوم زادے ہیں۔ سارے عالم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔ حالانکہ بچہ نابالغ ہے مگر فرماتے یہ مخدوم زادہ ہے۔ یہ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سبق آموز واقعہ...... ایک دفعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مراد آباد تشریف لے گئے اور جانا آ گے تھا۔ مراد آباد بھی ٹھہرے، پروگرام میں حضرت نے صرف ایک دن رکھا تھا لوگوں نے اصرار کیا، مگر آپ نے انکار فرما دیا تو علماء کا طبقہ جمع ہو کر آ گیا کہ ٹھہر جائیں انکار کر دیا کہ نہیں ٹھہروں گا۔ پھر بعض امراء جمع ہو کر آ گئے۔ امراء سے کہا کہ جب علماء کی نہ سنی، تو آپ کی کیسے مانوں؟ مراد آباد کے لوگوں کے دل میں ٹھن گئی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھہراؤ، تو ایک نے مشورہ دیا کہ ان کو ٹھہرانے کی ایک ہی صورت ہے۔ فلاں دفتر میں ایک کلرک لڑکا چودہ پندرہ سال کا ہے، اسے بلا لاؤ، وہ ٹھہرا سکے گا۔ جب وہ آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور اپنی جگہ پر اس کو بٹھا دیا خود مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کہ حضرت جی چاہتا ہے کہ کچھ ٹھہر جائیں، فرمایا بہت اچھا۔ ٹھہر گئے اور اتنے ٹھہرے کہ ایک ہفتہ تک ٹھہر گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ حضرت اس وقت تک نہیں جائیں گے، جب تک وہ لڑکا نہیں کہے گا۔ تب آ کر اس نے اجازت دی۔

وہ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی اعلی اللہ مراتبہ تھے اور یہ لڑکا میاں جی مرحوم کا نواسہ لگتا تھا، تو شیخ کی نسبت کا اتنا ادب تھا کہ ان کے حکم کی وجہ سے وہیں رک گئے، کسی کا حکم نہ مانا۔ یہ نسبت کا ادب تھا۔ شیخ کے بھی نہیں شیخ الشیخ کے نواسے تھے اور یہ ادب تب ہوتا ہے۔ جب اصل شیخ کا ادب دل میں ہو۔ حتیٰ کی وطن کی نسبت کی وجہ سے شیخ کے وطن کے ساتھ شریف لگاتے ہیں۔ دیوبند شریف، نانوتہ شریف، مکہ شریف۔ تو وہ شریف کا لفظ تعظیم کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نسبت کا ادب اور عظمت یہ کوئی غیر شرعی چیز نہیں۔

اہل اللہ نے نسبتوں کا اس درجہ ادب کیا ہے کہ شیخ کی اولاد اگر جاہل اور کندہ ناتراش بھی ہوتی، پھر بھی حد درجہ ادب کیا۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس اللہ سرّہٗ جو مشائخ چشتیہ میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پوتے ہیں شاہ ابو سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو سلسلہ چشتیہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ شاہ ابو سعید کا ابتدائی زمانہ بہت آزادی کا تھا۔ نہ نماز، نہ روزہ، نہ پابندی، لباس کے شوقین، ہر وقت پر تکلف کپڑے، بس اسی میں لگے رہتے۔ نہ علم

سیکھنے کی طرف توجہ، نہ اعمال کی اصلاح کی طرف، جوانی کا زمانہ تھا، رنگ رلیوں میں پڑے رہتے۔ وہ ایک دن گنگوہ میں کسی گلی میں جا رہے تھے۔ بھنگن نے ٹوکرہ کباڑہ کا کہیں پھینکا اور سارا گرد ان کے کپڑوں کو لگ گیا، تو غضبناک ہو گئے اور کہا حرام زادی، بے حیاء، تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ بھنگن تھی بوڑھی اور اس نے حضرت شیخ عبدالقدوس کا زمانہ پایا تھا تو اس نے تان کر کہا کہ کس برتے پر اکڑتا ہے؟ دادا کی میراث کمائی تھی، جو آج اتنے فخر سے بولتا ہے؟ بس وہ دن تھا، اسی وقت واپس ہوئے اور گھر میں آ کر والدہ سے کہا کہ اب میں گنگوہ اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ دادا کی میراث نہ سنبھال لوں، اور پوچھا کہ اس وقت حضرت شیخ کے خلفاء میں سے کون کون سے لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ اجلاء خلفاء میں سے شیخ نظام الدین بلخی ہیں۔ انہوں نے خلافت لے کر بلخ کا سفر کیا تو بتلایا گیا کہ بلخ میں بڑی خانقاہ ہے۔ لاکھوں کی اصلاح اور افادہ ہو رہا ہے تو شیخ نظام الدین کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں۔ شیخ کو صاجزادہ کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو جو پہنچنے کا دن تھا۔ اس زمانے میں موٹر کاریں تو نہ تھیں مہینہ دو مہینہ قطع مسافت کے بعد کہیں جا کر پہنچے اگر چہ صاجزادہ جاہل ہیں نہ علم نہ ہنر اور شیخ وقت کے ہزاروں متوسل، ہزاروں مرید اور ہزاروں کو علم اور دین کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مگر اسی نسبت کے ادب کی وجہ سے کئی میل آگے جا کر استقبال کیا اور جب شیخ نکلے تو تمام بلخ، امراء بلخ حتی کہ شاہ بلخ بھی ساتھ نکلے۔ دور سے دیکھا کہ صاجزادے گھوڑے پر آ رہے ہیں تو حضرت نظام الدین آگے بڑھے اور قدموں پر ہاتھ رکھا۔ صاحبزادے گھوڑے سے اترنے لگے۔ فرمایا نہیں آپ نہ اتریں، اوپر رہیں۔

اب اس شان سے صاحبزادے چلے آ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور قدموں پر شیخ نے ہاتھ رکھا ہے اور جب شیخ نے ہاتھ رکھا تو دوسری رکاب پر خود شاہ بلخ نے ہاتھ رکھا۔ اس شان سے بلخ آئے مہمانداری بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تمام علماء و مشائخ اور امراء کو صاحبزادہ کے احترام میں دعوتیں دیں۔ جب تین دن گزر گئے اور شیخ کا یہ عالم کہ دو زانو بیٹھے ہیں۔ صاجزادہ کو مسند پر بٹھا رکھا ہے۔ پھر پوچھا صاحبزادے! اتنا لمبا چوڑا سفر کیسے کیا؟ کہاں ہندوستان اور کہاں بلخ، کیا ضرورت پیش آئی؟ صاحبزادے نے کہا کہ دادا کی میراث لینے آیا ہوں، جو آپ لے کر آئے ہیں۔ اور یہ وہ نسبت اور تعلق مع اللہ کی میراث ہے۔ فرمایا، اچھا یہ غرض ہے۔ کہا جی ہاں۔ فرمایا کہ وہاں جوتیوں میں جا کر بیٹھ جاؤ اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ اب نہ وہ ادب ہے نہ وہ تعظیم اور بیعت کر کے تزکیہ نفس کے لئے کچھ اعمال بتلائے۔ خدمت یہ سپرد کی کہ مسجد میں بیٹھ کر استنجاء کے لئے ڈھیلے توڑیں تاکہ نمازی آئیں تو تکلیف نہ ہو۔ سال بھر اسی حالت میں گزر گیا کہ کوئی پرسانِ حال نہیں یا تو شاہ بلخ رکاب تھامے آئے تھے یا آج صاحبزادے کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

جب ایک برس گزر گیا تو شیخ نے امتحان لینا چاہا کہ کس حد تک نفس کی اصلاح ہوئی۔ کبر، غرور رفع ہوا یا نہیں۔ تواضع للّٰہیت پیدا ہوئی یا نہیں نفسانیت ختم ہو گئی یا نہیں۔ تو بھنگن کو حکم دیا کہ کوڑا کباڑ کا ٹوکرہ لا کر

صاحبزادے کے قریب ڈال دے۔ تاکہ تھوڑا سا گرد صاحبزادے کے اوپر پڑ جائے اور جو کچھ کہے۔ وہ ہم سے آ کر کہہ دے۔ بھنگن نے جا کر ٹوکرا زور سے ڈال دیا تو سارا گرد صاحبزادے پر پڑا تو اس نے آنکھیں لال پیلی کر کے کہا کہ ''بے حیاء! نہ ہوا گنگوہ کہ تجھے بتلاتا'' اس نے آ کر شیخ سے عرض کیا کہ وراثت نہیں ملی۔ ابھی نفسانیت کافی موجود ہے۔ اگلے دن پھر حکم ہوا، استنجے کے ڈھیلے توڑنا تو خیر ہے ہی مگر نمازی نماز پڑھ کر نکلیں تو جوتے سامنے رکھو، ان کی حفاظت بھی کرتے ہو۔

اب اس خدمت پر لگ گئے۔ جب ایک برس گزر گیا تو بھنگن کو پھر حکم دیا کہ قریب ہی نہیں بلکہ جا کر صاحبزادے کے اوپر سارا کوڑا کرکٹ ڈال دو۔ اس نے سارا ٹوکرہ جا کر ڈال دیا۔ تو صاحبزادے نے کہا ''ارے بی، کیوں اس کباڑ کو تو نے مجھ پر ڈال دیا۔ یہ مجھ سے زیادہ افضل ہے تو نے اس کباڑ کو بھی عیب لگایا۔ میں ایسی ناپاک ہستی ہوں کہ یہ کباڑ بھی میرے اوپر گرنے سے ناپاک ہو گیا۔ میرے اندر تو کوئی خوبی نہیں'' بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ سب کچھ عرض کیا۔ فرمایا اب دادا کی وراثت مل چکی ہے۔ اس کے بعد اگلے دن شیخ نے حکم دیا کہ ہم شکار کے لئے جائیں گے۔ صاحبزادے سے فرمایا تم ہمارے ساتھ چلو۔ شیخ گھوڑے پر سوار ہوئے اور حکم دیا کہ تم رکاب تھام کے چلو جب وہ آئے تھے تو شیخ نے رکاب تھامی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ گرتے پڑتے شیخ کے ساتھ دوڑتے جا رہے ہیں، لہولہان ہو گئے، پیروں میں زخم آئے، خون نکل آیا مگر کیا مجال کہ یہ رکاب سے الگ ہو جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شیخ حکم دیں اور اطاعت نہ کی جائے؟ اسی شان سے سارا دن بسر ہوا، شام کو واپس پہنچے تو صاحبزادہ کو حکم دیا کہ غسل کرو، صاحبزادے نے غسل کیا، کپڑے وغیرہ بدلوائے۔ اس کے بعد مجمع کیا اور بھرے مجمع میں صاحبزادے کو کھڑے کر کے جوتا ہاتھ میں دیا اور فرمایا۔ یہ غلام حاضر ہے، سر حاضر ہے، یہ جوتا ہے۔ میں اسی طرح خانہ زاد غلام ہوں۔ دادا کی میراث مل نہیں سکتی تھی اگر یہ محنت اور ریاضت نہ ہوتی۔ نفس کا کبر رفع نہ ہوتا۔ اب تمہیں دادا کی میراث مبارک ہو، خلافت دی اور پگڑی سر کے اوپر باندھی۔ وہ گویا بے ادبی نہیں تھی بلکہ مجاہدہ تھا کہ اس کے بغیر نفس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی تو ریاضت اور مجاہدے اس لئے ہوتے ہیں کہ ادب کا مضمون قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو اللہ اور اس کے نیک بندوں کا بھی ادب کرو، ہر بڑی چیز کا ادب کرو، جس میں کوئی بڑائی اور خوبی ہو۔ فرمایا: ''مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا'' ① ''جو ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔ اس کا ہمارے سے کوئی تعلق نہیں''۔

ادب میں محتملات کا لحاظ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میں نے واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ کلیر شریف جب کبھی حاضر ہوتے۔ عرس وغیرہ سے یہ حضرات بچتے تھے کہ بدعات ہیں۔ لیکن بہر حال اللہ والوں کی قبروں پر جاتے تھے، استفادہ بھی کرتے تھے۔ کلیر شریف حاضر ہوتے تو کلیر شریف رڑکی سے پانچ چھ

① السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، ج:۷ص: ۱۵۵ رقم: ۱۸۴۲.

میل کے فاصلہ پر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے تو چلتے وقت جوتے نکال دیتے تھے۔ ننگے پیر چھ میل کا فاصلہ طے کرتے۔ یہ محض ادب کا غلبہ حال تھا۔ آپ اگر پوچھیں کہ کیا شرعاً ایسا کرنا ضروری تھا؟ تو شرعاً تو ضروری نہیں ہے کسی جگہ حکم نہیں ہے کہ جاؤ تو ننگے پیر جایا کرو۔ لیکن ادب جب غلبہ حال کے درجہ میں آتا ہے تو ادب و تادب کے وہ وہ محتملات سامنے آتے ہیں کہ ظواہر شریعت میں نشان بھی نہیں ہوتا۔ مگر قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ بھی ادب ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔ وہ قانونی عمل نہیں ہوتا، وہ اخلاقی عمل ہوتا ہے۔ قانون کی رو سے اسے واجب یا مستحب نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قلب اور محبت کے قانون کے لحاظ سے وہ واجب ہوتا ہے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عمر بھر سیاہ جوتا نہیں پہنا سرخ یا زرد رنگ کا پہنا کرتا تھے۔ فرمایا سیاہ رنگ کا جوتا ممنوع نہیں۔ مگر بیت اللہ کا غلاف سیاہ ہے۔ تو پاؤں میں اس رنگ کا جوتا کیسے پہنوں؟ اس ادب کی وجہ سے سیاہ رنگ کا جوتا پہننا چھوڑ دیا۔ پگڑی تو باندھتے سیاہ رنگ کی کہ یہ تو ادب کا مقام ہے مگر قدموں میں نہیں۔

اب اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! کسی روایت، کسی حدیث میں تو نہیں آیا تو حدیث میں تو ادب کا حکم آیا ہے۔ لیکن ادب جب رچ کر غلبہ حال کے درجہ میں آجاتا ہے تو بعید سے بعید چیز بھی ادب کے درجہ میں آتی ہو، انسان اس کا لحاظ رکھتا ہے اور عمل کرتا ہے جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض چیزیں بڑی محتملات ہوتی ہیں۔ لیکن آدابِ شرعیہ کے لحاظ سے وہ ضروری قرار پا جاتی ہیں۔

الغرض اس طرح سے یہ آداب سکھائے گئے کہ اس کے بغیر دین کا تحفظ نہیں ہوسکتا اگر دل میں ذرا سا بھی ان چیزوں کے لئے تمسخر و استہزاء کا مادہ موجود ہے تو دین اس کا صحیح سالم نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ضروری ہے کہ قلب کے اندر سنجیدگی وقار اور احترام ہو۔ آیات اور روایات کا اور ان شخصیتوں کا جن سے آیات و روایات اور دین کا تعلق ہے۔ جن کا ادب واحترام ضروری ہے جس کے بغیر دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا غایت درجہ ادب..... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حرم مکہ میں سیلاب آیا اور حرم شریف میں پانی بھر گیا تو مقام ابراہیم، یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی تھی بیت اللہ کی، وہ اب بھی محفوظ ہے اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان بھی ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہے۔ اس کے اندر وہ نشان محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ ① جب طواف کر کے دوگانہ ادا کرتے ہیں تو مقام ابراہیم کو بیچ میں لینا مسنون ہے۔ الغرض سیلاب جو آیا تو مقام ابراہیم پر بنی ہوئی عمارت کا برج گر پڑا اور وہ مقام ابراہیم کے اوپر آ گیا تو اس کا ایک کنارہ ٹوٹ گیا اور وہ کنارہ اسی وقت شریف مکہ کے خزانے میں پہنچا دیا گیا وہ چیز

① پارہ: ١، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ١٢٥.

مقدس تھی۔ شریف مکہ، علماء ومشائخ کو وقتاً فوقتاً اس پتھر کی زیارت کراتے تھے۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اس کے دو تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس میں سے ایک چھوٹا ٹکڑا، شریف مکہ نے ہدیہ کے طور پر بعض مشائخ کو دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح منتقل ہو کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ اس مقام ابراہیم کے ٹکڑے کو نکال کر پانی میں ڈالتے اور وہ پانی اہل مجلس میں تقسیم کیا جاتا۔ اس ٹکڑے میں سے کچھ ریزے گر گئے۔ حضرت نے فوراً ریزوں کو جمع کر کے آنکھوں کے سرمہ میں شامل کر لیا۔ جب آنکھوں میں سرمہ لگاتے تو وہ حل کیا ہوا پتھر بھی آنکھوں میں جاتا تو یہ ادب کی بات تھی۔ طبی اصول پر دیکھا جائے، تو آنکھوں کے اندر مٹی یا پتھر کا ریزہ ڈالنا بینائی کے لئے نقصان دہ ہے مگر اس چیز کی پرواہ نہ تھی۔

بینائی کیا چیز ہے؟ اس شرف کے مقابلہ میں جو مقام ابراہیم کی مجاورت اور قرب سے نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال دین کی بنیاد ادب وتوقیر اور تعظیم کے اوپر ہے۔ اللہ اور شعائر اللہ کی تعظیم، بیت اللہ، کتاب اللہ، اہل اللہ کی تعظیم، غرض جو بھی اللہ کی طرف سے منسوب ہو جائے۔ اس کی عظمت وتوقیر کرنا یہ دین کی بنیاد ہے۔

اختلاف رائے...... مشائخ لکھتے ہیں اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو اور فرض کیجئے کہ اس کی سنت کے خلاف کوئی بات دیکھے اور ارادہ کیا کہ کسی متبع سنت سے بیعت ہو جائے۔ تو مشائخ بالا جماع لکھتے ہیں کہ اس شیخ سے بیعت ترک کر دینی چاہئے۔ جس سے سنت کے خلاف اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن بے ادبی کا کلمہ کبھی نہیں کہنا چاہئے۔ گستاخی کا کلمہ کبھی نہ کہے۔ اس کے حق میں کبھی جائز نہیں کہ اس کی بے ادبی کرتا پھرے۔ ورنہ معنویت اور روحانیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ وہی احترام کی بنیاد ہے کسی عالم سے فرض کیجئے کہ آپ کسی مسئلہ میں مختلف ہو جائیں یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے۔ تو مسئلہ میں اختلاف کرنا تو جائز ہے، جب اپنے کو "دِيَانَةً عَلَى التَّحْقِيْق" سمجھے، لیکن بے ادبی اور تمسخر کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے اور اختلاف کرنا محبت سے، یہ عین دین ہے۔ دین جائز ہے اور خلاف دین جائز نہیں۔ اختلاف رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے احکام اور اوامر کا جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے زنی جائز نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [1] "کسی مومن اور مؤمنہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آجائے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو پھر اس کے سامنے چوں وچرا کی جائے"۔

تو جہاں تک احکام دین کا تعلق ہے رسول تبلیغ فرما دیں تو تامل بھی جائز نہیں۔ چہ جائیکہ قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رسول یہ فرمائیں کہ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ اگر آدمی نہ مانے تو اس پر کوئی الزام وملامت نہیں۔ حدیث میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان ہوا، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی تھیں۔ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ، بریرہ

---

[1] پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶.

رضی اللہ عنہا کے سوجان سے عاشق تھے اور بریرہ رضی اللہ عنہا کو نفرت تھی۔ اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی اور منکوحہ اگر آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا نہ رکھنا، اس کے اختیار میں ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ فلاں شخص غلام ہے تو جائز ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ اب حضرت مغیث رضی اللہ عنہ پریشان ہیں، وہ سوجان سے عاشق اور بریرہ رضی اللہ عنہا کی طبیعت کو مناسبت نہیں اور بات آ گئی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ۔ تو لکھا ہے حضرت مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کی گلیوں میں پھر رہے ہیں، رو رہے ہیں، آنسو داڑھی پر گر رہے ہیں، اور ہر ایک کے پاس جاتے ہیں کہ تم سفارش کر دو کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نکاح کو فسخ نہ کرے، آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا یا رسول اللہ! آپ بریرہ کو فرمائیں کہ وہ نکاح نہ توڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے بریرہ! نکاح کو فسخ مت کرو۔ مغیث کا برا حال ہے۔ اسے محبت اور تعلق ہے۔ مگر بریرہ رضی اللہ عنہا بہت دانش مند تھی۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا حضور کی ذاتی رائے ہے؟ فرمایا نہیں مشورہ ہے، حکم شرعی نہیں، عرض کیا میں تو نہیں مانتی، فرمایا تجھے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا حق ہے۔ یعنی کوئی ملامت اس میں نہیں۔ نہ انبیاء کی نہ شریعت کی، یہ الگ چیز ہے کہ ادب کی وجہ سے ہم حضورؐ کے منشاء کو بھی سوائے حکموں سے زیادہ سمجھیں گے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے پہلے پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکم خداوندی ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے؟ جب معلوم ہوا، فرمایا کہ میں نہیں مانتی۔ ذرہ بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر گرانی نہیں ہوئی، لیکن رائے کے نہ ماننے کی وجہ سے کیا یہ جائز تھا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا معاذ اللہ، ادنیٰ درجہ کی شان رسالت میں بے ادبی کرے۔ اگر ذرہ بھی بے ادبی ہوتی دین ختم ہو جاتا۔ ادب اور عظمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ لیکن شریعت نے جو حق دیا، اس کو استعمال کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو نہیں مانتی یہ میرا خانگی معاملہ ہے اور اگر حکم شرعی ہے تو سر جھکا ہوا ہے۔ اسے سے اندازہ ہوا کہ اختلاف رائے اگر اہل اللہ اور علماء میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بہرحال عالم دین ہے۔ جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے اس کی عظمت واجب ہوگی۔

ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پچاسیوں مسئلوں میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر ادنیٰ درجہ کی بے ادبی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں نہیں آتی۔ اور جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجبُ التعظیم ہیں، ویسے ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ دونوں ماہتاب و آفتاب ہیں دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجہ کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے..... گستاخی و استہزاء کرنا جہالت کی بھی علامت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاح مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کا گوشت میت

سے ملادیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ ① آپ کیا مذاق کرتے ہیں؟ اس بات میں کیا تعلق ہے کہ گوشت کو مردہ سے ملادیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ② میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں، یعنی دل لگی، تمسخر جاہلوں کا کام ہے، عالموں کو مناسب نہیں کہ تمسخر کریں۔ اس لئے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی، بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں۔ اختلاف جائز ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد رضا خاں (مرحومان)...... میں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم سے بہت سی چیزوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ قیام، عرس، میلاد وغیرہ مسائل میں اختلاف رہا۔ مگر جب مجلس میں ذکر آیا تو فرماتے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھنے والے ایک شخص نے کہیں بغیر مولانا کے احمد رضا کہہ دیا۔ حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا کہ عالم تو ہیں، اگر چہ اختلاف رائے ہے۔ تم منصب کی بے احترامی کرتے ہو، کس طرح جائز ہے؟۔ رائے کا اختلاف اور چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ان کی توہین اور بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مولانا'' نہ کہنے پر برا مانا، حالانکہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابل جو مولانا تھے وہ انتہائی گستاخی کیا کرتے تھے۔ مگر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم میں سے تھے۔ وہ تو نام بھی کسی کا آیا، تو ادب ضروری سمجھتے تھے۔ چاہے بالکل معاند ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔

کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلوک...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سنا کہ دہلی کا قیام تھا، حضرت کے خدام میں سے چند مخصوص تلامذہ ساتھ تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ امروہی، حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر فرمایا کہ بھی! لال کنویں کہ مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قرات بہت اچھی ہے۔ کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھ لیں۔ تو شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر کرتا ہے۔ ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جملے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پہنچے۔ اگلے دن حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے اس امام کے پیچھے جا کر نماز پڑھی۔ سلام پھیرا، چونکہ یہ اجنبی تھے۔ نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علماء صورت، تو پوچھا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد قاسم ہیں اور وہ ان کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود احسن اور یہ مولانا احمد حسن محدث امروہی، ان کے تلمیذ ہیں۔ امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن انہیں کافر کہتا ہوں اور یہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔

نماز کے لئے میرے پیچھے آ گئے۔ امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ حضرت میں آپ کی تکفیر کرتا تھا، میں آج شرمندہ ہوں۔ آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ حالانکہ میں آپ کو کافر کہتا رہا۔ حضرت نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے کیوں؟ اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں توہین رسول کرتا ہوں۔ تو آپ کی غیرت ایمانی کا یہی تقاضا تھا۔ ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔ مگر بہرحال تکفیر کی بنیاد توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمان کرے گا، تکفیر واجب ہوگی، دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ تو فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی غیرت ایمانی کی قدر ہے۔ ہاں شکایت اس لئے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط، تو میں یہ عرض کرنے آیا ہو کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی کی توہین کرے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں۔ ''اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ...... ''اب امام بے چارہ قدموں پر گر پڑا، بچھا جاتا ہے۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں تواضع لِلّٰہ اور ادب مع اللہ اس درجہ رچا ہوا تھا کہ نفسانیت کا شائبہ نہ رہا تھا۔ استہزاء اور تمسخر تو بجائے خود ہے اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صحیح محمل پر اتار کر یہ کہتے ہیں کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں۔ یہ ان کی قوت ایمانی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ تحقیق کر لینی چاہئے کہ واقعہ ہم توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں؟ ہم معاذ اللہ دشمنان رسول ہیں یا دوستان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی بلا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہئے۔ تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادب دین کی بنیاد ہے۔ جس کو عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

از خدا خواہیم توفیق ادب ۔۔۔ بے ادب محروم گشت از فضل رب

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں جو گستاخ اور بے ادب ہے۔

بے ادبی کی وجہ سے علمی فیض سے محرومی...... بہت سے ایسے فضلاء ہماری نگاہوں میں ہیں۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ اچھے اور ذی استعداد تھے۔ مگر اساتذہ سے بے ادبی کا معاملہ تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد علم کی خدمت سے محروم رہے، کوئی دکانداری کر رہا ہے، کوئی گاڑی چلا رہا ہے۔ یہ نصیب نہیں ہوا کہ محدث یا مفسر بن کر بیٹھیں اور ایسے بھی ہماری نگاہوں میں ہیں کہ استعداد اور علمی قوت بہت محدود تھی۔ لیکن تادب اور خدمت اتنی تھی کہ رات دن اساتذہ کی خدمت میں ادب کے ساتھ لگے رہتے، اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اتنی خدمت کر رہے ہیں کہ بڑے بڑے ذی استعداد فضلاء اتنی نہیں کر رہے، تو مقبولیت ان کے اندر ادب کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تادّب کا دوسرا واقعہ...... حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک رسالہ خود لکھا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو انکے مرید ہیں، دیا کہ اس کی نقل کر کے لاؤ، اس کے

اندر ایک جگہ املاء کی غلطی تھی، عین کے بجائے ہمزہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے ازخود صحیح نہیں لکھا بلکہ وہ جگہ چھوڑ دی اور حضرت سے آ کر کہا کہ یہ لفظ سمجھ میں نہیں آ تا، یہ کیا ہے؟ تو اشتباہ کا راستہ اختیار کیا تلقین کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ شیخ کو جا کر یوں کہیں کہ آپ نے غلط لکھا یہ جرأت نہ تھی کہ یوں کہیں کہ یہ غلطی ہوگئی۔ گویا صورتاً بھی بے ادبی نہ کرسکے۔ حقیقتاً بے ادبی کیا کرتے؟

اَدب سے غفلت برتنے کا نتیجہ...... بہر حال دین کا دارومدار تادبات اور آداب پر ہے۔ یہ شریعت کا مستقل باب ہے، جہاں احکام ہیں وہاں اس کے ساتھ کچھ آداب ہیں۔ ادبیات پر اگر آدمی قادر نہ ہو تو وہ اصل احکام سے بھی کورا اور محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے آداب کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے غالباً ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں، نقل کئے دیتا ہوں۔ تفسیر فتح العزیز میں ہے۔ ''مَنْ تَهَاوَنَ فِي الْاٰدَابِ حُرِمَ مِنَ السُّنَّةِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالسُّنَّةِ حُرِمَ مِنَ الْوَاجِبَاتِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْوَاجِبَاتِ حُرِمَ مِنَ الْفَرَآئِضِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْفَرَآئِضِ حُرِمَ مِنَ الْمَعْرِفَةِ۔'' ''جس نے آداب پر عمل کرنے میں سستی دکھلائی، وہ سنت سے محروم ہو گیا جس نے سنت پر عمل سے سستی کی وہ واجبات سے محروم ہو جائے گا اور جس نے واجبات پر عمل سے سستی دکھلائی وہ فرائض پر عمل سے محروم ہو جائے گا اور جس نے فرائض کی ادائیگی میں سستی کی وہ اس کی پہچان سے محروم ہو گیا''۔ فرائض پر عمل کرے گا تو معرفت بڑھے گی۔ اس واسطے سنتوں کو مکمل فرائض کہا گیا تو جس نے آج سنتیں چھوڑ دیں، صرف فرائض کو پڑھ لیا کل وہ بھی نہ پڑھے گا۔ رفتہ رفتہ محروم ہو جائے گا۔

سدِ ذرائع اور اس کی امثلہ...... شریعت میں احکام کی دو قسمیں ہیں۔ مامورات یعنی کرنے کی چیزیں اس کے لئے آداب رکھے گئے کہ انہیں کرو گے، تب جا کر مأمورات پر عمل کرنا نصیب ہوگا اور ایک منہیات ہیں، روکنے کی چیزوں میں مکروہات رکھے گئے کہ مکروہات سے بچو گے، تب حرام سے بچنا نصیب ہوگا اور اگر مکروہات میں ڈوبے رہو گے تو ایک نہ ایک دن حرام میں پڑ جاؤ گے اور اس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی ذرائع اور وسائل سے بچانا تاکہ اصل ممنوع سے بچ جائے اور واجبات میں وسائل کو اختیار کرنا تاکہ فرائض پر عمل نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں سدِ ذرائع۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَآ اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ'' ① ''جس چیز کے زیادہ حصہ میں نشہ ہو اس کا کم حصہ بھی ناجائز ہے''۔ شراب کے ایک گھونٹ میں نشہ ہے۔ ایک قطرہ میں تو نہیں، لیکن قطرہ پینا بھی اس طرح حرام ہے، جس طرح گھونٹ پینا حرام ہے۔ حالانکہ حرمت تو سکر کی وجہ سے ہے اور ایک قطرہ میں ظاہر ہے کہ سکر نہیں۔ مگر سدِ ذرائع کے لئے ایسا کیا گیا کہ جو ایک قطرہ شراب پی لے گا، کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، پرسوں پورا

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الاشربة، باب النهی عن المسکر، ج:۱۰، ص:۱۰۶، رقم:۳۱۹۶. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج:۸ ص:۱۸ رقم:۳۶۸۱.

جام پیئے گا اور شرابی بن جائے گا۔ تو شرابی بننے سے بچانے کے لئے قطرہ کو حرام کیا گیا تا کہ وہاں تک پہنچنے نہ پائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ”مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) ① ”جو کسی جادوگر یا کاہن کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ کفر کیا“۔

حالانکہ جادوگر کے پاس سے جانے سے توحید ورسالت اور قیامت کا انکار نہیں ہوتا، کوئی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی فرماتے ہیں کہ اس نے شریعت اسلام کے ساتھ کفر کیا۔ اس لئے کہ آج جادوگر کے پاس گیا تو سحر کی برائی اس کے دل سے نکل گئی۔ تو کل کو سحر سیکھے گا اور پرسوں پورا جادوگر بن جائے گا۔ تو اسی جادو کے کفر سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کو کہتے ہیں سدِ ذرائع اصل مقصود کو کبیرہ گناہ کہتے ہیں اور وسائل کو صغیرہ گناہ تو وسائل سے روکتے ہیں تا کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔

مثلاً چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ کسی کے مال معصوم کو آدمی بلا اس کی مرضی کے اٹھا لائے۔ لیکن یہ تو ہے اصل خرابی۔ مگر اس کی وجہ سے کسی کے مال کو تاک جھانک کرنا، نقب لگانا، دیوار سے جھانکنا، یہ سب صغائر ہیں اور اسی لئے ناجائز ہیں کہ جب یہ کرے گا، تو ایک دن اصل بھی کر بیٹھے گا۔ گو اپنی ذات سے کسی کے سامان کو دیکھنا، کسی کی دیوار کو تاک لگانا ممنوع چیز نہیں۔ مگر اس لئے ممنوع ہوئے کہ یہ چوری کا وسیلہ بنتے ہیں۔ یا مثلاً زنا کے سلسلہ میں اصل ممنوع وہ فعل (حرام) ہے مگر اس سے بچانے کے لئے نامحرم عورت سے تخلیہ کرنا، اس پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، ہاتھ سے چھونا، سب ممنوع قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اصل حرام فعل کے ذرائع بنتی ہیں۔ تو شریعت نے چاہا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دواعی سے بھی بچو یہ سب شریعت کے آداب ہیں۔

عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں...... مامورات میں نماز فرض ہے۔ اس فرض کو بجالانے کے لئے کچھ چیزوں کا اہتمام کیا گیا کہ اذان جب سنو تو اس کا جواب دو تا کہ اذان سنتے ہی فکر پیدا ہو جائے کہ اب مجھے نماز کو جانا ہے۔ اس کے بعد وضو کا اہتمام کرو۔ پھر ترغیب دی گئی کہ مسجد میں جاؤ گے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک بدی مٹادی جائے گی۔ حالانکہ قدم رکھنا اپنی ذات سے کوئی عبادت نہیں۔ لیکن نماز کے لئے قدم رکھنا عبادت قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ قدم نماز پڑھنے کا ذریعہ بنے گا۔ تو اس اذان کا جواب دینا، قدم اٹھانا، وضو، استنجا اور طہارت وغیرہ کی فضیلت آئی۔

اہل اللہ کو نیکی کی حرص...... حتیٰ کہ بعض اہل اللہ کی یہ شان سنی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ اگر مسجد کے دو راستے ہوں۔ ایک ذرا لمبا راستہ اور ایک مختصر راستہ، تو لمبا راستہ اختیار کرتے اور فرماتے، جتنے قدم زیادہ پڑیں گے، اتنی بدیاں مٹیں گی۔ تو کیا ہم محروم رہیں اور ساتھ میں قدم بھی چھوٹے چھوٹے رکھتے۔ یعنی بالطبع چال سے کم چال سے چلتے کیونکہ قدم اٹھانے پر اجر کا وعدہ ہے تو یہ ہمارے

① مسند احمد، ج: ۱۹، ص: ۲۱۴، رقم: ۹۱۷۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهيب ج: ۳ ص: ۹۸.

اختیار میں ہے کہ جتنے چاہیں قدم رکھیں تاکہ نیکیاں اتنی لکھی جاویں۔ سوقدم سے اگر مسجد تک پہنچتے تو آہستہ آہستہ چل کر انہیں دوسوقدم بنا دیتے۔ اور یہ حضرات نیکیوں پر حریص ہوتے ہیں جیسے دنیا والے دنیا کے بارے میں کہ انہیں سول جائے تو ہزار اور ہزار مل جائے تو لاکھ اور لاکھ مل جائے تو کروڑ کی تمنا اور حرص ہوتی ہے۔ اللہ والے دین کے بارے میں ایسے ہوتے ہیں۔ اگر ایک ثواب ملتا ہے تو اس پر قناعت نہیں، دومل جائیں تو تیسرے کی خواہش۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... امام ابوداؤد بہت بڑے محدث ہیں۔ وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے اور کنارے پر پانی کم تھا۔ ایک جہاز دو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا کنارے تک آ نہیں سکتا تھا۔ جہاز میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا اور اتنے زور سے کہا کہ ان کے کان میں آواز آئی تو مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جواب ''یَرْحَمُکَ اللہُ'' کہہ کر دینا چاہئے۔ مگر یہ مسئلہ مجلس سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو تم گھر سے جواب دینے جاؤ۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کی آواز پڑی۔ یہ لوگ چونکہ نیکیوں کے حریص تھے۔ چھوٹی سی نیکی ملنے کا امکان ہو تو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ نیکی اور خیر کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاز دور تھا، آواز پہنچ نہیں سکتی تھی۔ تین درہم میں کشتی کرایہ پر لی۔ اس میں بیٹھ کر جہاز کے اوپر چڑھے۔ وہاں جا کر کہا ''یَرْحَمُکَ اللہُ''۔ ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ غیب سے آواز کان میں آئی کہ اے ابی داؤد! آج تین درہم میں تو نے جنت کو خرید لیا۔ حالانکہ امام کتنے بڑے محدث، کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے تہجد پڑھے، کتنے جہاد کئے ہوں گے مگر جنت کی خریداری میں بڑے بڑے اعمال کا ذکر نہیں بلکہ ذکر آیا تو ''یَرْحَمُکَ اللہُ'' کہنے کا، جو بظاہر بہت چھوٹا اور معمولی سا عمل تھا مگر کیوں آیا؟ اس لئے کہ ایسے اخلاص سے عمل کیا کہ اس چھوٹے سے عمل میں اتنا وزن پیدا ہوا کہ بڑے سے بڑے عمل میں اتنا نہ ہوگا اور اللہ کے ہاں عمل کی صورت نہیں، وزن دیکھا جاتا ہے۔ کشتی لے کر جہاز پر جا کر ''یَرْحَمُکَ اللہُ'' کہنا نہ فرض تھا نہ واجب مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص ہوتے ہیں تاکہ فرائض پر عمل کی کوتاہی نہ آئے۔ تو تادب مع اللہ اتنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی زیادہ ہوگئی۔ ایک دوسرے کے حق میں زبانِ طعن و ملامت اور زبانِ تضحیک کھولنا بہت معمولی بات بن گئی۔ اس واسطے میں نے یہ سمع خراشی آپ لوگوں کی کی، کہ اگر بالفرض کسی عالم سے اختلاف آ بھی جائے۔ تو اگر آپ خود عالم ہیں، تب آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متبع ہیں اور وہ اقتدی کر رہا ہے دوسرے عالم کی، تو عمل اپنے مقتدی و متبوع کی تحقیق پر کریں۔ مگر دوسرے کے ساتھ تمسخر کرنا آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں۔ بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی حجت ہے، جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو وہ کہتا ہے عند اللہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ اگر خطا ہو جائے تو بھی اسے اجر ملتا ہے اور آپ اس پر عقاب اور عذاب بھیجنے لگیں، یہ تو خدا کا مقابلہ ہو گیا۔ حق تعالیٰ کے ہاں اجتہادی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ آج کل فروعی اختلاف کی

وجہ سے مسخرہ پن بڑھ گیا ہے یہ دین کے منافی ہے۔ بے شک آدمی عمل اپنی تحقیق پر کرے اور دوسرے کو معذور رکھے۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرزِ عمل...... آئمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے، تو امام کا مسلک ہے، نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زور سے کہنا افضل واولیٰ ہے۔ مگر جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی، تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا مجھے حیا آتی ہے اس صاحب مزار سے کہ اس کے قریب آ کر اس کے اجتہاد سے خلاف کروں۔ یہ ادب اور تادب ہے۔ یعنی جس حد تک گنجائش ہو ایک تو حرام وحلال اور جائز و ناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز، دوسرے کے ہاں حرام، اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں اولیٰ اور غیر اولیٰ کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل پر عمل ترک کر دیا اور غیر افضل پر عمل کیا امام کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں۔ مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادب کی بات تھی۔

مسائل اور جذباتِ نفسانی...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے، آئمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں وہ صحابہ میں بھی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ادب واحترام اور عظمت وتعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ کے لئے مسائل کی خاصیت نہیں ہے، بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے کے لئے مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ لڑتے کیوں کہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔ اس کے بعد آئمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی۔ پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے، مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ دراصل اختلاف رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔ جب مسلمانوں کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں۔ نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت، سوچا کہ بھئی! دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو آڑ بناؤ تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے فروعی اختلاف پر عیسائی جج کا طنز......ایک عرصہ پہلے ایک یورپین عیسائی کلکٹر تھا۔ اس کے زمانہ میں احناف اور اہل حدیث میں لڑائی ہوئی اور لڑائی ''آمین'' کہنے پر ہوئی۔ حنفیوں نے آہستہ پڑھی۔ اہل حدیث نے زور سے کہی تو لاٹھی چل گئی۔ بہت لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ کلکٹر کے ہاں گیا۔ فریقین کے وکلاء نے کلکٹر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی! آمین کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں؟ وکلاء نے کہا،

نہیں آمین ایک قول ہے جو زبان سے نکالتے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر سے حدیث آئی ہے کہ آمین زور سے پڑھو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے، آہستہ پڑھو اس نے کہا، جس کو جو حدیث معلوم ہے اس پر عمل کرے۔ تم لڑتے کیوں ہو؟ اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے کی بات بھی نہ تھی۔

بہرحال اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی مثل دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک "آمِیْن بِـالْجَهْر" زور سے پڑھنا، ایک "آمِیْن بِالسِّر" آہستہ پڑھنا اور ایک "آمِیْن بِالشَّر" یعنی جھگڑنے، لڑنے کے لئے پڑھنا اس لئے کہ پہلے دونوں کے بارے میں حدیث موجود ہے ایک کو ایک امام نے، دوسرے کو دوسرے امام نے اختیار کر لیا۔ اس میں لڑائی کی بنیاد ہی نہیں۔ یہ آمین بالشر کی لڑائی ہے۔ لہٰذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لئے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لئے، وہ دیانتاً حجت سے رائے قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں تو یہ ہمارے قلوب کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کے لئے آڑ بنالیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لئے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں راہ صواب...... اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے کیونکر اس سے مسخرہ کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزاء کرے۔ آپ نے بیان کیا امر بالمعروف کا حق ادا ہو گیا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا، نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عنداللہ جواب دے گا تم ذمہ دار نہیں، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا اور پھر دین منوانا (یعنی اصول دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا بھی ضروری ہو۔ بہرحال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت...... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں مقام پر جا کر دین کی تبلیغ و اشاعت کرو، چلتے چلتے مرید نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمایئے مجھے شیخ نے فرمایا کہ دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ مت کرو اور نبوت کا دعویٰ مت کرو۔ وہ حیران ہوا کہ حضرت! میں برسہا برس آپ کی صحبت میں رہا۔ کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ تھا کہ میں خدائی اور نبوت کا دعویٰ کروں گا؟ فرمایا کہ خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو، پھر بات کرو۔ خدا کی ذات وہ ہے کہ وہ جو کہہ دے وہی اٹل ہو اس سے اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو انسان اپنی رائے کو اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اٹل ہو۔ اس کے خلاف نہ ہو سکے۔ کوئی بندہ اپنی رائے پر اتنا اصرار کرے، تو اس سے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ کیا ہو گا؟ اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے وہ سچی بات ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے قول کے بارے میں کہے کہ یہ

اتنی سچی بات ہے کہ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ وہ در پردہ گویا نبوت کا مدعی ہے کہ میری بات غلط نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کی رائے ہے۔

فساد یا اصلاح؟ ...... تو ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے۔ یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں فساد ہے۔ تو ایک چیز کو چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے۔ تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکہ دار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خوامخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔

تبلیغی اور ترجیحی مسائل میں فرق ...... ہاں ایک ہیں دین کے اصول، نماز فرض ہے، روزہ رکھنا، زکوۃ دینا فرض ہے۔ آپ زور سے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں۔؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذاہب ہی نہیں آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو! تم حنفی بن جاؤ اور شافعی مت بنو۔ یا شافعی کہے کہ لوگو! شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو یہ ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذاہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کو کوئی جزئی تحقیق ہو۔ خوامخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔ بہر حال آج کل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے۔ بہت گستاخی، جسارت اور جرات ہو رہی ہے اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے عمل کی۔

"اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَیْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَیْرِ"

حقوق مالیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ①

بدن اور اس کی ضروریات کا خالق...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنا نہیں ہے۔ مختصر طریق پر چند کام کی باتیں آپ حضرات کے سامنے گذارش کروں گا اور اس میں بھی کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا تمہید جو اصل مقصود کی باتیں ہیں، وہی کہنی ہیں۔ اتنی بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارا خالق اور مالک اللہ رب العزت ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارے بدن کو بھی اور ہماری روح کو بھی اور روح و بدن کے لئے جن سامانوں کی ضرورت ہے، ان سامانوں کو بھی اس نے پیدا کیا۔ بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت تھی۔ تو زمین سے لے کر آسمان تک ان ضروریات کو پھیلا دیا۔ زمین میں طاقت رکھ دی کہ ہماری غذائیں اگائے۔

اس میں طاقت رکھ دی کہ ہمارا لباس بھی اگائے۔ گویا زمین کو اللہ نے غذاؤں کا گودام بنا دیا۔ یہ گیہوں چنے، چاول، پھل پھول اور فروٹ سب اسی سے نکلتے ہیں۔ پھر اپنی حکمت سے زمین ہی کو سڑک بنا دیا۔ ہم اس پر چلتے پھرتے ہیں۔ پھر زمین ہی میں ہمارے لئے پانی کا سامان رکھا اور دریا جاری کر دیئے، زمین ہی کے اوپر ہوائیں پھیلا دیں کہ ہم سانس لے سکیں۔ تو زمین گودام، واٹر ورکس، اور ہمارے کپڑوں کا صندوق بھی ہے جس سے روئی اور جانوروں کی اون نکلتی ہے۔ ساری بدنی ضروریات اس میں مہیا کی ہوئی ہیں۔

بدن کو روشنی کی ضرورت تھی تو پہلے آسمان کی چھت قائم کی۔ اس میں چاند سورج اور ستاروں کے انڈے

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۴۔

لٹکا دیئے پھر ایک ہی چیز سے بہت سے کام لئے سورج ہمیں روشنی بھی بخشتا ہے۔ گرمی کی ضرورت ہے تو حرارت بھی بخشتا ہے۔ ٹائم اور وقت کی ضرورت ہو تو اچھی خاصی گھڑی بھی ہے۔ جس سے ہم اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ستاروں سے لوگ راستے بھی پاتے ہیں سمندروں میں جہاز رانی ہوتی ہے وہاں سڑکیں بنائی ہوئی نہیں ہوتی سمتوں سے چلتے ہیں اور سمتیں ستاروں سے متعین کرتے ہیں۔ تو ستاروں سے راہ، سورج سے روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ نیز ستاروں سے جڑی بوٹیوں میں خاصیتیں اور تاثیر پیدا ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کی نلیوں میں گودا اور روغن پیدا ہوتا ہے۔ غرض انسان کے لئے جتنی بدن کی ضروریات درکار ہیں۔ وہ سب زمین اور آسمان کے وسط میں رکھ دی ہیں تو وہ ہمارے بدن کا بھی خالق ہے اور بدن کی ضروریات کا بھی۔

روح اور اس کی ضروریات کا خالق...... اسی طرح وہ ہماری روح اور اس کی ضروریات کا بھی خالق ہے۔ جیسے بدن کی ضروریات ہیں، بدن کے لئے غذا کی بھی ضرورت ہے تو روح کے لئے بھی ضرورت ہے۔ بدن کو اگر راحت کی ضرورت ہے تو روح کو بھی سکون وتسکین کی ضرورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بدن مادی چیز ہے اس کے سامان بھی مادی ہیں روح ایک پاکیزہ اور لطیف چیز ہے اس کے سامان بھی لطیف ہیں روح کی غذا علم ومعرفت، اخلاق ربانی اور ملکیت ہے۔ یعنی ملائکہ کی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں۔ اس سے روح کو سکون ملتا ہے۔ روح کو آپ کے اس روٹی اور کپڑے کی ضرورت نہیں ہے اس کا روٹی کپڑا اس کے مناسب حال ہے جو علم کمال دین ودیانت اور اخلاق ہے۔

جس طرح پانی کے لئے بادل مقرر کئے جو اپنے وقت پر آ کر برس جاتے ہیں، جس سے آپ کی زمین سیراب ہوتی ہے اس طرح علم کے بادل پیدا کئے وہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسّلام ہیں جن کے ذریعے وحی کی بارش ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا الخ'' ② میری اور میرے دائرہ علم وکمال ایسی مثال ہے جیسے بہت زور کا بادل اٹھا اور گھٹا اٹھی اس میں سے بارش برسنی شروع ہوئی موسلا دھار پانی پڑا تو زمین کی تین قسمیں ہو گئیں۔ ایک زمین وہ ہے جو پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور پھل پھول اگا کر باغ و بہار بنا دیتی ہے، ایک وہ کہ باغ و بہار اور پھل پھول نہیں نکالتی لیکن پانی کو جمع کر لیتی ہے گہرے تالاب ہیں ان میں پانی بھر جاتا ہے پھر لوگ وہاں سے پانی لے کر پیتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ جو بالکل چٹیل میدان ہے۔ جس میں نہ اگانے کی صلاحیت ہے نہ پانی کے جمع کرنے کی، پانی آیا اور بہ کر نکل گیا۔ نہ جمع کیا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں نہ کوئی پھل پھول ہی اگایا کہ خود اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک قلوب وہ ہیں کہ جب وحی کا پانی آتا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۶۔

② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۷.

ہے تو وہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے علم وحکمت کے پھل پھول نکال کے پیش کرتے ہیں۔ جس سے روحانیت میں باغ و بہار آ جاتی ہے۔ یہ ہیں فقہاء کہ دین اور علم پہنچا، انہوں نے اجتہاد کیا مسائل نکال نکال کر دنیا کے آگے رکھ دیئے تا کہ لوگ عمل کریں۔

ایک قلوب کا وہ طبقہ ہے، جو پھل پھول تو نہیں اگا سکتا مگر امانت داری کے ساتھ وحی کے پانی کو جمع کر لیتا ہے۔لوگ آتے ہیں، کوئی اس سے پیتا ہے، کوئی کھیتی کو دیتا ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے مُحدثین اور حفاظ قرآن حکیم کہ وحی آئی اور انہوں نے اسے اپنے سینے میں جمع کر لیا۔ ان میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس میں سے مسئلہ نکال لیں۔ مگر جو آئے گا، اسے پانی پہنچا دیں گے وہ اس میں سے مسائل نکال لے گا۔

تیسرا طبقہ گمراہ کہا گیا وہ ہے کہ وحی کا پانی برسا لیکن اس کے دل ایسے ہیں جیسے اونچی زمین ہوتی ہے کہ آیا اور بہہ گیا۔ نہ اس میں جمع ہوا نہ پھل پھول نکلے۔ جیسے مادی پانی کے لحاظ سے زمین کی تین قسمیں ہیں اسی طرح وحی کے پانی کے اعتبار سے بھی قلوب کی تین قسمیں ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے جیسے بدن کے لئے غذائیں پیدا کی گئیں روح کے لئے بھی پیدا کی گئیں، بدن کی غذا بھی ہر ایک نہیں نکال سکتا۔ کسی کے اندر ایجاد کا مادہ ہے کہ زمین میں سے معدنیات نکالے، سونا چاندی اور سیسہ نکال کر طرح طرح کے سامان بنائے۔ ایک وہ مزدور ہیں جن میں یہ صلاحت نہیں ہے کہ وہ ایجاد کریں وہ سونا چاندنی نکال نکال کے پیش کریں۔ تا کہ دوسرے اس سے کام لیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن میں نہ عقل ہے نہ ہمت نہ ایجاد کر سکتے ہیں نہ وہ کوئی چیز جمع کر سکتے ہیں بلکہ دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ غرض جیسے وہاں تین قسمیں ہیں۔ یہاں بھی تین ہی قسمیں ہیں۔

روح وبدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے...... تو بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے روحانی غذاؤں علم وکمال وغیرہ کی ضرورت ہے اور یہ سارے سامان اللہ میاں نے پیدا کئے۔ تو ہم بھی، ہماری جان بھی، ہمارا مال بھی سب خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم اللہ کی ملک و مملوک ہیں۔ نہ ہمارا بدن ہماری ملک ہے نہ روح۔ ہم امانت دار ہیں مالک نے پیدا کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم امانت داری کے ساتھ اسے سونپ دیں اور صحیح کر کے اسے سونپیں تو ہم اس بدن کے خود مالک نہیں ہیں۔ یہ سرکاری مشین ہے۔ اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔

اس لئے اگر بدن پر بیماری آ جائے تو سنت ہے کہ علاج کیا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے کہ ہماری ملک ہو تو چاہے اپنے کو ختم کر دیں، چاہے قتل کر دیں، خودکشی کر لیں۔ مگر یہ ہماری ملک نہیں، مالک کی چیز ہے۔ ہمیں امانت داری کے ساتھ اسے سونپنا ہے اس واسطے اس کے کہنے کے مطابق ہم بدن میں تصرف کرتے ہیں، بدن بیمار ہو تو علاج کرتے ہیں۔ پھوڑا پھنسی ہو تو مرہم لگاتے ہیں اندر کا زخم ہو تو آپریشن کراتے ہیں، دوائیں پیتے ہیں تا کہ صحت ہو جائے اسی طرح روح کے اندر بھی پھوڑے اور پھنسیاں نکلتی ہیں۔ بیماریاں بھی آتی

ہیں۔ اخلاق کی بیماریاں ہیں اگر بداخلاقی پیدا ہوگئی۔ حرص، حسد، بغض، تکبر اور غرور پیدا ہوگیا دوسرے کو ایذاء پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوگیا یہ روح کی بیماریاں ہیں۔

جیسے بدن کی بیماریوں میں علاج کے لئے آپ ڈاکٹروں اور اطباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ اس کی تدبیر جانتے ہیں، مادی ڈاکٹر نہیں جانتے۔ وہی بتا سکیں گے کہ تکبر کو کیسے دور کریں، لالچ کو کیسے چھوڑیں، حسد کو کیسے دور کریں۔ اس کے علاج اور تدبیر کے لئے کتابیں ہیں علوم وفنون ہیں۔ جو قرآن وحدیث میں سب بیان کردیئے گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہم نہ اپنے بدن کے مالک نہ روح کے مالک اور جب ہم اپنے بدن اور روح کے مالک نہیں ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ہم آسمان اور زمین کے مالک کیسے ہوئے؟

روح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے...... اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر آپ بدن وروح کے مالک ہوتے تو جان آپ کے قبضے میں ہوتی۔ کوئی بھی نہ مرا کرتا، کسی کا انتقال نہ ہوا کرتا، کوئی مارتا تو فوراً کہتے کہ میں مالک ہوں۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری جان نکال سکے تو ملک الموت سے بڑی لڑائیاں ہوا کرتیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ آپ جان نکالنے آگئے جان تو میری ہے۔ مگر جب جان نکلنے کا وقت آتا ہے تو ایک منٹ کے لئے نہیں روک سکتے۔ پیدا بھی ہونا ہی پڑتا ہے، مرنا بھی پڑتا ہے، نہ جینا اپنے قبضے میں نہ مرنا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ نہ ہم جان کے مالک ہیں نہ بدن کے مالک اگر بدن پر ہمارا تسلط ہوتا، ہم کبھی بیمار نہ ہوتے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بدن خراب ہو، یا میرا بدن کمزور پڑ جائے۔ لیکن جب بیماری آتی ہے، بیمار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب کوئی آفت آتی ہے تو سہنی ہی پڑتی ہے۔

اس لئے جیسے بدن دوسرے کا ہے، اسی طرح اس پر عوارض آتے ہیں، وہ دوسرے کی طرف سے آتے ہیں۔ تو جب اسی طرح سے ہم بے بس ہیں کہ نہ آنا ہمارے قبضے میں، نہ جانا ہمارے قبضے میں۔ قضا لاتی ہے، آنا پڑتا ہے قضا لے جاتی ہے، جانا پڑتا ہے۔ جب ہم اپنے مالک نہیں تو اس زمین وآسمان کے مالک کیسے ہوئے؟ اسی طرح رات دن، اس کے بھی مالک نہیں۔ یہ ہمارے قبضے میں نہیں کہ رات کو لمبا اور دن کو چھوٹا کردیں۔ یہ اس کے قبضے میں ہے جو رات دن کو پیدا کررہا ہے۔ جب ہر صورت میں خالق ومالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بدن کو پیدا تو وہ کرے۔ عبادت ہم دوسرے کی کریں، حکم دوسرے کا مانیں، گردن دوسرے کے سامنے جھکائیں۔ اسی کے آگے گردن جھکے گی، جس نے گردن کو بنایا ہے، اسی کے آگے ہماری روح اور بدن جھکے گا، جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب مالک وخالق وہ ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں، تو غلام کا کام یہ ہے کہ بے چون وچرا مالک کے حکم پر گردن طاعت سے جھکا دے۔ سرکشی کرے گا تو غلامی سے نکل جائے گا۔ اسی لئے قرآن

کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری بندگی کریں''۔ اس لئے کہ جب ہم پیدا کرنے والے ہیں، ہم مالک ہیں، تو کون ہے جو ہماری بندگی نہ کرے ہمارے سامنے نہ جھکے۔

بندے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے...... آپ ارادہ کریں نہ کریں، جھکنا تو پڑتا ہے موت آئے گی تو آپ جھکیں گے؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں موت کو قبول کرتے، مجبور ہونا پڑے گا۔ صحت و بیماری آئے گی۔ مجبور ہو کے اسے قبول کرنا پڑے گا مالک کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔ محتاج کا کام یہ ہے کہ غنی کے آگے جھکے۔ اگر آپ غنی ہیں، جھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر غنی نہیں محتاج ہیں، تو پھر محتاج ہوئے تو جھکنا ہی پڑے گا۔ تو بجائے اس کے کہ آدمی مجبوراً جھکے، رضامندی سے کیوں نہ جھکے۔ مجبوراً تو آسمان، زمین اور پہاڑ بھی جھک رہے ہیں۔ یہ ان پر قہر ہے۔ لیکن انسان کو عقل وارادہ اور اختیار دیا گیا۔ تو اور چیزیں بلا ارادہ جھکتی ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ارادہ سے جھکے، عقل سے سوچ کر جھکے، اپنے اختیار سے جھکے۔ اسی کا نام عبادت ہے تو بندے کا کام بندگی کرنا ہے اور بندگی کا معنی غایت تذلل کے ہیں۔ پوری طرح اپنے مالک کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت ہے۔ یہ کیوں اختیار کرے۔؟ اس لئے اللہ کی اتنی عزت ہے کہ عزت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے ہاں نہ ہو۔ تو بندہ اس کے سامنے انتہائی ذلت ایسے پیش کرے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ انسان کے اندر سب سے بڑی چیز عزت کی اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ نماز میں زمین پر اس کو ٹیکا جاتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی سب سے زیادہ عزت کی چیز کو تیرے آگے پامال کرتا ہوں۔ کیونکہ تیری عزت سب سے بلند ہے۔ غرض بندے کا کام بندگی کرنا ہے۔ جان سے بھی، مال سے بھی اور آبرو سے بھی۔ اس لئے کہ عزت کی ضرورت پڑے تو وہ وہاں سے آئے گی۔ مال و جان کی ضرورت پڑے، وہ وہاں سے آئے گا۔ اس لئے کہ بندہ نہ اپنی جان کا مالک نہ اپنی آبرو اور مال کا مالک۔ تو بندگی کا حاصل یہ نکلا کہ مال، جان، آبرو، سامان سب سے عبادت کرے۔

اس لئے اللہ نے عبادتوں کی قسمیں رکھ دی ہیں۔ ایک جانی عبادت ہے، وہ جان سے ادا کی جاتی ہے۔ جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں بدن کو، روح کو جھکاتے ہیں اور حج کرتے ہیں اس کے لئے سفر کرتے ہیں۔ ایک مالی عبادت ہے۔ جیسے صدقہ اور زکوۃ دیتے ہیں اور غرباء کی خدمت کرتے ہیں۔ تو تینوں قسموں کی عبادتیں فرض کر دی گئیں۔ بندے کا کام یہ کہ جان، مال آبرو سے بھی جھکے۔ جان سے نماز میں اور آبرو سے حج میں جھکتا ہے۔

آبرو سے عبادت...... اس لئے کہ جتنے وقار اور ظاہری عزّت کے سامان ہیں، سب کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن میں آدمی آبرو اور وقار جتلاتا ہے۔ تو ملک چھڑوا دیا، تو جو وقار گھر کا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب مسافر بن کے چلا جا رہا ہے۔ پھر لباس آبرو اور وقار پیدا کرتا ہے۔ نیا لباس پہنا ہے، اکڑ کے چلتا ہے۔ تو حکم دیا گیا کہ لباس اتارو، کفنی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

پہنو، اور ننگے سر رہو۔ پھر آدمی بدن کی زینت سے اور چہرے کے بنانے سنوارنے سے وقار حاصل کرتا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ جب احرام باندھ لیا، بال، ناخن کتروانے کی اجازت نہیں، بدن میں جوئیں پڑ جائیں تو مارنے کی بھی اجازت نہیں، شکار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ بندہ عاشق بن کر جاتا ہے، عاشق کا زینت سے کیا کام؟ عاشق اگر اپنی زینت اور آرائش کرے گا تو محبوب کی طرف کیسے متوجہ ہوگا؟ وہ پکا عاشق نہیں اس لئے یہ سب کچھ چھڑوایا گیا محبوب کے گھر آیا تو پروانوں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے، طواف کر رہا ہے۔ محبوب نے کہا کہ منٰی جا، وہاں چلا گیا کہ سر منڈا، سر منڈا دیا۔ پھر کبھی آدمی چال سے وقار حاصل کرتا ہے کہ بن بن کر چلتا ہے۔ تو سارا وقار نکال دیا گیا۔ جب بیت اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ تو جس طواف کے بعد سعی کرنی ہوتی ہے، اس میں رَمل بھی ضروری ہوتی ہے۔ کہ چار پھیروں میں اکڑ کے چلے۔ اب کوئی عالم ہو، لمبی داڑھی ہو، وہ جھک کر چلتا، مگر اب اکڑ کے چل رہا ہے جیسے پہلوان جا رہے ہوں۔ پھر رمل کا حکم دیا گیا جب تم رمل کرو اور پہلوانوں کی طرح چلو تو اِحرام کی چادر کو دائیں مونڈھے کے نیچے رکھ کے بائیں مونڈھے پر ڈال لو، تو سارا بدن کھل گیا۔ جو لوگ اپنا بدن کھولنا وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ وقار بھی ختم ہو گیا اسی طرح صفا و مروہ میں دوڑنے سے وقار ختم ہوتا ہے۔

غرض وقار کی جتنی چیزیں تھیں۔ وہ سب ممنوع قرار دے دیں۔ تو حج میں آبرو ختم کر کے اسے مٹا کر عبادت کرائی جاتی ہے۔ نماز کا قصہ برعکس ہے کہ گھر سے نکلو تو دوڑ کے مت چلو فرمایا گیا: ''لَاتَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ۔'' ① ''مسجد میں آؤ تو وقار کے ساتھ چلو۔ ایسے دوڑ کے مت چلو جیسے بچے دوڑا کرتے ہیں''۔ وہاں یہ حکم تھا کہ لباس اتار کر کفنی پہنو۔ یہاں یہ فرمایا کہ پورا لباس پہن کر ننگے سر بھی نہیں، پورے وقار کے ساتھ نکلو۔ حج میں فرمایا کہ: خبردار! اگر تم نے خوشبو لگائی۔ نماز کے بارے میں فرمایا، خود بھی خوشبو لگاؤ اور مسجد کو بھی معطر کرو۔ تو بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ نماز میں جان سے اور حج میں آبرو سے عبادت کرائی جاتی ہے۔

عبادتِ مالی ...... اب مال رہ گیا تھا تو زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھ دی کہ اس میں سے غرباء کا حق نکالو۔ پہلی امتوں کو حکم یہ تھا کہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ کر دو ایک پائی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر تم نے رکھا تو تمہاری روحانیت نہیں بنے گی۔ اخلاق درست نہیں ہوں گے۔ بس کھا لیا، پی لیا اور پہن لیا۔ باقی جو زائد ہے، صدقہ کر دیا اور اگر کوئی صدقہ لینے والا نہ ملے، تو حکم یہ تھا کہ اس مال کو آگ لگا دو ''تَاْكُلُهُ النَّارُ۔'' آگ اس کو کھا لیتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ صدقہ قبول ہو گیا، لیکن یہ امت ضعیف ہے۔ اس واسطے رعایت کی گئی کہ کھاؤ بھی، پیو بھی۔ اگر بچ رہے تو یہ نہیں ہے کہ سب دے ڈالو۔ اس میں کچھ حقوق مقرر کر دیئے کہ اس طرح سے اپنے مال کو خرچ کرو اور اس میں فرائض مقرر کئے۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب السعی الی الصلوۃ، ج: ۲، ص: ۱۸۴، رقم: ۴۸۵۔ حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۲ ص: ۷۲ رقم: ۵۷۲۔

جس مال کے حاصل کرنے میں آدمی کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔اس میں اللہ نے اپنا حق کم کر دیا، تا کہ دینے میں آسانی ہو۔ جو مال کم محنت سے حاصل ہوتا ہے، اس میں اپنا حق بڑھا دیا کیونکہ دینے میں سہولت رہے۔ جس مال میں بالکل محنت نہ پڑے تو حصہ اور بھی بڑھا دیا۔ جسے حاصل کرنے میں آسانی تھی، تو دینے میں بھی آسانی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی کو دفینہ یا خزانہ مل جائے۔ مثلاً لاکھ دو لاکھ کا زمین سے مل جائے۔ تو یہ بلا محنت کے ملا کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی اتفاق سے جنگل میں گئے زمین کو کھودنے لگے تو ایک بڑی بھاری دیگ نکل آئی یہ بلا محنت ملا۔ اس میں حق تعالیٰ نے پانچواں حصہ رکھا ہے۔ اگر سو روپے ہیں تو پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرے گا۔ یعنی بیس روپے غرباء کا حق ہے اور اسی روپے تمہارا حق ہے۔ اس لئے کہ سو میں سے بیس دینا مشکل نہیں ہوگا۔ جبکہ اسی بھی بغیر محنت و مشقت کے مل رہے ہیں۔ چونکہ اس میں محنت کم تھی تو اللہ نے اپنا حق بڑھا دیا۔

اگر کھیتی باڑی کی، تو کھیتی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اپنا حق گھٹا دیا۔ دفینے میں پانچواں حصہ تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ دسواں حصہ دینا پڑے گا۔ یعنی سو روپے میں سے دس روپے دینے پڑیں گے۔ یہ بیت المال کا حق ہوگا جو غریبوں پر خرچ ہوگا۔ نوے روپے تمہارے اپنے ہیں تو کھیتی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حق گھٹا دیا۔

اور اگر آدمی تجارت کرنے لگے تو تجارت میں زیادہ محنت ہوتی ہے تاجر کا دماغ صبح سے شام تک لگا رہتا کہ مال بھی باقی رکھوں، سامان میں بھی کمی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ گاہک آئے اور میری دوکان میں چیز نہ ہو تو صبح سے شام تک دماغ لڑاتا ہے گویا محنت زیادہ کرتا ہے۔ یہاں سے مال منگواؤ، وہاں سے مال منگواؤ، کہیں بکنگ کا قصہ ہے، کہیں لاٹری کا سسٹم ہے۔ غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس میں پھر ہر ایک کو خوش رکھنا، گاہک سے بھی معاملہ نرمی سے کرنا، اگر گاہک نے کوئی بے تمیزی کی، پھر بھی تاجر کا فرض ہے کہ اخلاق سے پیش آئے۔ بد اخلاقی برتے گا تو گاہک دوکان چھوڑ کے چلا جائے گا۔

غرض یہاں بھر پور محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ نے اپنا حق اور کم کر دیا کہ تم بجائے خمس و عشر کے چالیسواں حصہ دے دو۔ سو میں سے اڑھائی روپے دے دو۔ تو سو روپے میں سے اڑھائی روپے دینے کوئی مشکل نہیں ہوتے۔ اور اس میں یہ آسانی کر دی کہ جس دن سو ہوئے، زکوٰۃ تو واجب ہوگئی، لیکن ادا کرنا واجب نہیں جب تک کہ ایک برس نہ گذرے ایک برس میں اگر اور کمائے گا، تو سو سے زیادہ ہو جائیں گے۔ پھر اڑھائی روپے دینا کچھ مشکل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ نے یہ عجیب اصول رکھا کہ جس میں بندے کی محنت بڑھتی ہے۔ اتنا اپنا حق گھٹا دیتے ہیں، جتنا بندہ بے محنت کمائے، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں تا کہ دینے کے اندر اسے عار نہ پیدا ہو، مشکل نہ پیش آئے۔

تو زکوٰۃ میں غریبوں کا حق رکھ دیا گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کمانے میں آپ اپنے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی۔ غریب بھی اسی طرح آپ کی اولاد ہے۔ اگر یہ آپ کی نسبی اولاد ہے تو حیثیت کے لحاظ سے وہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ ان کو اگر نہ دیا، آپ کے لئے پھر دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔ جب غریبوں کو حقوق

نہیں پہنچیں گے۔ پھر سرمایہ اور مزدور کا سوال پیدا ہوگا۔ وہ سارے کھڑے ہو جائیں گے کہ ان سرمایہ داروں کو نکالو یہاں سے اس میں زیادہ مصیبت پڑے گی۔

میں تو کہاں کرتا ہوں کہ اللہ میاں نے سو روپے میں اڑھائی روپے رکھے تھے۔ جب اس کے دینے میں پس و پیش کیا اور نہ دیا۔ تو اتنے بڑے بڑے ٹیکس لگوائے کہ اسی فیصد گورنمنٹ کا اور بیس فیصدی تمہارا۔ اگر اڑھائی روپے دیتے رہتے، تو ساڑھے ستانوے روپے تمہارے ہوتے لیکن اب سو کماؤ گے تو اسی حکومت لے گی، بیس تمہارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ یہ کفرانِ نعمت کا نتیجہ ہے۔ اگر خدا کا حق پورا دیتے رہتے اور اس کے اصول پر قائم رہتے۔ دوسرا غلبہ نہیں پا سکتا تھا۔

بہرحال شریعت نے یہ ایک اصول رکھا کہ جتنی محنت اور مشقت زیادہ ہے اللہ میاں اپنا حق گھٹا دیتے ہیں اور جب بندے کی محنت کم ہو، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً بکریاں ہیں، اگر تجارت کی ہوں تو چالیس بکریوں پر ایک بکری دینی پڑتی ہے اور گائے بیل ہوں، تو بیس گائے پر ایک گائے کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ بدن بڑھ گیا۔ تو اس کی تعداد گھٹا دی اور اگر اونٹ ہیں، پانچ اونٹ ہوں گے تو ایک اونٹ کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اونٹ گائے سے دوگنا تین گنا ہے۔ بدن بڑھ گیا، تو عدد کم کر دیا۔ تو عجیب حکمت سے ایک نظام قائم کیا ہے۔

عبادتِ مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم کرنا ہے...... اور مقصد یہ کہ امیر اور غریب کے اندر قرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو۔ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ غریب کو اوپر چڑھا دیا تاکہ توازن پیدا ہو جائے۔ یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا ایسی کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تاکہ غریب میں بانٹ دی جائے۔ اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو مضرت پہنچے گی۔

اوّل تو یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپیہ لے جاتا ہے۔ تو ہزار روپے کما کے لاتا ہے۔ اور ایک اتنا احمق ہے کہ ہزار روپے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو جائیں گے؟ تو جو محنت کرے گا، اس کا حق زیادہ ہوگا۔ جو نہیں کرے گا، اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہو گئے۔ بلکہ صراحۃً فرمایا: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھایا ہے۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا، کوئی امیر، کوئی غریب تاکہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور تمدّن پیدا ہو“۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدقہ کسے دیتے۔ جسے دیتے وہ کہتا، میرے گھر میں بہت سا پڑا ہوا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ تو تعاون اور ایک دوسرے

① پارہ: ۲۵ سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۳۲.

کی خدمت گذاری ختم ہو جاتی۔ اور اگر سارے کے سارے ہی بھک منگے ہوتے تو نہ آپ اسے دیتے، نہ وہ آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق، آپ اس سے بے تعلق۔ بالکل سارے مفلس ہوں جب بھی تعاون اور تمدّن نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں، جب بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تمدّن جبھی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں، کچھ غریب، امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر سے اَٹکی ہوئی ہو۔ اس واسطے حکمتِ باہمی اور تعاونِ باہمی کے لئے اللہ نے فرق پیدا کیا۔ تو فرق کو مٹا دینا یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقلوں کا فرق بھی مٹانا چاہئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے، اسے تو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بیوقوف ہے اسے عقلمند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپکے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے، رنگوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کالا، کوئی گورا۔ زبانوں میں اختلاف ہے۔ کسی کی عربی، کسی کی انگریزی، تو زبانوں، صورتوں، سیرتوں کا اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے، تو جب مختلف عقل سے کمائیں گے، اس میں بھی اختلاف ہوگا۔ کوئی زیادہ کمائے گا، کوئی کم کمائے، اب اگر آپ جبر کر کے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے تاکہ سب برابر ہو جائیں۔ اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بعد پیدا ہوگا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہو گئے فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دے دوں اس کا جی نہ چاہے گا فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا، جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہو جائے گا غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حق رکھ دیئے کہ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ یہ اوپر ہو جائے تاکہ محبتیں پیدا ہوں۔

مثلاً رمضان شریف آیا اور فرض کیجئے آپ ایک لاکھ کے مالک ہیں۔ اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا واجب ہوا۔ ایک لاکھ کا چالیسواں حصہ اڑھائی ہزار ہوگا۔ تو اڑھائی ہزار غریبوں کے لئے ہوگا۔ غریب نے کیا سمجھا کہ میں غریب ہوں ہی میرے سر پر ایسے امیر موجود ہیں۔ جو میری خدمت کرتے ہیں۔ میں غریب نہیں ہوں، میں بھی دولت مند ہوں۔ تو وہ شکر گزار ہوگا کہ یہ اولاد کی طرح مجھے پال رہے ہیں۔ اس کے دل میں محبت بڑھے گی۔ رمضان شریف میں آپ نے دس ہزار روپیہ بانٹا اور فرض کیجئے کہ دس بیس آدمی ہیں، انہوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں تقسیم کیا۔ اب یہ لاکھ دو لاکھ غریب کے پاس جو پہنچے گا۔ تو اس کے دل میں ممنونیت پیدا ہوگی کہ انہوں نے میری خبر گیری کی۔ یہ درحقیقت جتنے امراء ہیں، میرے ماں باپ کی جگہ ہیں، میں ان کی اولاد کی جگہ ہوں، مجھے ان کا حق پہچاننا ہے۔

امیر نے یہ سوچا کہ میرے سے خدا نے کام لیا، میرے سے ان کی خدمت کرائی۔ میری دنیا بھی بنی آخرت

بھی بنی۔ وہ غریب کا ممنون ہوگا کہ اگر یہ غریب نہ ہوتا تو میں صدقہ و زکوٰۃ کسے دیتا۔ خدا نے میرے سے ادا کرا دیا، میری دنیا و آخرت بن گئی۔ غریب اپنی جگہ خوش، امیر اپنی جگہ خوش اور دونوں میں محبت پیدا ہوگئی۔

لیکن اگر غریب آدمی کہے، جو کچھ امیر کے پاس ہے سب پر قبضہ کرلوں۔ تو امیر کے دل میں یہ ہوگا کہ اگر میں نے نہ بھی دیا یہ کم بخت اسے اٹھالے جائے گا اور غریب کے دل میں کیا آئے گا۔ وہ کہے گا، امیر کے ذمہ ہے ہمیں دینا۔ ہمیں کوئی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امیر کہے گا اگر میرا بس چل جائے تو میں سارے غریبوں کی گردن ماردوں۔ کمائی میری ہے، مزے یہ اُٹھارہے ہیں اور غریب اس فکر میں رہے گا کہ جتنے امیر ہیں سب تباہ ہوں۔ میرے پاس حکومت آئے، میں آج ہی سب کو ختم کردوں۔ جو برسرِ اقتدار آئے گا، وہ دوسرے کو ختم کرنے کی فکر میں رہے گا۔ یہ تو اسلام نے ایک توازن قائم کیا کہ غریب امیر کا محب اور عاشق بن جائے گا۔ امیر غریب پر شفیق اور مہربان بن جائے گا۔ تو تعاون، تمدن بھی بنا، محبتیں بھی بڑھیں لیکن جبری تقسیم اور مساوات و برابری سے غیض و غضب پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے اسلام نے پہلی چیز تو یہ رکھی کہ محبتِ باہمی اور خلوص سے امیر غریب کو دے۔ ایک حصہ پر جبر کیا گیا کہ چالیسواں حصہ بھائی کو ضرور دو۔ ورنہ وہ بھائی ہی نہیں۔ اگر آخرت پیشِ نظر ہو تو خوش ہوگا کہ میری آخرت بن گئی۔ تو رمضان میں تو آپ نے یہ دیا۔

اب رمضان گزرا تو عیدُ الفطر آئی، تو اسلام نے صدقہ فطر واجب کردیا۔ ہر بچے کی طرف سے خواہ وہ عید سے پہلے ہی پیدا ہو، اس کی طرف سے بھی دینا پڑے گا۔ اب اگر ایک گھر میں بارہ آدمی ہیں تو بارہ روپے مثلاً نکلے اور سو آدمی ہیں تو سو روپے گھر سے نکلے۔ تو غریب کہے گا کہ رمضان میں انہوں نے مجھے نوازا تھا۔ عید آئی اب بھی انہوں نے مجھے نواز دیا۔ ان سے بہتر میرا اور کوئی خیر خواہ نہیں، اب محبت اور بڑھ گئی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری..... جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دکان تھی کہ کپڑا بکوادیا۔ جگہ جگہ کپڑے بننے اور سپلائی کرنے کے کارخانے تھے اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ امانتیں بھی تھیں۔ مگر چھپن کروڑ روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا۔ جو انہوں نے چھوڑا۔ مگر ان چھپن کروڑ سے کیا ہوتا تھا؟ یہ سب غریبوں خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ کوفے میں جتنے غریب، بیوائیں اور یتیم تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھی اور ان کے قد و قامت بنے ہوئے تھے۔ کہ فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں جوان ہے، فلاں بچہ ہے۔ غریبوں کے ہر گھر کیلئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے کپڑے عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور جہاں عید کا دن آیا صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ تو غریب کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے۔ بہتر سے بہتر کپڑا ملا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس قائم کی۔ بڑے بڑے علماء وآئمہ اس میں جمع تھے۔ وہ فقہ کے ہر مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ جس کو آپ آج فقہ حنفی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے اماموں کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر، امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ، بڑے بڑے آئمۂ علم وفضل ان کی ایک کمیٹی بیٹھتی۔ ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب چھن چھنا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی۔ تو بیس جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا۔

یہ جو پچاس کی کمیٹی تھی، ان سب کو تنخواہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے خزانے سے دیتے تھے۔ کسی کو پانچ سو ماہوار، کسی کو ہزار۔ یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی۔ غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلے سلائے کپڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ برس دن میں ادا کر دوں گا۔ مدت گزر گئی، اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا نہیں دیا۔ جب وقت گذر گیا اور نہیں ادا کیا۔ وہ اب امام صاحبؒ سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا، تو شرمندگی پیدا ہوگی۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آ رہے ہیں، اس گلی میں گھس گیا، اس کوچے میں چلا گیا تا کہ سامنا نہ ہو۔ ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خیال پیدا ہوا تو ایک دن آپ جا رہے تھے، ادھر سے وہ آ رہا تھا۔ وہ دیکھ کر ایک گلی میں گھسا، دوڑ کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ بھائی تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے وہ دینے کو نہیں تھے، اس لئے شرمندہ نہ ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا، تعلق بڑی چیز ہے روپیہ بڑی چیز نہیں ہے۔ تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت گوارا کرو۔ تعلق کو کیوں ختم کیا''۔ ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کر دیئے۔ دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا بس اسے معاف کر دیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ..... پھر اس میں تقویٰ کا یہ حال تھا کہ۔ آخر مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے کپڑا بنوا کر سپلائی کیا، کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے، کپڑا روک لیا تا کہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں چنانچہ یہی ہوا۔ جب یہ میعاد گزر گئی۔ اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جا کر بڑی خوشی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رکھے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے۔ یہ دو لاکھ کیسے ہو گئے؟ اس نے کہا

کہ میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا روک لیا تھا کہ جب ضرورت بڑھ جائے گی، تب فروخت کروں گا۔ فرمایا، معاذ اللہ اسی کا نام اِحتکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ کہہ کر خفا ہوئے اور فرمایا یہ دو لاکھ غریبوں کے اوپر صدقہ کرو۔ یہ مال میرے کام کا نہیں ہے۔ اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جب ضرورت کا وقت تھا، تمہیں مقررہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے سخی کے سامنے غرباء کا دل کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ ہر غریب کہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ میں غریب نہیں رہا۔ نہ میری بیوی، بچے اور گھر غریب ہے، کھانے پینے کو آ رہا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی، میں نے غریبوں کی خدمت کی مجھے اَجر ملا، آخرت بنی اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی۔ اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔ بہرحال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی، مگر خوش دلی کے ساتھ، جبری طور پر نہیں رکھی گئی۔ جہاں جبر کیا، وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو۔ سو پر اڑھائی روپے اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں، سال بھر کی مدت رکھی تاکہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے جمع کے اصول پر نہیں...... اسلام نے مالیات کی جو بنیاد رکھی ہے وہ تقسیم کے اصول پر رکھی ہے، جمع کے اصول پر نہیں رکھی۔ یعنی روپے کو رکھا ہے کہ چلتا رہے، گھومتا رہے۔ جمع ہو کر ایک جگہ نہ پڑا رہے۔ زکوٰۃ آئی تو ادا کی۔ پھر صدقہ فطر کا وقت آیا، پھر خرچ کروایا، تو رمضان میں دیا۔ عید الفطر پہ دیا اب بقرعید آئی۔ اس میں قربانی واجب ہوئی۔ قربانی میں مستحب یہ ہے کہ چوتھا حصہ غریبوں پر صدقہ کرو، اپنے رشتہ داروں کو دو، خود بھی کھاؤ اس موقع پر غریبوں کے گھر گوشت پہنچ گیا، سامان پہنچ گیا۔ اس سب کچھ کے بعد پھر فرمایا: ''اِنَّ فِیْ مَالِ الْمَرْءِ حَقٌّ سِوَی الزَّکٰوۃِ'' ''آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو ضرورت کے وقت ادا کرے''۔

اس کو اسلام نے یوں سہل بنایا کہ اخلاقی حالت درست کی اور کہا کہ سخاوت افضل ہے اور بخل اللہ کے ہاں مبغوض ہے اس سے بغض و عداوت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَالْبَخِیْلُ عَدُوُّ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ''① ''سخی اللہ کا دوست ہے اور اس کے قریب ہے بخیل اللہ کا دشمن اور اس سے بعید ہے''۔

اس لئے کہ سخاوت اللہ کی صفت ہے، بخل اللہ کی صفت نہیں ہے دوست ہو دشمن، سب کو مل رہا ہے۔ سورج چمکاتے ہیں، دشمن بھی فائدہ اٹھاتے ہیں دوست بھی، مسلم بھی، کافر بھی، زمین پر غذا اگتی ہے، مومن بھی لیتا ہے کافر

---

① الحديث اخرجه الامام الترمذي في سننه بطريق ابي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم ولفظه: السخي قريب من الله قريب من الجنة، قريب من الناس، بعيد من النار، والبخيل بعيد من الله، بعيد من الجنة، بعيد من الناس، قريب من النار...... ابواب البر والصلة، باب ماجاء في السخاء، ج: ۵ ص: ۲۲۲ رقم: ۱۸۸۴.

بھی، دوست بھی حصہ پا رہا ہے دشمن بھی۔ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہے بخل نہیں ہے۔

البتہ مومن کے لئے خصوصی رحمت ہے کہ اسے دولت کے ساتھ اسلام ایمان، علم اور آخرت کا عقیدہ بھی دیا۔ یہ خصوصی توجہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے دوست، دشمن، مسلم وکافر سب برابر ہیں۔ تو جود وسخا اللہ کا خاص وصف ہے۔ اس کے خزانوں میں سے رات دن خرچ ہو رہا ہے۔ جو سخی ہوگا، اس نے گویا اللہ کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لی۔ بخل اللہ کی صفت نہیں ہے اگر کوئی بخیل ہوگا تو اللہ سے دور ہوگیا۔ اسے اللہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے جہاں خرچ کا حکم دیا۔ وہاں سخاوت کی فضیلت بیان کی تا کہ دینے پر آمادہ ہو۔ طبیعت میں گھٹن پیدا نہ ہو۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت...... اور یہ اتنا بڑھایا کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں دینا اتنا محبوب تھا کہ روکنا اتنا محبوب نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ گھر بار لٹا دیں۔ صحابہؓ میں حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہ یہ بہت زبردست تاجر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ روم، شام اور مصر جگہ جگہ ان کا مال جاتا تھا اور نفع جو آتا تھا تو وہ یہ نہیں تھا کہ دو چار آدمی لے کر چلے جائیں۔ نوٹوں کو گڈی ڈالی اور لے کے چلے آئے۔ بلکہ ایسا تھا کہ اونٹوں پر لد کر روپیہ، سونا، چاندی آتا تھا اور کثرت یہ تھی کہ جب گھر میں رکھنے کو جگہ نہیں رہتی تھی، تو عاجز آ کے کہتے تھے کہ گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ اور اشرفیوں کا چھت تک ڈھیر لگ جاتا تھا۔ یہ دولت کی کیفیت تھی۔ گویا کروڑ پتی لوگوں میں سے تھے مگر اس کے ساتھ معاملہ کیا تھا؟ فرماتے کہ اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور معاہدہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ چودہ سو۔ تو ایک خاص برتن منگوایا جاتا۔ اس میں روپیہ اور اشرفیاں بھر بھر کر چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر گھر بھجوائی جاتیں کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ اسے قبول کر لیں۔ پھر پوچھتے کہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کتنے ہیں۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی معلوم ہوا تین سو تیرہ۔ پھر ان تین سو تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اشرفیاں بھجوائی جاتیں کہ یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ جن کے ہاں پہنچتیں، وہ کہتے کہ اتنا مال ہم کیا کریں گے؟ وہ بھی آگے غریبوں میں بانٹتے۔ تو روپیہ پیسہ ادھر سے چل رہا ہے، ادھر سے نکل رہا ہے۔ سب سے زیادہ دولت کی محبت عورتوں کو ہوتی ہے۔ ان میں بھی سخاوت کا جذبہ اتنا بھر گیا تھا کہ دینا انہیں عزیز بن گیا تھا، رکھنا عزیز نہیں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہوں نے ایک بوری اشرفیوں کی بھر کر اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی خالہ کے گھر پہنچائی۔ جب یہ بوری پہنچی، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اتنا کیا کروں گی؟ خادمہ کو حکم دیا کہ اسے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ اس نے تقسیم کرنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک تقسیم کی ساری بوری ختم ہوگئی۔ باندی نے کہا، ام المومنین! تین دن سے آپ کے اوپر فاقہ ہے۔ غذا میں کچھ میسر نہیں تھا۔ آپ نے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا، فرمایا: ''جا بے وقوف!

پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی‘‘۔ گویا یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر فاقہ ہے اور گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اس درجہ غنا اور سیر چشمی پیدا ہوگئی تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ کچھ ہے بھی یاد نہیں۔ عورتوں کے دلوں میں سخاوت کا اتنا جذبہ اور اتنی بے تعلقی، یہ اسی تعلیم اور فیض اور صحبت کا اثر تھا کہ جس میں آپؐ نے اخلاق سکھلائے سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت بیان کی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب شام کے اوپر قابض ہوئے اور پوری خلافت ان کے ہاتھ میں آ گئی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ گو خلافت کا استحقاق میرا ہے۔ مگر میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتا ہوں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں سخاوت غیر معمولی ہے۔ تو ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر دستخط کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا کہ جتنا چاہو لکھ دو۔ اتنا ہی آپ کو سالانہ اور ماہانہ دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے لکھ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ وہ آتا اور تین دن میں ختم ہو جاتا۔ غربا، یتیموں اور فقیروں کو دینے میں ہی خوشی تھی جس پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ’’لَا خَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ...... ‘‘ ’’اسراف اور فضول خرچی میں خیر نہیں ہے۔ ڈھنگ سے دینا چاہئے۔ یہ نہیں کہ ایک لاکھ آیا تو دو دن میں لٹا کے برابر کیا‘‘۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ’’لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ...... ‘‘ ’’اسراف خیر کے اندر ہوتا ہی نہیں‘‘۔ ① جب اللہ کے لئے دیتے ہیں تو اس میں ایک لاکھ دو لاکھ سب برابر ہیں۔ اس میں کوئی اسراف نہیں۔ غرض یہ کیفیت تھی اور یہ فیض صحبت کا اور اس تعلیم کا اثر تھا تو دینے کے کا قانون بھی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی قلوب میں دینے کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔

سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے...... یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی حیثیت سے سخاوت موجود ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی فرد یا شخص بخیل پیدا ہو جائے۔ لیکن قوم کا مزاج جمع کا نہیں ہے۔ خرچ کرنے کا ہے۔ غریب امیر سب کے اندر جذبہ موجود ہے کہ دینے کی عظمت دل کے اندر موجود ہے، جمع کرنے کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی واقعہ پیش آ جائے، رکاوٹ پیدا ہو جائے، تو الگ بات ہے۔ لیکن قوم کا مزاج قومی حیثیت سے سخاوت کا ہے، بخل کا نہیں ہے۔ مہمان نوازی ہوگی، تو اپنے آپ کو بچھا دیں گے۔ دینا ہوگا تو دینے میں کمی نہیں کریں گے۔ یتیموں کی خبر گیری کریں گے۔ اور اقوام میں دیکھنے میں آتا ہے کہ قومی طور پر یہ مزاج نہیں ہے۔ افراد بڑے بڑے سخی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں غریب ہو وہ بھی سخی ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج دیا ہے۔ امیر سخی ہے، غریب سخی ہے حتی کہ جو پیشہ ور لوگ تھے، ان میں سخاوت کا جذبہ ہے۔

معبد جُہَنی ایک بہت بڑا گویا تھا اور فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ منصور کے زمانے میں یہ گزرا ہے۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ جا کے غزل سنائی۔ تو چالیس ہزار روپیہ اس کی ایک دفعہ کی فیس تھی اور امراء اس کو دیتے تھے۔ شاہی

① تفسیر روح المعانی، ج: ۱ ص: ۱۰۹۔

خزانے سے دس ہزار روپیہ روزانہ مقرر تھا، خواہ وہ سنانے کے لئے آئے یا نہ آئے۔ گویا اس کی روزانہ دس ہزار روپے تنخواہ تھی۔ اندازہ کیجئے مہینے میں کتنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے باورچی خانے کے لئے تین بکرے مقرر تھے۔ دو ذبح کئے ہوئے، ایک صحیح سالم زندہ۔ یہ تین بکرے روز پہنچتے تھے۔

اور کیوں پہنچتے تھے؟ تھا تو گویا مگر مہمان داری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو مہمان اس کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ امراء آئے تھے، کوئی گانا سیکھنے کے لئے کوئی اس کی مجلس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور وہ مہمانداری کرتا تھا۔ اس کا بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے اتنا کمایا کہ اگر ہم چاہتے تو سونے چاندی کی اینٹوں کے محل بنا لیتے۔ لیکن جب انتقال ہوا تو نوے لاکھ روپے قرضہ چھوڑا جو بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ مہمانداری پر اور غریبوں، یتیموں، ناداروں پر خرچ کرتا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں رکھتا تھا۔

تو اسلام میں گویوں اور پیشہ وروں کی یہ حالت تھی۔ یہ اس تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا تھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے چلے تو سفر مینا کی پلٹن بارہ میل آگے رہتی تھی جو جا کے بادشاہ کے خیمے نصب کرتی تھی اور وہاں دو تین دن قیام ہوتا تھا جب وہاں سے روانہ ہوتا او وہ سفر مینا کے لوگ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور آگے جا کر خیمے وغیرہ لگاتے تو یہ جو پلٹن تھی جو خیمے وغیرہ لگاتی تھی اس کے انچارج آفیسر کا نام منعم تھا۔ ایک موقع پر جا کر اس نے خیمے نصب کئے، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچنا تھا۔ سامان سب مرتب ہو گیا۔ ایک فقیر کو پتہ چلا کہ یہ بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا ہے، تو اس نے کسی سے معلوم کیا کہ انچارج آفیسر کا نام کیا ہے اسے پتہ چلا کہ اس کا نام منعم ہے تو اس نے آ کر بڑی خوش آوازی سے طرز سے ایک شعر پڑھا:

منعم بدست کوہ و بیاباں غریب نیست ہرگاہ کہ رفت خیمہ زد بارگاہ ساخت

منعم کسی جنگل میں بھی غریب نہیں، جہاں جاتا ہے، شہر بنا ہوا تیار ہے، خیمے، شامیانے تیار۔ منعم کو خدا نے ایسی دولت اور انعام دیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں جائے جب بھی غریب نہیں، جنگل میں جائے جب بھی غریب نہیں۔ جہاں بھی جائے گا، خیمے لگ جائیں گے، بارگاہیں بن جائیں گی۔ اس نے اس خوشی آوازی سے جو پڑھا۔ اس کی آواز سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ تو منعم کو بڑا پسند آیا۔ حکم دیا، اس فقیر کو حاضر کرو۔ تو تین لاکھ درہم اس کو دیئے۔ ایک غریب اور بھک منگے کو ایک دم تین لاکھ روپے مل گئے۔

اگلے دن صبح کے بعد اس نے آ کر پھر اسی خوشی آوازی سے شعر پڑھا۔ اسے نے پھر بلایا اور تین لاکھ روپے اور دے دیئے۔ تیسرے دن اس نے پھر شعر پڑھا۔ تو تین لاکھ اور دے دیئے۔ تین دن میں نو لاکھ روپیہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ چوتھے دن نہ آیا۔ اب منعم انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ وہ آئے تو میں دوں۔ مگر وہ نہ آیا۔ حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لاؤ، آج کیوں نہیں آیا۔ سپاہی اور پیادے دوڑے اور اسے پکڑ کے لائے۔

منعم نے کہا کہ تو کیوں نہیں آیا؟ اور تو بڑا بے وقوف ہے مجھے تو یہاں دس دن ٹھہرنا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس کے دس دن تجھے روزانہ تین لاکھ روپے دوں گا، بڑا احمق ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے کہ تین دن میں مجھے نو لاکھ روپے ملے ہیں یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ میری سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ میں نے یہ سمجھا یہ میرے لئے کافی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ جذبے میں آ کر دے دیا اور اگر کہیں یہ جذبہ آ گیا کہ چھین لو اس سے، تو پھر ایک پائی بھی میرے پاس نہیں بچے گی۔ اس لئے قناعت بھی نہ آنے کی باعث ہوئی، کہ میرے لئے کافی تھے اور خوف بھی باعث ہوا کہ کہیں چھین نہ لیں۔ اس واسطے نہیں آیا۔

اس نے کہا کہ یہ تیرا عمل تھا۔ مگر میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دس دن میں روزانہ تجھے تین لاکھ دوں گا۔ تو ایک ایک افسر گویئے پیشہ ور، اور ایک ایک عورت کا اسلام نے یہ مزاج بنا دیا تھا۔ سخاوت کے فضائل سنا کر، قانون کی فضیلت بتلا کر کہ کس طرح خرچ کریں۔ مگر اس میں جبر نہیں تھا۔ دل کے داعیئے اور جذبے سے آدمی دیتا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں جبراً دلوائی جاتیں، آدمی دینے سے بیزار ہو جاتا کہ کون اس قانون کے تحت اپنی دولت کو کھوئے کہ میں محنت کروں اور جبراً دوسرے کو دلوا دیا۔ اس لئے جبر کرنے کی بجائے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا۔ خود اپنی خوشی سے دیں اور جو حصہ جبری تھا، جیسے زکوٰۃ، صدقہ فطر اور قربانی ہے۔ اس میں آخرت کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ بھی دل کے جذبے سے آدمی دیتا ہے۔ اسلام نے کہا کہ تو ایک حصہ قربانی کر۔ اس نے کہا، نہیں میں تو پورا اونٹ دوں گا۔ ساتوں حصے میری طرف سے ہوں گے۔ بلکہ لوگ کئی کئی قربانیاں کرتے ہیں تا کہ غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ تو ایک مسلم دولت مند بن کر خوش دلی سے دیتا ہے۔

تقسیمِ دولت میں اسلام اور کمیونزم میں فرق...... کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے مگر جبری طور پر اس سے غصہ اور غیض وغضب ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کر دو۔ یہ کمائی میری ہے، لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کر دو، جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا، اسے ختم کر دے گا۔ وہ غالب آئے گا اسے ختم کر دے گا۔

آپ کے سامنے روس اور امریکہ کا مسئلہ ہے۔ ایک جگہ سرمایہ ہے ایک جگہ مزدوری کا دعویٰ ہے۔ یہ اس فکر میں ہے اور وہ اس کی فکر میں ہے دونوں کے ایٹم بم تیار ہیں وہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں، یہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں۔ یہ درحقیقت ایک دوسرے کا ردِ عمل ہے۔ یہ وہی جبر وتعدی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اسلام ہے۔ اسلامی قانون آ جائے تو دونوں کی صلح ہو سکتی ہے اور یہ نہیں ہوگا تو دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ٹھریں گے۔

اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا...... اسلام اعتدال کامل پر ہے کہ دلواتا بھی ہے اور اتنا دلواتا ہے کہ غریب کا گھر بھروا دیا۔ مگر مساوات اور برابری قائم نہیں کی۔ بلکہ توازن پیدا کیا کہ امیر کو نیچے اتار دیا کہ

اگر تیرے پاس ایک لاکھ ہے تو اپنے دل کے جذبے کے ساتھ غریبوں کو تیس چالیس ہزار دے تو اسے نیچے اتارا اور غریب کو اونچا کر دیا کہ وہ اس درجے پر نہ رہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میری پیدائش ہی اس لئے ہے کہ میں جوتیاں اٹھایا کروں، تکلیف اٹھایا کروں۔ حدیث میں ہے کہ جو غلام جنگ میں پکڑے ہوئے آتے تھے۔ لوگوں کو ان کو بیچ دینے کا حق تھا، یہ قانون تھا۔ لیکن تعلیم یہ دی کہ ''خَوَلُکُمْ اِخْوَانُکُمْ '' یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنتے ہو، انہیں پہناؤ۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی شخص کے ہاں باندی آ گئی تو باندی کا نام برا ہوتا ہے، ایک حقیر لفظ ہے۔ باندی کی اگر اولاد ہو جائے۔ اسے بھی لوگ حقیر سمجھتے ہیں کہ یہ باندی کا بچہ ہے، سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام نے تعلیم دی کہ جس شخص نے اپنی باندی کو تعلیم دی، تربیت کی، اسے شائستہ اور مہذب بنایا پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو دوگنا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔

مثلاً فرمایا کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا، تو اسے اجر ملے گا جیسے کہ بنی اسماعیل میں سے اس نے سو غلام آزاد کر کے خاندانِ نبوت کو آزاد کر دیا۔ یہ اجر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاد میں جتنے غلام آتے تھے اس سے زیادہ وہ آزاد ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لئے لوگ آزاد کرتے تھے، تعلیم دیتے تھے، جو خود کھاتے تھے انہیں کھلاتے، جو خود پہنتے، انہیں پہناتے۔ تو وہ ان کے عاشق، یہ ان کے عاشق۔ تمدن بنا ہوا تھا۔ اس درجہ اسلام نے گویا غلاموں کے حق میں تعلیم دی۔

تو باندی کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی۔ ''فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا. '' اچھی تعلیم دی ''وَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَهَا...... '' اس کو ادب سکھلایا، تہذیب سکھلائی، تربیت دی اور بہت عمدہ تربیت کی اور پھر اس سے خود نکاح کر لیا، گویا اس کو برابر بٹھلا لیا۔ وہ بے چاری باندی تھی۔ اس کو حر بنا کر اپنے برابر بٹھلا لیا۔ فرماتے ہیں اس کو دوگنا اجر ملے گا اور قیامت کے دن اس کو اجر و ثواب ہے۔ تو ہزاروں لوگوں نے باندیوں کو تعلیمیں دیں، تہذیبیں سکھلائیں۔ ①

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور اکابر تھے، وہ سب غلام ہی تھے۔ سب جہاد ہی سے آئے ہوئے تھے ان کو آزاد کیا گیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ غلام ہی تھے۔ آزاد کر کے تعلیم دی گئی، تو مسلمانوں کے امام بن گئے اور صوفیاء کے اندر عظیم الشان شیوخ میں سے ہیں۔ سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ جہاد سے پکڑے ہوئے غلام بن کے آئے تھے۔ لیکن آزاد کر کے تعلیم دی تو اب بہت بڑے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ غلاموں میں سے تھے۔ لیکن بہت بڑے امام بنے۔ غرض اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلاموں میں اتنے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے کہ ہر ہر فن میں انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ تو یہ اس تعلیم ہی

① الصحيح للبخاري، كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته واهله: ج: ١ ص: ١٧٠۔

کا نتیجہ ہے بہر حال اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنا دیا ہے اور اس درجہ پر شفیق بنا دیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ غریبوں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جو وہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ انہیں بھی وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جان بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ ہماری روح بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ مال خدا کی ملک ہے تو مالی عبادت بھی رکھی گئی۔ آبرو خدا کی بخشی ہوئی ہے تو آبرو کی عبادت رکھی گئی۔ تو اللہ کے سامنے مال، جان اور آبرو کی کوئی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اس لئے اس کے نام پر لٹاؤ۔

اسلام نے خرچ کرنے میں حدود بتلائی ہیں...... ہاں اس کی حدود بتلا دیں کہ حد کے اندر خرچ کرو، نہ اسراف کرو اور نہ فضول خرچی کرو کہ آج جذبے میں آ کے سب کچھ لٹا دیا۔ کل کو بھیک مانگنے کے قابل ہو گئے۔ لوگوں کے آگے ہاں پھیلائیں اور اور نہ اتنا بخل کرو کہ ہاتھ ہی سکیڑ لو۔ ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ ① ”نہ اتنا پھیلاؤ کہ سارا دے ڈالو اور کل کو بھیک مانگو۔ نہ ہاتھ اتنا سکیڑو کہ ہاتھ سے کچھ نہ نکلے“۔

درمیان میں جو اعتدال کا راستہ ہے وہ اسلامی تعلیم ہے کہ دو بھی اور رو کو بھی۔ مگر مصرف کو دیکھ کر کہ یہاں دینا صحیح ہے، یہاں اجر ہے لہٰذا دینے میں دریغ نہ کرو۔ برا مصرف ہے تو دینے میں بخیل بن جاؤ۔ یہاں نہ دینا زیادہ بہتر ہے، یہاں نہ دینا ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے تھیٹر اور سینما پر خرچ کر دیا ناجائز چیزوں پر تو مال بھی گیا اور اوپر سے گناہ بھی سر پر۔ دنیا بھی ختم ہوئی، آخرت بھی برباد ہوئی۔ اور اگر آپ نے غریبوں یتیموں، کو دیا تو گو ہیں نہیں گیا۔ اس لئے کہ غریب کو دیا۔ تو وہ آپ کا خادم ہو گیا وہ آپ کے کام آئے گا۔ اس لئے گویا وہ اپنے ہی گھر میں رہا اور اپنے بھائی کو دیا، تو اپنے گھر میں رہا اور آخرت الگ بن گئی۔ اللہ کے کہنے کے مطابق دینے سے دنیا بھی بنتی ہے، آخرت بھی بنتی ہے، اور اللہ سے کٹ کر دینے میں دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی جاتی ہے۔ غلط راستے پر خرچ کرنا ظاہر بات ہے، یہ غلط ہی ہوگا۔ اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔

مالِ حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے...... بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مال غلط طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ غلط ہی مصرف میں خرچ بھی ہوتا ہے۔ جو جائز طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے، مگر جائز راستہ پر خرچ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ محض مال کے مصرف کو دیکھ کر کہ کہاں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس سے ماخذ کا پتہ چلا لو کہ یہ آیا کہاں سے ہے۔ جب برے راستہ پر جا رہا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ برے ہی راستے سے آیا ہے۔ حرام مصرف میں جا رہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کمانے میں ضرور کوئی ناجائز صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے یہ برے مصرف میں گیا۔ اگر خالص حلال کی کمائی ہوتی تو برے مصرف میں نہ جاتا۔ تو حلال کی کمائی مقدار میں تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر بدن کو بھی لگتی ہے۔ روح میں بھی بشاشت پیدا کرتی ہے اور اس سے آخرت

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹.

بھی بن جاتی ہے۔اور ناجائز کمائی اگر بہت بھی ہو جائے ،تو نہ روح میں تسکین آتی ہے۔نہ بدن کولگتی ہے نہ دوسرے کے کام آتی ہے۔ناجائز طریق پرہی جاتی ہے۔اس لئے جائز ہی طریق پرکمایا جائے گا۔وہی کار آمد ثابت ہوگا۔

لقمۂ حلال قرب خداوندی کی شرطِ اوّل ہے......اسلام میں لقمۂ حلال اللہ کے قرب ہونے کی سب سے پہلی شرط ہے۔حرام لقمے سے کبھی قرب پیدا نہیں ہوتا۔توفیق چھن جاتی ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ جائز کمائی استعمال کرتے ہیں۔ان کے قلب میں نور ہوتا ہے نیک کام کرنے کوان کا جی چاہتا ہے۔ناجائز کمائی کھا کر توفیق چھن جاتی ہے اور سرکشی کرنے اور برے کام کرنے کو جی چاہتا ہے بڑا فرق پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو کہتے تھے۔بالکل بے پڑھے لکھے تھے،مگر صاحبِ نسبت تھے۔ذکر وشغل ان کا مشغلہ تھا۔اللہ والے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے معاش کا یہ سلسلہ کر رکھا تھا کہ گھاس کھود کر بیچتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی کے چھ پیسے متعین تھے۔نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے اور نہ زیادہ اور لوگوں کا دیوبند میں یہ حال تھا کہ جنہیں جانوروں کے لئے گھاس خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ان کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔اور بھی بہت سے مرد وعورت گھاس بیچنے والے تھے۔ان کی گٹھڑیاں رکھی ہیں۔مگر کوئی نہیں ان سے لیتا تھا۔ہر ایک کا جذبہ یہ تھا کہ شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے گھر میں برکت ہو جائے گی۔اس لئے سب انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور جہاں دیکھا کہ شاہ جی گٹھڑی لے کر آئے۔لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے۔بس جس نے پہلے ہاتھ لگا دیا شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے کہ بس لے جاؤ۔اسی کی گٹھڑی ہو جاتی تھی اور چھ پیسے متعین تھے۔سردی ہو،گرمی ہو یا برسات ہو نہ ایک پائی کم نہ زیادہ۔

اس کا مصرف ان کے ہاں یہ تھا کہ دو پیسے اسی وقت صدقہ کر دیتے۔اس زمانے میں پیسوں کے کچھ تانبے کے ٹکڑے آتے تھے۔جنہیں منصوری پیسہ کہا جاتا تھا۔ایک پیسے کے بہت سے ٹکڑے آجاتے تھے۔تو دو پیسوں کے بہت سے ٹکڑے لئے اور وہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کر دیئے۔اور دو پیسے روزان کے گھر کا خرچ تھا۔ایک پیسے میں ادھیلہ کا آٹا اور کچھ تیل وغیرہ لے لیا۔بہر حال گھر کی ضرورت دو پیسے میں پوری کرتے۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔سال بھر میں جب اس کے کچھ چھ سات روپے بن جاتے۔تو اس رقم سے ہمارے ان بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی،مولانا محمد یعقوب صاحب اعلیٰ اللہ مراتبہم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی دارالعلوم آتے۔ان کی بھی دعوت کرتے سال میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہٗ یہ فرماتے تھے کہ سال بھر ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دعوت کا وقت آئے اور شاہ جی کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا،جس دن ان کے گھر کا کھانا

کھاتے۔ چالیس دن قلب میں نورانیت رہتی اور جذبہ اٹھتا کہ نماز پڑھو، تلاوت بھی کرو، ذکر اللہ میں مشغول رہو، یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں سال بھر دعوت کا ہمیں انتظار رہتا۔

ایک دفعہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ بے چارے بیمار ہو گئے۔ تو مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہلا کے بھیجا کہ میں تو مریض ہوں آ نہیں سکتا یہ سات آٹھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میری طرف سے ان بزرگوں کو کھلا دیں۔ یہ پیسے جب مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس پہنچے تو غسل کیا، کپڑے بدلے، زمین کو پاک کیا، اس پر بیٹھ کر خود کھانا پکایا اور ان سب بزرگوں کی دعوت کی، تو حلال کے لقمہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ عبادت وطاعت کا جذبہ اٹھتا ہے۔

حلال کمائی ہی میں برکت ونورانیت ہے...... آج جو ہماری کیفیت چھن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کمائیاں مشتبہ ہو گئیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ اللہ کے نیک بندے ہزاروں، لاکھوں ہیں۔ وہ اپنے نزدیک اپنی ہمت صرف کرتے ہیں کہ جائز طریق سے کمائیں، لیکن ہمارے بھائی بہت سے ایسے ہیں کہ انہیں پرواہ نہیں ہے۔ جائز ہو، ناجائز ہو۔ بس پیسہ آنا چاہئے۔ اس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو مال کی وجہ سے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے، پیسہ آنا چاہئے۔ لیکن انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پیسے میں برکت نہیں ہوتی اس قسم کی ناجائز کمائی اپنے کو بھی ضرر پہنچاتی ہے اور بعض اوقات پورے خاندان کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ ناجائز کمائی بچتی نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَاخَالَطَتِ الصدقة مَالًا قَطُّ اِلَّا اَهْلَكَتْهُ.'' ① ''جس مال میں زکوٰۃ ملی رہ جاتی ہے، وہ راس المال کو بھی لے ڈوبتی ہے''۔

زکوٰۃ ملے ہوئے رہ جانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ فرض ہوئی اور نہ دی، وہ راس المال کسی نہ کسی دن تباہ ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ دوسرے نے زکوٰۃ دی کہ غریبوں کو دے دینا۔ اس نے خود رکھ لی، حالانکہ خود امیر تھا اسے اپنے مال میں ملا لیا تو یہ اس کے راس المال کو تباہ کر کے رہے گی۔ غرض جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہ جاتی ہے۔ وہ غنی کے مال کو لے ڈوبتی ہے۔ تو وہی بچتا ہے، جو بالکل جائز اور حلال طریقے سے کمایا جائے اس میں برکت بھی ہوتی ہے، دل میں نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اور ویسے مال بڑھ جائے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کی مثال بالکل ایسی ہے زکوٰۃ اگر نہیں دے گا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے۔ ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار روپے دیئے جاتے، جب نہیں دے گا تو ایک لاکھ پورے ہیں اور جو زکوٰۃ دے رہا ہے، بظاہر اس کا مال گھٹ رہا ہے۔ مگر حقیقتاً بڑھ رہا ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے جس نے صحت حاصل کرنے کے لئے مسہل لیا، تو بالکل

---

① شعب الایمان للبیهقی، فصل فی الاستعفاف عن المسائلة ۳/ ۱۵۹. علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البیهقی وابن عدی عن عائشة بسند ضعیف ج: ۲ ص: ۱۸۸۔

لاغر اور کمزور ہو گیا۔ مگر وہ کمزوری صحت کی علامت ہے کہ مادہ فاسد نکل گیا۔ چار دن کے بعد قوت آئے گی اور صحت مند و توانا ہو جائے گا۔ یہاں بظاہر بدن گھٹ گیا مگر حقیقتاً بڑھ گیا۔ کیونکہ چار دن کے بعد صحت بحال ہونے والی ہے اور اگر خرچ نہ کیا اور مال رہ گیا۔ یہ ایسا ہے جیسے بدن میں رول پڑ گئی۔ تو دیکھنے میں تو پہلوان معلوم ہو رہا ہے۔ مگر صحت ساری برباد ہو رہی ہے۔ چند دن کے بعد یہ صحت ساری ختم ہو جائے گی۔ جو دے کر مال گھٹتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مسہل سے بدن گھٹتا ہے، وہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اور نہ دینے سے جو مال بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ ایسا ہے جیسے رول چڑھ گیا کہ دیکھنے میں آدمی بہت موٹا نظر آتا ہے اور حقیقت میں اندر سے جان نکل رہی ہے۔ تو یہ ظاہری توانائی اور ظاہری زیادتی قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ اصلیت جس سے بدن میں توانائی اور نور پیدا ہوتا ہے وہ حلال اور جائز کمائی سے ہوتی ہے۔

بہرحال اسلام نے جہاں مال کے خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا۔ اس کی درآمد طریقہ بھی بتلایا کہ اس طرح سے کماؤ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ اور ایسے پیشوں سے روک دیا ہے۔ جو مخلوق کے لئے ضرر پہنچانے والے ہوں۔ چوری، ڈکیتی سے روک دیا، سود، سٹے سے روکا، جوئے سے روکا، قمار بازی سے روکا، کہ ان میں ظاہر میں بڑھنا ہے، حقیقت میں گھٹنا ہے۔ عموماً دیکھا ہے کہ سودی لین دین کرنے والوں کا ابتداء میں مال بڑھ جاتا ہے لیکن جب دیوالیہ ہوتے ہیں۔ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بھک منگے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ کسی کا ہارٹ فیل ہو گیا، کوئی گر پڑا تو اس قسم کا مال بچانے کی بجائے اور زیادہ وبال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اوّل تو یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز کمائی ظاہر میں تو آدمی خود کھاتا ہے اور جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو فقیر کو تھوڑا دینا پڑتا ہے، بادشاہ اور افسران کو زیادہ دینا پڑتا ہے۔ بس رات دن ہزاروں روپے اسی میں لگا رہے ہیں۔ کچھ کسی نے چوری کر لیا تھا، کسی نے ڈکیتی کر لی اور گورنمنٹ نے ٹیکس بھی لگا دیئے اور اب پریشان ہو رہا ہے کہ اتنی مشکل سے کمایا۔ لیکن اگر اعتدال کے ساتھ کمائے اور اعتدال کے ساتھ خرچ بھی کرے۔ اس کا یہ برا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کا بھی ڈھنگ بتلایا۔ دونوں میں اعتدال پیدا کیا۔ اور قانونی طور پر جبر نہیں کیا۔ جبر کیا بھی تو بہت معمولی کہ دینا آسان ہو۔ اخلاقی طور پر زیادہ زور دیا ہے۔ لاکھوں نظیریں موجود ہیں کہ قانونی طور پر زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ دیتے ہیں اور اس کے بعد بھی دینا اور دے کر خوش ہونا، مہمانداری وغیرہ، یہ مسلم کا گویا ایک پیشہ اور شعار ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرزِ اُسلوب...... اس طرح سے اسلام نے مالی عبادت بھی سکھلائی اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا تو کیسے پیارے انداز میں حکم دیا کہ واقعی دینے کو جی چاہے۔ فرمایا ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ [1] ”خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے“۔ یعنی تم کہاں سے لے کر

[1] پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰۔

آئے ہو، مال تو ہمارا دیا ہوا ہے۔ پھر اس میں سے خرچ کرتے ہوئے تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے، کیوں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ اگر یوں فرماتے کہ اپنی کمائی دے ڈالو۔ تو آدمی کو ذرا دکھ ہوتا کہ بھئی! کماؤں میں اور دوسرے کو دے ڈالوں۔ اس لئے عنوان یہ اختیار کیا کہ: ﴿وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ﴾ ① جو ہم نے دیا تھا اس میں سے دو۔ آدمی سمجھے گا کہ میرا تو ہے ہی نہیں، انکا ہے۔ وہ مانگ رہے ہیں، میں دے دوں۔

یہ ایسا ہے جیسے آپ کا ایک بچہ ہو اور اسے آپ دو روپے دیں۔ اس کے بعد کہیں کہ بیٹا دو پیسے ہمیں بھی دے دے ظاہر بات ہے کہ بچہ جو دے گا۔ وہ خود کما کے تھوڑا ہی لایا ہے، وہ تو باپ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اسے دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ باپ ہے اور پھر مجھ سے مانگ رہا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ تو دینے والے حق تعالیٰ خود ہیں۔ پھر کہتے ہیں بھئی! جو ہم نے تجھے دیا تھا۔ اس میں سے ہمیں بھی کچھ دے دے۔ تو دینے والے کو بھاری نہیں گزرے گا کہ دینے والے اور مالک بھی خود ہیں، وہ مانگ رہے ہیں۔ پھر یہ مانگنے کے بعد جو تم نے دے دیا۔ پھر یہ نہیں کہ تمہارا تعلق اس سے ختم ہوا نہیں، فرماتے ہیں: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ ② ''کوئی ہے جو اللہ میاں کو قرض دے''۔

دنیا میں تو قرض کے اوپر سود حرام قرار دے دیا کہ جتنا قرض لو، اتنا ہی دو۔ قرض دینے والا اوپر سے زیادتی لے، وہ سود ہے، ناجائز ہے اور خود سود دیتے ہیں۔ بلکہ سود در سود کہ اگر کسی نے دس روپے ہماری راہ میں دیئے تو تمہیں دس کے ستر دیں گے۔ یہاں قرض کے اوپر سود دے رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں میں سود اس لئے حرام قرار دیا کہ کمائی محدود ہے، تھوڑی سی کمائی ہے۔ اس کے اوپر ہم نے دس روپے قرض پر پانچ اور بڑھا دیئے تو دینے والے پر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کی دولت محدود تھی۔ جب ظلم کے طور پر اس سے پانچ اور لیں گے تو کیسے دے گا؟

اور اللہ میاں کی دولت لامحدود ہے۔ اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آ سکتی۔ تو اپنے حق میں سود کا سلسلہ جائز رکھا، انسانوں کے حق میں ناجائز رکھا اور فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے گیہوں کا ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جائے، گیہوں کا درخت اگا۔ تو سات بالیاں اس میں سے نکلیں اور ہر بالی کے سو دانے تو ایک دانہ ڈالا تھا اور سات سو دانے نکل آئے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ نے اللہ کو ایک دانہ قرض دیا اور سات سو دانے وصول کئے۔ تو سات سو گنا کون سود دیتا ہے۔ یہ تو اللہ میاں ہی دیں گے۔

اور آگے یہ بھی فرمایا کہ: سات سو پر بس نہیں۔ اللہ اگر بڑھانا چاہیں تو کون روکنے والا ہے۔ وہ لاکھوں گنا سود دے دے، جب بھی اس کے ہاں کی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص چھوہارے کی ایک گٹھلی صدقہ

① پارہ: ۲۸ سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۱۱. ③ پارہ: ۳ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱.

کرتا ہے۔تو حق تعالٰی فرماتے ہیں کہ ہم اسے پالتے ہیں اور ایسے پالتے ہیں، جیسے تمہارے ہاں گھوڑے کا کوئی بچہ ہو تو تم اسے دودھ پلا کر پال لو۔ چند دن کے بعد ہی وہ گھوڑی بن جائے اور سواری کے قابل بن جائے۔فرمایا، جو ایک گٹھلی بھی صدقہ دیتا ہے ہم اسے پال کر جبل اُحد کے برابر کر دیتے ہیں۔آخرت میں جب یہ اجر کے ڈھیر سامنے آئیں گے۔تو بندہ حیران ہوگا کہ میں نے کون سا ایسا صدقہ کیا تھا۔جس کے بدلے میں یہ پہاڑ جیسا اجر سامنے ہے۔فرمائیں گے، تو نے گٹھلی صدقہ کی تھی۔لیکن ہم نے تیرے خلوص کے وجہ سے اس کو پال کر پہاڑ کے برابر کر دیا۔اندازہ کیجئے ایک پہاڑ میں سے چھوہارے کی کتنی گٹھلیاں نکل سکتی ہیں۔ایک گٹھلی اس نے صدقہ کی اور اربوں کھربوں گٹھلیوں کے برابر اس نے اُجر لے لیا۔تو اللہ کے ہاں نہ سود سے کمی، نہ سود در سود سے کمی۔وہ در دنیا ستر در آخرت، کا مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دس دے دو، آخرت میں ستر مل جائیں گے۔

ایمان اور سکونِ قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں......اور آخرت تو آخرت دنیا میں بھی مل جاتا ہے، اللہ کی راہ میں دینے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ اس نے دیا۔مگر اس کے بدل میں کچھ نہ ملا۔مگر جو قلب میں ایمان اور سکون کی دولت ہوتی ہے۔وہ کروڑوں سلطنتوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے جو اس پر عطا کی جاتی ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔بس جیسا مل گیا، پہن لیا۔کبھی شاہانہ لباس، کبھی پھٹے پرانے کپڑے وہ بزرگ پھٹے پرانے کپڑوں سے چلے جا رہے تھے ایک شہر سامنے آیا تو سارے شہر کے دروازے بند۔اب ہزاروں گاڑیاں اندر جانے والی، وہ باہر رکی ہوئیں، اور اندر کی اندر۔تجارت و کاروبار بھی سب بند۔انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی! یہ دروازے کیوں بند ہو گئے۔لوگوں نے کہا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز کھو گیا باز ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں۔وہ کھو گیا ہے۔تو بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھو گیا۔شہر کے دروازے بند کر دو اور اسے کہیں سے پکڑ کے لاؤ۔

انہوں نے کہا، کیسا احمق بادشاہ ہے بھئی! پرندے کو اس سے کیا کہ دروازے بند کئے ہیں۔وہ اڑ کے باہر چلا جائے گا۔اسے دروازے کی کیا ضرورت ہے ایسا احمق آدمی ہے۔پرندے کو اگر پکڑنا تھا تو شہر پر جال لگوا دیتا کہ اوپر سے اڑ کے نہ نکلے۔دروازے بند کرانے کی کون سی تک ہے اور اس بزرگ نے کہا۔

یا اللہ! یہ آپ کی عجیب قدرت ہے کہ اس کندہ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے یا شہر کے دروازے بند کرانے چاہئیں اور مجھ جیسے فاضل، عالم کو بھک منگا بنا رکھا ہے کہ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔عجیب آپ کی قدرت ہے اور آپ کا نظام کہ اس احمق کو سلطنت دے دی اور مجھے جوتیاں چٹخانے کے لئے چھوڑ دیا۔اس بزرگ کے دل میں یہ وسوسہ گذرا۔حق تعالٰی کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہ تمہارے دل کی، ایمان کی دولت اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی سلطنت تمہیں دے

دیں۔ تھرّا گئے عرض کیا۔ نہیں، یا اللہ! میں ایمان نہیں دینا چاہتا۔ فرمایا اتنی بڑی دولت دے دی۔ پھر بھی بے وقوف اپنے کو بھک منگا سمجھ رہا ہے، یہ دولت ظاہری جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوگی، جس کے پاس ایمان ہے وہ دولت ہے جو ابدالآباد تک چلنے والی ہے۔ تو تجھے اَبدی دولت دی اور اسے عارضی دولت دی، تو نے اس کی قدر نہ کی۔

پھر توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر۔ واقعی تو نے مجھے دولت مند بنا دیا۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر کون دولت مند ہے۔ یہ دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی دی۔

مسلم کو دنیا بطورِ حق نہیں بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے ...... میں تو کہا کرتا ہوں، دنیا میں جتنی دولت ہے۔ مسلمان اس کا قطعاً حقدار نہیں ہے یہ کفار کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی آخرت نہیں ہے۔ انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دیا جاتا ہے اور یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایک مسلم یوں کہے کہ آخرت بھی مجھے ملے، دنیا بھی مجھے ملے اور کافر غریب کو کچھ بھی نہ ملے۔ دوسرے کے حق کو ساقط کر دینا، اسے محروم کر دینا، یہ کونسی دانش مندی کی بات ہے؟ مسلمانوں کو جو دولت ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ جہاد کرے گا، حکومت مل جائے گی۔ جدو جہد کرے گا، دولت مل جائے گی۔ غرض مسلمانوں کو دولت اور دنیا جو ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے اس کا حق نہیں ہے۔ کافر کو خدمت کے صلے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا حق ہے اس لئے کہ آگے اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ یوں چاہیں کہ اس دنیا کی دولت بھی میرے ہی پاس آ جائے۔

پھر بھی یہ اللہ کا فضل ہے کہ اگر خدمت کرتا ہے تو مسلم کو دولت دنیا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ مقصودِ اصلی نہیں ہوتی، مقصودِ اصلی آخرت ہی ہوتی ہے۔ یہ دولت بھی اس کے لئے وسیلہ بنتی ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا کے موقع پر جب آپ کی ازواجِ مطہرات نے نان ونفقہ طلب کیا اور گھیراؤ ال کر بیٹھیں کہ ہمیں بھی تو کچھ دینا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنارہ کشی کر کے اوپر ایک حجرہ تھا اس میں بیٹھ گئے اور بول چال بند کر دی۔ چہرہ مبارک پر بشاشت نہیں رہی کہ میرے گھر والے مجھ سے دولت طلب کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر بیٹھ گئے۔

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اوپر آنے کی اجازت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اور ایک چمڑے کا چھوٹا سا برتن۔ جس میں تھوڑا سا شہد تھا۔ یہ کل سامان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر اُٹھ بیٹھے تو کمر مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ! قیصر وکسریٰ جو بادشاہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے تخت، نرم بستروں اور محلات میں آرام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور اس حالت میں کہ بدن مبارک

کے اوپر چٹائی کے نشان اتر آئے ہیں۔کوئی چیز بچھانے کی میسر نہیں تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔آپ نے فرمایا: ''اَوَفِیْ هٰذَا اَنْتَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟'' ''اے ابن خطاب! کیا تو ابھی تک حیرت میں پڑا ہوا ہے؟'' ''اُولٰٓئِکَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَیِّبَاتُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا.'' تو نے قیصر و کسریٰ کا نام لیا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور تیرے اندر علم و ایمان اور دین کی دولت ہے۔ پھر بھی تجھے حرص پیش آئی اور اس قوم کی جس کے لئے انجام میں کچھ نہیں ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔ یہ مت کرو۔ یہ حرص ٹھیک نہیں۔ شکر کی چیز یہ ہے کہ دولت ایمان عطا کر دی۔ جس کے پاس ایمان ہے، وہ کبھی مفلس نہیں ہوسکتا۔ اللہ دولت دنیا دے تو شکر کا مقام ہے اور نہ دے تو تب بھی دولت مند ہے۔ اس لئے کہ بڑی دولت میسر ہے۔ ①

بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے...... اس لئے چونکہ جان بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، روح بھی اللہ کی دی ہوئی ہے مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور یہ چیزیں نہ صرف دی ہوئیں بلکہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو وہی مالک بھی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے یہ چیزیں اسی کے کہے کے مطابق لٹائی جائیں گی اور خرچ کی جائیں گی۔ کیونکہ مالک وہ ہے اگر وہ یوں کہے کہ سب مال لٹا دو، لٹا دینا چاہئے۔ اگر وہ یوں کہے کہ بخیل بن جاؤ، بخیل بن جانا چاہئے۔ اگر یوں کہے کہ جان دے دو، دے دینی چاہئے۔ وہ کہے ہرگز مت دو، روک لینی چاہئے۔

اصل میں عبادت اسی کا نام ہے کہ اطاعتِ محض کی جائے۔ جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دی جائے۔ یہی عبادت ہے۔ ظاہر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا نام عبادت ہے۔ یہ عبادت نہیں ہے یہ جزئیات ہیں، عبادت کی مثالیں ہیں۔ کہنا ماننے اور زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے۔ پانچ وقت موذن اعلان کرتا ہے کہ نماز پڑھو۔ نماز پڑھنا عبادت ہے۔ پانچ وقتوں میں نماز فرض ہے۔ نماز ادا کی جائے گی اور تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ جب آفتاب طلوع و غروب ہو رہا ہو یا سر کے اوپر آ گیا ہو، ان تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ اگر پڑھے گا تو قبول نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں پڑھو، جب ہم کہیں رک جاؤ، یہی بندہ کا کام ہے۔ رمضان شریف میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ اگر نہیں رکھو گے تو گنہگار ہوگے اور عید کے دن روز رکھنا حرام ہے۔ اگر رکھو گے تو گنہگار ہوگے۔ معلوم ہوا روزہ رکھنا نہ رکھنا عبادت نہیں کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں کہ مت رکھو، پھر چھوڑ دینا عبادت ہے۔

خودکشی حرام ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنی جان کو خود ختم کرلے۔ لیکن اگر وہ حکم دیں کہ میدان جہاد میں جا کے خود بھی شہید ہو جاؤ۔ اب یہی عبادت ہے معلوم ہوا نہ جان رکھنا عبادت، نہ گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب کہیں کہ دے دو، تو عبادت اور جب کہیں کہ ہرگز مت دو تو روک لینا عبادت ہے۔ یہی صورت مال کی بھی ہے۔ اگر

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الغرفة العلية المشرفة، ج: ۸، ص: ۳۵۷ رقم: ۲۲۸۸.

یوں کہیں کہ ہرگز مت خرچ کرو۔ یہ مصرف بہت برا ہے۔ تو روک لینا اور بخیل بننا ہی عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ خرچ کرو، تو خرچ کرنا عبادت ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ جان، مال، آبرو، طاقت وقوت سب کے لحاظ سے بندہ ہے اور بندے کو یہ معلوم ہے کہ جو مالک کو حق ہوگا، غلام وہی انجام دے گا غلام اپنی تجویز سے کچھ نہیں کرے گا۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام لے لے۔ اس نے کہا تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا، اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو غلام ہی کیوں بنتا؟ آقا کیوں نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری مرضی، میرا ارادہ، میری خواہش بھی غلام۔ یہی غلام ہونے کے معنی ہیں۔ اگر یہ چیزیں میری اپنی ہوتیں، تو میں آقا ہوتا، غلام کیوں ہوتا؟ تو ایک انسان، انسان کا غلام بن جائے، جس نے نہ اسے پیدا کیا، نہ روزی دی۔ محض ایک نسبت پیدا ہوگئی کہ خرید لیا اور غلام بن گیا۔ اس کی یہ کیفیت کہ آقا کے مقابلے میں نہ مرضی نہ ارادہ نہ خواہش کچھ بھی تو نہیں۔

اور اللہ ربّ العزت جس نے پیدا کیا، جان دی، روح دی، ہر چیز کا مالک اس کے سامنے بندگی کا دعویٰ کرے اور بندگی کے خلاف بھی کرے؟ وہاں تو یہ ہونا چاہئے کہ ہماری مرضی بھی اللہ کی غلام ہے۔ ہماری خواہش بھی اللہ کی غلام ہے۔ وہاں آ کر آدمی بنتا ہے، یہاں آقائی میں آتا ہے۔ شریعت کا حکم آئے تو اس میں رائے زنی کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اللہ میاں معاذ اللہ تابع ہیں اور یہ ان کے متبوع ہیں۔ خدا اور رسول کو اپنی مرضی پر چلانا، اس سے زیادہ گستاخی کی کیا بات ہوگی۔ بندہ اس لئے آیا تھا کہ اللہ و رسول کی مرضی پر چلے نہ یہ کہ اپنی مرضی پر انہیں چلانے کی کوشش کرے۔ تو دین میں لوگ ترمیمیں پیش کیا کرتے ہیں کہ صاحب! یوں نہیں، یوں ہونا چاہئے۔ گویا آپ پارلیمنٹ ہیں اور شریعت آپ کے مشورہ سے بن رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو جب دین اتارنا تھا، تو ہمیں بلا لیتے۔ ہم سے مشورہ لے لیتے کہ یہ حکم کیسے اتاروں؟ یہ کتنی بڑی گستاخی کی بات ہے بندے اور خدا میں نسبت صرف غلامی کی ہے کہ بندہ غلام ہے اور وہ آقا ہیں اس کی مرضی بھی غلام اور خواہش بھی غلام۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ ① ”اے ابراہیم مسلم بنو“۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ مسلمان نہیں تھے۔ اب مسلمان ہو جاؤ۔ اسلام کے معنی گردن نہاد ہونے کے ہیں۔ اپنے آپ کو سونپ دینے کے ہیں۔ یعنی اے ابراہیم! اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔ جو چاہیں ہم تمہارے اندر تصرف کریں اور تمہیں بولنے کی مجال نہ ہو۔ جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں بے اختیار ہوتا ہے، جدھر کو چاہے کروٹ دے دے۔ مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کیوں کروٹ دی۔ اسی طرح شریعت کے ہاتھ میں آدمی مثل مردہ کے ہو جائے کہ شریعت جدھر بھی تصرف کرے، بلا چون و چرا آدمی عمل کرے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱.

ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہو جاتا ہے۔ تو جب سرکاری آرڈر ہوتا ہے پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں دیتا۔ کوئی چون وچرا کرے تو لڑنے کو تیار کہ سرکاری آرڈر ایسے ہی ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا آرڈر آئے تو وہاں رائے زنی کرنے کو تیار کہ یہ آرڈر اور حکم کیوں آیا؟ ایسا کیوں نہ ہوگیا اور ویسا کیوں نہ ہوگیا یہ غلط کاروائی ہے۔ بہرحال جان ہو، مال ہو، آبرو ہو۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام یہ ہے کہ خالق کے آگے جھکے اس جھکنے ہی کا نام طاعت و عبادت ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ یعنی بندہ دنیا میں خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے۔ خدائی کے لئے خدا کی ذات کافی ہے۔ تمہیں تو بندہ بننے کے لئے بھیجا گیا ہے اور بندگی کے یہی معنی ہیں کہ بے چون وچرا اطاعت کرو۔

ہمارے ضلع سہارن پور کے قریب پنجاب کا ایک ضلع انبالہ ہے۔ اس میں عبداللہ پور ایک گاؤں ہے۔ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عارف باللہ اور شیخ کامل تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ جمنا کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ ایک دفعہ برسات میں جمنا میں پانی چڑھا اور اور اتنا چڑھا کہ گاؤں کی جو چہار دیواری تھی اس تک آدھا پانی آ گیا۔ اگر گز بھر اور بڑھ جاتا۔ تو پورا گاؤں غرق ہو جاتا۔ وہاں ایک بزرگ شاہ دولہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے تھے۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ پانی بہت چڑھ گیا اور دیوار اگر ٹوٹ گئی۔ تو پھر گاؤں کی خیر نہیں ہے۔ تو سارے گاؤں والے جمع ہو کے شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضور دعا کیجئے جمنا کا پانی چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاؤں ڈوب جائے۔ یہ ذرا دیوار کھڑی ہے۔ اس سے پانی رک رہا ہے۔ فرمایا، اچھا پانی بڑھ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا، ''جی ہاں'' فرمایا، پھر پھاوڑا اٹھا کے چلو۔ پھاوڑا لایا گیا۔ تو شاہ دولہؒ نے پھاوڑا لیا۔ اب شاہ دولہ آگے آگے، پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔ وہ جو دیوار کھڑی تھی۔ جس سے پانی رک رہا تھا۔ شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دیوار کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا، حضرت یہ کیا کر رہے ہو؟ اس دیوار کی بدولت تو گاؤں بچ رہا ہے۔ دیوار توڑ دیں گے تو پانی نہیں آ جائے گا؟

فرمایا۔ ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' نامعقولو! تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں اللہ سے مقابلہ کروں۔ وہ چاہیں کہ بستی غرق ہو۔ تو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ میں اللہ سے مقابلے کے لئے نہیں آیا۔ میں اطاعت کے لئے آیا ہوں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ بستی غرق ہو، تو میرا منشاء بھی یہی ہے کہ اس بستی کو غرق ہونا چاہئے۔

کسی بزرگ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا، اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو۔ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا،

① پارہ:۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ:۵۶.

الحمدللہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے! فرمایا یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔

اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو جو بھی عالم میں ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ پیدا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی مرتا ہے، میں کہتا ہوں الحمدللہ اسے مرنا ہی چاہئے تھا۔ میں کون ہوں۔ جو اللہ کا مقابلہ کروں کہ وہ موت دے، میں کہوں نہیں۔ موت نہیں آنی چاہئے۔ انسان بندگی کے لئے آیا ہے اور بندگی کے معنی اطاعت کے ہیں کہ جو ان کی مرضی وہ میری مرضی ۔

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ

تو بندہ وہ ہے کہ اپنی مرضی کو مال جان اور روح کو فنا کر دے۔ اس کو فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① اس میں میں نے جان کی تفصیلات کو چھوڑ کر مالیات کو بیان کیا۔ اس لئے کہ جب اللہ نے دولتیں دی ہیں۔ تو دولت کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں دولت کے حقوق پہچانے جائیں۔ وہاں غربا کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ غریب بھی آپ کے اور ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔ بہت سے مسلمان غریب ہیں سب کی یکساں حالت نہیں ہے۔ ان کی طرف توجہ دیں۔

اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے...... ایک تو یہ ہے کہ شخصی طور پر آپ نے دے دیا۔ بے شک عبادت انجام دی۔ جس غریب کو بھی دیں گے آپ نے عبادت ادا کی۔ زکوۃ دیں، صدقات دیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر دیں۔ مثلاً آپ فنڈز بنائیں جس میں لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع ہو۔ بہت سے پس ماندہ غریب ہوتے ہیں کہ ان کے قرض لینے کا سامان ہوجاتا ہے، بہت سے بھک منگے ہوتے ہیں، کھانے پینے کو نہیں۔ انہیں قرض دے کر تجارت کرائی جائے۔ کوئی کاروبار لگا دیا جائے کہ بھئی! تم پانچ برس میں ہمارا قرض ادا کر دینا۔ مگر اب اپنا کام چلاؤ۔

ہندوستان میں بہت سی ایسی بستیاں ہیں کہ انہوں نے فنڈز جمع کئے اور ان سے غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ پہلے یہ صورت تھی کہ لوگ ساہوکاروں سے قرضہ لیتے تھے۔ تو مسلمانوں کی لاکھوں کی جائیدادیں تباہ ہو گئیں۔ وہ ساری سود ہی میں نکل جاتی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں میں جو دولت مند تھے انہوں نے فنڈز قائم کئے اور اس میں بلاسود کا قرضہ دیا۔ اس میں کچھ ضمانتیں، یا لکھت پڑھت بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سینکڑوں آدمی کام سے لگ گئے۔ جو پریشان حال تھے ان کی پریشانی رفع ہوگئی۔ تو شخصی طور پر زکوۃ دی جائے بے شک ضروری ہے۔ فرض و عبادت ہے ثواب واجر بھی ملے گا۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر فنڈز مقرر کئے جائیں کہ ہم اپنے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

غریب بھائی کو غریب نہیں رہنے دیں گے۔ جتنا ہم سے بن پڑے گا۔ اس میں تعلیم کا بھی بندوبست ہوسکتا، پیسہ کا بھی بندوبست ہوسکتا ہے، غریبوں کی خبر گیری بھی ہوسکتی ہے۔ ایک کا کام ایک ہی کا ہوتا ہے۔ جماعت کا کام جماعت ہی کا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر خدمت کی جائے تو قوم کی زیادہ خدمت ہوسکتی ہے۔ تعلیم وتربیت اور معاشرت ومعاش کے سلسلہ میں خدمت کے بہت بہتر نتائج ظاہر ہوسکتے ہیں۔ غریبوں کے حقوق بھی امیروں کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ یہ غریب بھی اپنے بھائی ہیں کوئی الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ دولت مند بھائی ہیں یہ بھی ہیں۔ تو دولت مندوں کا یہ بھی فرض ہے کہ زکوٰۃ، صدقات اور لِلّٰہ فی اللہ سے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کریں۔ شخصی طور پر بھی اجتماعی طور پر بھی۔ یہ بھی ایک مستقل عبادت اور طاعت ہوگی اور اس کا اجر جماعتی طور پر ہوگا۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی، بہبود وفلاح بھی ہوگی۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے'' کہ وہ بندگی کریں۔ ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾ ②۔ ''ہم نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ ہم تم سے روزی چاہیں''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ③ ''روزی کا ذمہ ہم لیتے ہیں تم مت گھبراؤ''۔

تو ایک کام ہمارے سپرد کیا اور ایک اپنے ذمہ لیا۔ اپنے ذمہ روزی دینا لیا۔ آپ کے ذمہ طاعت وعبادت کرنا ہے۔ جتنا آپ طاعت وعبادت کریں گے، ادھر سے روزی آئے گی اور روزی کے معنی فقط روٹی کے نہیں ہیں۔ رزق، عزّت، آبرو، اِقتدار سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ تو ہم روزی دیں گے، تم طاعت وعبادت کرو۔

اب مسلمانوں نے جو اپنے ذمے لیا تھا اسے ترک کر دیا اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کا مطالبہ قائم ہے۔ اگر روزی میں کمی ہوئی تو بس اللہ میاں کی شکایت شروع ہوگئی کہ صاحب! بس روزی بند کرنے کو میں ہی رہ گیا تھا کفار کہاں چلے گئے تھے۔ میرے ہی اوپر بلا آتی ہے۔ گویا انہوں نے جو روزی کا ذمہ لیا تھا۔ معاذ اللہ اسے پورا نہیں کیا اور آپ جو ذمہ لے کے آئے تھے کہ میں طاعت کروں گا۔ وہ آپ نے کب پورا کیا؟ اپنے کو دیکھتے نہیں، شکایت اللہ میاں کی شروع کر دی۔ اس واسطے اپنا بھی حق ادا کرو اور اللہ نے جو اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ادا کریں گے تم کمی کرو گے، ادھر سے بھی کمی ہو جائیگی۔ تم پورا حق ادا کرو گے، ادھر سے بھی روزی دی جائے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ④ ''روزی کی فکر نہ کرو ہم دیں گے''۔ اپنے کام کی فکر کرو۔ جو تمہارے ذمے ڈالا گیا ہے اور وہ طاعت وعبادت ہے۔ یہ چند باتیں میں نے بلا تمہید عرض کیں کسی علمی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو طاعت وعبادت کی، جھکنے کی توفیق عطا فرماوے۔ (آمین)

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۷.

③ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَا سِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

خطبہ طیبہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّـا بَعْـدُ:

تمہید...... حضرات محترمین! اس عظیم اجتماع کی صدارت مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم کا کام نہ تھا۔ اس لئے اس مقام پر آتے ہوئے ایک قسم کی بے ادبی اور خجالت وندامت محسوس ہو رہی ہے اور حیران ہوں کہ اپنے بزرگوں کے اس اقدام (تفویض صدارت) پر ان کا شکریہ ادا کروں یا شکوہ کروں؟

تاہم "اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ......" کے تحت جب کہ بزرگوں کے امر کی تعمیل کر رہا ہوں اور جہاں بٹھلا دیا گیا ہوں، وہاں بیٹھ چکا ہوں۔ اس لئے شکریہ کے سوا چارہ کار بھی نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس اظہار کے ساتھ کہ حقیقی معنی میں صدر وہی حضرات ہیں جو بے بضاعتوں تک کو بھی صدارتیں بانٹ سکتے ہیں۔ میں صرف ان کے حکم کے ایک تعمیل کنندہ کی حیثیت سے اس مقام پر حاضر رہوں گا اور یہ تعمیل ارشاد ہی اس خجالت وندامت کا تدارک بن سکتی ہے۔ جو مجھے اس مقام پر بیٹھ کر ہو رہی ہے۔ حق تعالیٰ ان بزرگان علم وتعلیم کے منشاء کی تعمیل کی توفیق دے اور ان کے فیوض وبرکات کو تادیر قائم رکھے، یہ دعا میرا شکریہ ہے۔

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی ——— منت شناس ازو کہ بہ خدمت گذاشتت

تعین موضوع...... حضرات کرام! یہ عظیم اجتماع چونکہ علمی اور تعلیمی ہے اور ایک موقر تعلیم گاہ کے انتساب سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس خطبہ افتتاحیہ کا موضوع قدرتی طور پر خود وہی متعین ہو جاتا ہے۔ جو جلسہ اور تعلیم گاہ کا موضوع ہے اور وہ علم وتعلیم اور تربیت ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے دائرہ میں محدود رہ کر ذیل کی چند سطور عرض کرنے کی جرات کروں گا۔

دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت...... میرے اس سارے خطبہ افتتاحیہ کا حاصل دو لفظوں میں یہ ہے کہ انسانی زندگی میں دینی تعلیم انتہائی اہم اور ضروری ہے اور اس سے پیدا شدہ علم وعمل اور اس علم وعمل سے مربوط زندگی ہی حقیقی زندگی اور اعلیٰ ترین حیات ہے۔ جس کی اشاعت وترویج اس نازک ترین یا تاریک ترین دور میں پورے

جان و مال کی قربانیوں کے ساتھ اہم ترین ضرورت ہے۔

دینی تعلیم پر مبنی چند سوالات...... دینی تعلیم کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مبادی و آثار اور لوازم کیا ہیں؟ پھر دینی تعلیم کے تقابل سے جو دنیوی تعلیم مفہوم ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اور پھر اس علم دنیا اور علم آخرت کے ثمرات و نتائج میں کیا فرق ہے؟ چند قدرتی سوالات ہیں۔ جو دینی تعلیم کے لفظ سے آپ کے ذہنوں میں ابھر رہے ہوں گے انہی کے جوابات پر یہ تحریر مشتمل ہے مگر جوابات کی تقریر اور تفہیم قدرے طویل ہوگئی ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ موضوع ہی قدرتاً طویل الذیل ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ یہ سطور ایک طالب علم کے قلم سے نکل رہی ہیں اور وہ بھی ایک تعلیم گاہ میں اور اوپر سے ایک تعلیمی اجتماع کے موقعہ پر اور طالب علم کے لئے ایسے مواقع میں یہ موضوع نقد زندگی اور لذیذ ترین موضوع ہے اس لئے محبوب مشغلہ میں کچھ ارادی طول بھی ہو جاتا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم

ان ارادی اور غیر ارادی طوالتوں کے لئے میں اپنے بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر ساتھ ہی کوشش کروں گا کہ طوالت کو کم کرنے کے لئے ان حقائق کو خالص اصولی رنگ سے پیش کر دوں۔ واقعات و حوادث سامعین کے ذہنوں میں خود موجود ہیں بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ۔ اس لئے عرض کردہ اصول پر واقعات کو وہ خود منطبق فرما کر ان حوادث کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا فیصلہ فرمالیں۔ یہ اصول قرآن حکیم کی روشنی سے اَخذ کئے گئے ہیں۔ جو کائنات کے سارے حوادث کی صحت و سقم کو تولنے کا واحد میزان ہے ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ”ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر“۔ اس لئے ان پر منطبق شدہ واقعات کا حکم بھی قطعی ہوگا۔ جس کی تعمیل میں کسی خدا پرست کو کوئی کلام نہ ہونا چاہئے۔

[۱] انسان ایک حقیقت جامعہ کی تخلیق...... حضرات کرام! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی صنعت متقنہ سے انسان کو حقیقت جامعہ بنایا، اس کے باطن میں قوائے کمال ودیعت کئے اور اس کے ظاہر کو مختلف اعضاء جمال سے سنوارا۔

اعضاء کے خلقی وظائف اور ان سے ایک قرآنی استدلال...... پھر ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظیفہ عمل سپرد فرمایا۔ آنکھ بنائی کہ وہ دیکھے، کان دیئے کہ وہ سنیں، ناک دی کہ وہ سونگھے، زبان دی کہ وہ چکھے، ہاتھ دئے کہ وہ پکڑیں، پیر دیئے کہ وہ چلیں، جلد بدن دی کہ وہ چھوئے، زبان دی کہ وہ کھائے پیئے اور بولے، دماغ دیا کہ وہ عقل سے سوچے اور فکر کرے۔ غرض ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظائف عمل سپرد فرمائے۔ تا کہ وہ انہیں ادا کرتا رہے جس سے مقاصد تخلیق پورے ہوتے رہیں۔

اعضاء انسانی کے یہ فرائض جیسے بدیہی اور مشاہد ہیں۔ جنہیں تجربۃً اور بداہتاً ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ایسے

① پارہ:۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

ہی وہ شرعی بھی ہیں کہ ایمانا بھی انہیں تسلیم کرتا ہے۔ جب کہ انکے خالق نے ہی یہ وظائف ان کے لئے تجویز فرمائے اور اس کی اطلاع بھی دی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کفار کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کے فرضی معبودوں (بتوں اور مورتیوں) کے بے حس و بے شعور اور بے بس ہونے کو اس سے ہی واضح فرمایا کہ وہ اپنے ان مصنوعی اعضاء سے وہ کام ہی نہیں لے سکتے۔ جو قدرت نے ان اعضاء کے لئے رکھے تھے۔ تو یہ بے حس و معطل اور ناکارہ کیا خدا ہوتے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ ① ''جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر (ان بتوں کو) پکارتے ہیں وہ انہی کی طرح خدا کی مخلوق ہیں۔ (خدا نہیں) پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو، کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں؟ (اور جب یہ بھی نہیں کہ وہ مخلوقاتی فرائض ہی انجام دے لیں تو وہ خالق کا کام کیا انجام دے سکیں گے کہ انہیں پکارا جائے''۔

اس آیتِ کریمہ سے جہاں اور بہت سے علوم برآمد ہوتے ہیں۔ وہاں یہ بھی بداہتاً واضح ہے کہ اعضاء انسانی میں ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال کچھ فرائض اور وظائف خلقتاً سپرد کئے گئے ہیں جیسے پاؤں کے لئے چلنا ہاتھوں کے لئے پکڑنا، آنکھوں کے لئے دیکھنا اور کانوں کے لئے سننا اور ان اعضاء کی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے خلقی فرائض کو انجام دیتے رہیں۔

[2] اعضاء کا عمل اور کائناتی عدل..... اگر ہر ہر عضو سے وہی کام لیا گیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ تو مقاصد خلقت پورے ہوتے رہیں گے اور یہ کائنات انسانی عدل پر قائم رہے گی۔ جس کا نام احسان ہے۔ لیکن اگر کسی عضو کو معطل چھوڑ کر بے کار کر دیا گیا۔ تو یہ سفاہت و بدعقلی ہوگی۔ جس کا نام حرمان ہے اور اگر کسی عضو کو غیر کام پر لگا دیا گیا۔ تو یہ ظلم ہوگا جس کا نام خسران ہے اور ان دونوں کا مجموعہ تعدی یعنی حدود سے تجاوز ہوگا۔ جس کا نام کفران ہے۔

اس اِضاعت نعمت کو خواہ وہ ترکِ نعمت سے ہو۔ جس میں انتفاع کو عدم انتفاع سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو حرِمان ہے یا بے محل استعمال سے ہو کہ اس میں صحیح مصرف کو غلط مصرف سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو خسران ہے۔ قرآن حکیم نے تبدیلی نعمت کہہ کر کفرانِ نعمت سے تعبیر فرمایا ہے اور فیصلہ یہ دیا ہے کہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ یَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ② ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ اللہ کے احسان کا ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں۔ جو دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے''۔

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۴، ۱۹۵۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۸، ۲۹۔

عمل اعضاء کی غرض و غایت...... پھر قدرتی بات ہے کہ ان اعضاء کے طبعی وظائف و اعمال کی کوئی غرض و غایت بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ بے مقصد عمل لغواور عبث ہوتا ہے۔ اس لئے ان تمام اعضاء کے مفوضہ کاموں کی بھی بلاشبہ ایک غرض و غایت ہے اور وہ حق طلبی اور پیروی حق ہے جس کا پروگرام شریعت ہے۔ اگر یہ تمام اعضاء اپنے اپنے وظائف عمل میں اسی غرض و غایت کے لئے حرکت کریں گے۔ تو اسی میں ان کی سلامتی اور دارین کی نجات ہے۔ ورنہ اگر انہوں نے اپنے یہ خلقی وظائف بجائے محبت حق کے عداوت حق کے مظاہرہ کے لئے بصورت بغاوت انجام دیئے۔ تو باوجود اپنے پورے وظائف خلقت انجام دے لینے کے۔ چونکہ وہ صحیح غرض وغایت کے لئے انجام نہیں دیئے گئے۔ اس لئے وہ ان کے حق میں وبالِ جان اور موجب ہلاکت وعذاب بن جائیں گے اور یہ اعضاء بجائے اس کے کہ اپنے نفس کے حق میں قیامت کے دن کوئی اچھی شہادت پیش کر سکتے اُلٹے اس کے خلاف گواہ بن کر مدمقابل آ جائیں گے اور عذاب کے لئے مضبوط حجت بن جائیں گے۔

قرآن کریم نے اعضاء بدن کی اس تبدیلی غرض یا مخالف غرض کام کرنے پر ان اعضاء کا مخالف نفس گواہ بن جانا اور اس کے عذاب کے لئے مُمد ومعاون ہو جانا ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَآءُ اللّٰهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ٥ حَتّٰى إِذَا مَا جَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوٓا أَنطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيٓ أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (1) ”اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلایئے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (نے) کے (لئے موقف حساب میں) لائے جائیں گے۔ پھر وہ روکے جائیں گے (تاکہ بقیہ بھی آجائیں) یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آجائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہو کر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ اعضاء جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی؟ اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو“۔

بہرحال آیت کریمہ سے کائنات انسانی کے عدل واحسان پر قائم رہنے کی دو بنیادیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اعضاء بدن اپنے اپنے خلقی وظائف انجام دیں۔ معطل نہ رہیں کہ یہ حرمان ہے اور دوسرے یہ کہ صحیح غرض و غایت یعنی طاعت حق میں انجام دیں۔ مخالف غرض کاموں میں نہ لگیں کہ یہ خسران ہے اور ان کی جنس جس میں دونوں شریک ہیں، کفران ہے۔

سلطانِ بدن قلب کا عمل...... بہرحال جب کہ اس تمام اقلیم بدن میں ہر ہر عضو ایک صحیح وثابت غرض کے لئے اپنے وظائف عمل ادا کرنے کے لئے بنا ہے۔ تو ناممکن ہے کہ قلب جو اس ساری اقلیم بدن کا سلطان اور حکمران ہے

(1) پارہ: ۲۴، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۱۹ تا ۲۱۔

اس کی کارفرمائی کی کوئی غرض وغایت نہ ہو۔ بالخصوص جب کہ اس کے جنود وعساکر اور خدمہ یعنی اعضاء بدن میں سے کوئی عضو بھی بے کار یا بلا وظیفہ کے ناکارہ، معطل اور بے مقصد نہیں بنایا گیا۔ تو یہ مَلِکُ الاعضاء کب بے کار بنایا گیا ہوگا اور کس طرح اسے بلا کسی وظیفہ کے معطل اور بغیر کسی صحیح غرض وغایت کے مہمل مان لیا جائے؟ مگر اس کا وظیفہ وہی ہوسکتا ہے جو سلاطین وملوک کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ کا کام محنت مزدوری نہیں۔ بلکہ رعایا اور اپنے خدمہ یا عمال حکومت کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا، ہمہ وقت ان سے باخبر رہنا اور اس علم وخبر کی روشنی میں اقلیم کی تدبیر اور نگرانی کرتے رہنا ہے، کہ وہ اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر لگے رہیں اور راست بازی کے ساتھ اپنے وظائف عمل کی غرض وغایت پوری کرتے رہیں۔

پس قلب کا سب بڑا کام اپنی اقلیم سے باخبر رہنا اور عملی طور پر اندرونی اور بیرونی امور میں جو باتیں اس کائنات بدن کے لئے مفید ہیں۔ انہیں فراہم کرنا اور جو اس کی غرض وغایت کے لئے مضر ہیں۔ انہیں دفع کرتے رہنا ہے تاکہ یہ اقلیم تن نہ اندرونی طور پر مفاسد اور تشویشات کا شکار ہو اور نہ بیرونی طور پر کسی غنیم کے حملہ کا ہدف اور نشانہ بنے۔ اس لئے قلب کے فوائد کا مختصر لفظوں میں خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اندر اور باہر اور انفس وآفاق میں توجہ کرکے ان سے معلومات حاصل کرتا رہے اور اس علم کی طاقت پر اپنی اقلیم تن کو چلاتا رہے۔ اگر اس نے یہ فریضہ صحیح طور پر انجام دیا تو یہ تنہا اسی کی نہیں بلکہ ساری اقلیم تن کی صلاح وفلاح ہوگی۔ ورنہ وہ بھی فاسد ہو جائے گا اور اس کی ساری اقلیم بھی تباہی وبربادی کی آماجگاہ بن جائے گی۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ”وَفِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ“ ”بدن (انسانی) میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور وہ جب فاسد ہوتا ہے۔ تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے“۔ ①

③ **قلب کا وسیلہ علم تفکر وتدبر**...... پھر جس طرح کانوں کے سننے کا لئے اِستماع یعنی سننے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بغیر اس توجہ کے وہ سننے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے اور آنکھ کے دیکھنے کے لئے جس طرح استبصار یعنی دیکھنے کی طرف متوجہ ہو کر اپنی پتلیاں گھمانا ضروری ہے تاکہ وہ گرد وپیش کو دیکھ سکے کہ اس توجہ کے بغیر وہ بینائی کا وظیفہ ادا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح قلب کو علم حاصل کرنے کے لئے استعلام یعنی علم کے لئے توجہ کرنی ضروری ہوگی کہ بغیر اس توجہ کے جس کا نام حرکت فکری یا تفکر وتدبر ہے۔ وہ علم آشنا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر قلب کو عالم خلق اور عالم امر کی طرف اپنی قوّتِ فکریہ کو دوڑانا پڑے گا اور تفکرّ وتدبّر کے وظائف انجام دینے ہوں گے۔ جب ہی وہ ظاہر وباطن کا علم حاصل کرکے کائنات بدن کی صحیح تدبیر کرسکے گا۔ اسلئے قرآن حکیم نے ان دونوں عالموں خلق اور امر کی طرف قلوب کو توجہ دلائی۔ عالم خلق میں اَنفس کے بارے میں فرمایا ﴿وَفِـيْ

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ج: ١ ص: ٩٠.

﴿اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ① ''اور تمہاری ذات میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟'' اور عالم خلق میں آفاق کے بارے میں فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''کیا وہ آسمان اور زمینوں کی پیدائش میں غور نہیں کرتے؟'' اور عالم امر کے بارے میں فرمایا: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ ② ''تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے''۔

گو یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حرکت فکری اور توجہ کے بعد قلب کو علم حاصل ہو ہی جائے اور وہ صحیح علم تک پہنچ ہی جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات کان توجہ کریں اور سنائی نہ دے، ہلال دیکھنے کے لئے آنکھ نظریں لڑائے اور نظر نہ آئے۔ جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات اچانک نظر ڈالتے ہی آنکھوں کو ہلال نظر آ جائے اور کانوں میں اچانک کوئی بات پڑ جائے اور وہ سن لیں۔ اسی طرح قلب کے لئے توجہ اور فکر شرط ہے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ گو بعض اوقات کبھی ادنی توجہ ہی سے قلب میں علوم القاء ہو جاتے ہیں اور بے محنت پکی پکائی مل جاتی ہے۔ مگر قانونی عادت یہی ہے کہ توجہ ہی سے علم کا ثمر شیریں سامنے آتا ہے۔ جو حصول علم کی شرطِ اوّلین ہے۔

④ بدن کا ہر ہر عضو صاحبِ ادراک و شعور ہے...... اس موقعہ پر یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس سلطان الاعضاء (قلب) کے حاکم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کائنات بدن میں اور کوئی عضو عالم نہیں۔ بلکہ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ'' کے طبعی اصول پر اس کائنات بدن کا ہر ہر حصہ اور ہر ہر عضو علم واحساس سے بہرہ ور ہے اور اقلیم بدن کا ریشہ ریشہ احساس وادراک کا ذخیرہ درجہ بدرجہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

آنکھ کے دیکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسے صورتوں کا علم ہو جائے۔ کان کے سننے کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اسے آوازوں کا علم وادراک ہو جائے، زبان کے چکھنے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ اسے ذائقوں کا علم ہو جائے، ناک کے سونگھنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے خوشبو یا بدبو کا ادراک ہو جائے، ہاتھ، پیر اور عام جلد بدن کے چھونے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ انہیں کسی جسم کی سختی، نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا ادراک ہو جائے وغیرہ۔ جس سے واضح ہے کہ کائنات بدن کا ذرہ ذرہ ادراک وشعور اور علم کی مختلف قوتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی اپنی معلومات کی فراہمی میں مشغول ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سارے کا سارا انسان علمی قوتوں سے لبریز اور اندر باہر سے باشعور ہے۔ جب کہ ان کا حکمران (قلب) علوم و معارف کا سرچشمہ ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان میں کس کا علم اصلی ہے اور کس کا فرعی اور جزوی۔ لیکن بہر حال جب کہ ان سب میں ادراک کسی نہ کسی شان سے موجود ہے۔ تو کسی بھی عضو کے علم وادراک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اعضاء کے ادراک کی تین قوتیں...... بنا بریں ان اعضاء ادراک کی ان مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھ کر کہا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۲.

جا سکتا ہے کہ ظاہر نظر انسان کے علم و ادراک کی تین قوتیں ہیں۔ جو ان اعضاء میں حسب مناسبت پھیلی ہوئی اور منقسم ہیں۔ ایک حس جو مختلف نوعیتوں کے ساتھ مختلف بدن میں فرق مراتب کے ساتھ قائم ہے اور اپنے اپنے دائرۂ محسوسات میں مختلف اشیاء کو اپنے اپنے رنگ احساس سے محسوس کرتی ہے۔

دوسری عقل جو دماغ میں رچی ہوئی ہے اور امور معقولہ کو ایک خاص شعور کے ساتھ اَخذ کر کے اپنے اپنے مواقع پر صرف کرتی ہے۔

تیسری قوت وجدان ہے۔ جو قلب میں جاگزیں ہے اور ماوراء طبعیات تک اس کی رسائی ہے کہ وہاں سے بھی وہ علوم کھینچ لاتی ہے۔ جہاں حواس و عقل گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پہلی دو قوتوں (حس اور عقل) کے عمل کا میدان یہ محسوس جہاں ہے۔ جس سے انہیں معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے۔ حس کو جزئیات کا اور عقل کو کلیات کا اور آخرت کی قوت یعنی وجدان صحیح کے عمل کا میدان غیب کا جہان ہے۔ جس پر وہاں سے علوم کا ترشح ہوتا ہے اور آیاتِ خداوندی اترتی ہیں خواہ وہ جزئیاتی ہوں یا کلیاتی۔

اگر جزئی ہیں تو ان کے مظاہر عمل حس کے ادراک میں بھی آ جاتی ہیں اور اگر کلیاتی ہیں تو ان کی علمی صورتیں عقل پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں اور خالص وجدانی اور غیبی ہیں تو قلب کے زاویوں میں بامانت جاگزیں رہتی ہیں۔ علم اور حظ سے قلب ہمہ وقت و معمور اور مسرور ہوتا ہے۔ لیکن سرچشمہ ان سب کا غیبی ہی جہاں ہے۔ جس سے یہ علوم کبھی سماع سے قلب میں آتے ہیں کہ کوئی ہاتف غیبی خبر دے، کبھی الہام خداوندی سے قلب پر وارد ہوتے ہیں کہ قلب اچانک انہیں محسوس کرنے لگے۔ کبھی علم اور عرفانی تجربات سے خود بخود دل میں ابھر آتے ہیں کہ دل ان کا مورد ہو جائے۔ کبھی تربیت یافتہ عقل باطن کی روشنی سے ان کی انواع متمیز ہو جاتی ہیں۔ جس کی صورت ملکہ اجتہاد، واستنباط ہے اور کبھی عقل ظاہر کی سوچ بچار اور فکر و تدبر سے منکشف ہو جاتے ہیں جیسے عام علمی لطائف و نکات وغیرہ۔ مگر بہر حال یہ سب وجدانی علوم کہے جائیں گے جن کا تعلق حواس یا عقل طبعی سے براہ راست نہیں ہوتا۔

قرآن کریم سے وسائل ادراک کی تعیین..... قرآن حکیم نے ان سب صورتوں کی بنیادیں خود ہی قائم فرمائی ہیں اور ان مختلف الانواع آیات الٰہی سے کچھ سیکھنے اور لینے کے لئے انہی مذکورہ وسائل سماع، فکر، علم اور عقل و انکشاف کا ذکر فرمایا ہے کہ یہی وہ وسائل ہیں۔ جو آیات الٰہیہ سے کچھ سبق لیتے ہیں اور علم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان ہی میں سے انسان کا جوڑا نکل آنے اور ان میں اچانک انس و مودت قائم ہونے کی قدرتی نشانیوں کو سمجھ لینے کا ذریعہ فکر کو بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① ”اس میں بہت پتہ کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں یا مثلاً زمین، آسمان کی پیدائش اور انسانوں کی زبانوں کے اختلاف اور رنگوں کے تفاوت سے جو سبق لیں اور ان میں قدرت کی نشانیاں دیکھیں، اس کا ذریعہ علم کو فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فِیْ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

﴿ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ﴾ ① ''اس میں بہت نشانیاں ہیں جانکاروں کے لئے''۔

یا مثلاً دن اور رات میں انسان کے سونے جاگنے کا انقلاب اور روزانہ قدرتی خزانوں سے اپنا رزق ڈھونڈھ نکالنے میں قدرت کی جو نشانیاں مخفی ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ سماع قبول بتلا دیا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾ ② ''اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو بات سنتے ہیں''۔

یا مثلاً بجلی کی کڑک اور اس سے خوف وطمع کا دلوں میں من اللہ ورود، پھر آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دکھانے کی نشانیوں سے عبرت پکڑنا عقل کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ ③ ''اس میں بہت پتے ہیں عقل والوں کے لئے''۔

یا مثلاً قرون ماضیہ اور پچھلی امتوں کی تباہی اور باوجود ان کی عظیم طاقت وقوت کے برے دن آنے پر انہیں پناہ نہ مل سکنے کی عبرت ناک صورتوں سے درس عبرت لینا قلب کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ﴾ ④ ''اس میں سوچنے کی جگہ ہے۔ اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر''۔ بہر حال فکر، علم، سمع، عقل، وجدان ہی وہ اسباب شمار کر دیئے گئے ہیں جن سے مخفی علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جو اوپر کے دعویٰ کیلئے ایک واضح اور قطعی دلیل ہے۔ غرض انسان میں عموماً علم آنے کے یہی تین راستے ہیں یا تین قوتیں ہیں۔ (حس، عقل، وجدان) جو اعضاء ادراک کے ذریعہ ادراک واحساس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر جبکہ ظاہر نظر میں ادراک، کا عمل ان کے اعضاء ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے عالم ومدرک ان اعضاء ہی کو کہا جاتا ہے اور انہی پر اس علم واحساس کی صحت وسقم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دیکھنے والا آنکھ ہی کو کہا جائے گا۔ مخفی طور پر دیکھنے کا کام قوت باصرہ کا ہے اور سننے والا کان ہی کو کہا جائے گا۔ حقیقتاً سننے والی طاقت قوتِ سامعہ ہے وغیرہ۔

اعضائے ادراک کا باہمی فرقِ مراتب...... البتہ علمی کمال ونقصان کے اعتبار سے ان اعضاء کے علم وادراک میں یکسانی نہیں۔ بلکہ تفاوت اور فرق مراتب کافی ہے، کوئی عضو وسیع العلم ہے اور کوئی ناقص العلم، کوئی عمیق العلم ہے اور کوئی سطحی العلم جس کا معیار یہ ہے کہ جو عضو اپنے علم وادراک سے شی معلوم کی ذات اور اصلیت وحقیقت کا پتہ چلا سکتا ہے۔ اس کے علم کو کامل اور عمیق کہا جائے گا اور یہی علم صحیح معنی میں علم حقیقی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اور جس کا ادراک شی کے محض ظواہر ورسوم اور عوارض تک محدود رہ جانے سے شے کی تمام حقیقت سامنے نہ آسکے، تو اس کے علم کو ناقص، سطحی اور ظاہری کہا جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شے کے ان رسوم وعوارض اور خواص وآثار میں جو عوارض حقیقت سے قریب ہوں گے۔ اسی حد تک ان کا علم ادراک علم حقیقت سے اقرب اور اس سے

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۳۔ ③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴۔
④ پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۷۔

اشبہ کہلائے گا اور اسی درجہ میں اس عضو کی شرافت دوسرے اعضاء پر تسلیم کی جائے گی اور جس حد تک یہ عوارض کا علم، علم حقیقت سے بعید ہوگا۔ اسی حد تک اسے ناتمام، ناقص اور غیر حقیقی علم کہا جائے گا۔

اسی صوری و حقیقی اور سطحی و عمیق علم کا عنوان سامنے رکھ کر یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صورت جیسے ایک کھلی چیز ہے۔ جو سب کے سامنے ہوتی ہے ایسے ہی حقیقت ایک باطنی اور مخفی چیز ہے۔ جو ان ظاہری حواس سے محسوس نہیں ہوتی اور سب جانتے ہیں کہ حقیقت صورت سے افضل ہوتی ہے کہ صورت کے وجود کا سرچشمہ ہی حقیقت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا آسان ہے کہ علم حقیقت یا علم ارواح یا علم باطن اور اس کے متعلقات کا علم، علم اعلیٰ ہوگا اور علم صورت یا علم اجسام یا علم رنگ و بو اور ان کے متعلقات کا علم، علم ادنیٰ ہوگا اور اسی تناسب سے ان علوم کے ادراک کرنے والے اعضاء میں بھی اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہوگا۔

پھر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہ رہنی چاہئے کہ ظواہر اور صور اشکال چونکہ محدود اور بہت سی حد بندیوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ صورت نام ہی حد بندی کا ہے۔ اس لئے ہر ایک شکل اپنی حد میں رہ کر ہی دوسری شکلوں سے ممتاز اور متعارف ہوتی ہے۔ اس لئے ان ظواہر کے علم حاصل کرنے میں بھی حد بندی اور قیود و شرط ناگزیز ہیں کہ انہی حدود میں یہ اعضاء ادراک، ان کا ادراک و احساس کر سکتے ہیں۔ اگر یہ قیود و حدود توڑ دی جائیں تو علم و احساس ہی کا وجود ناممکن ہو جائے گا۔ جیسا کہ آئندہ ان قیود کی تشریح آ رہی ہے۔

اس لئے یہ اصولی دعویٰ بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود و شروط بڑھتی جائیں گی۔ اتنا ہی اس کا علم رسمی، سطحی، جزوی اور محدود ہوتا چلا جائے گا۔ جس کا نفع بھی محدود اور ادنیٰ ہوگا اور اسی حد تک یہ عضو بھی ادنی الاعضاء شمار ہوگا اور جتنا کوئی عضو اپنے علم و ادراک میں رسمی قیود و حدود سے آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی اس کا علم بھی وسیع، گہرا اور حاوی و شامل ہوتا جائے گا اور اسی حد تک یہ عضو بھی اشرفُ الاعضاء شمار ہوگا۔

5 **اعضائے اِدراک کے علم کا باہمی تفاوُت**...... اس معیار کو سامنے رکھ کر جب ہم اس انسانی ہیکل یا کائنات بدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں علم و ادراک کے لحاظ سے سب اعضاء یکساں نہیں ہیں۔ کوئی ذکی الحس ہے اور کوئی غبی اور بلیدُ الحس ہے۔ کسی کا علم اونچا ہے اور کسی کا علم پست، کسی کا وسیع ہے اور کسی کا تنگ اولاً محسوسات ہی کو لیا جائے۔ تو ان میں بھی یہ تفاوت کافی نمایاں ہے۔

مثلاً چھونے کی قوت جیسے قوّتِ لامسہَ کہتے ہیں۔ سب سے زیادہ بلید اور غبی قوت ہے۔ جس کا علم بہت سی قیدوں کے ساتھ مقید اور بہت سی حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں اولین شرط تو یہی ہے کہ وہ جس شے کی ادراک کرے وہ جسمانی ہو، روحانی یا معنوی نہ ہو کہ روحانیت کا علم و ادراک اس کی دسترس سے باہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اس جسم کو بھی وہ دور سے معلوم نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اس سے آ کر لگ نہ جائے اور یہ اسے چھونہ دے یعنی اس کے لئے اپنے معلوم سے محض قرب و اتصال کافی نہیں۔ بلکہ الصاق اور مل جانا ضروری

ہے اور پھر اس نہائی اتصال یعنی ٹکراؤ کے باوجود بھی اسے کسی شے کا شخصی تمیز حاصل نہیں ہوتا صرف جنسی یا نوعی امتیاز کا ادراک ہوتا ہے، اور وہ بھی مبہم اور اجمالی یعنی کسی چیز کو چھو کر اس چیز کی سختی، نرمی، گرمی، ٹھنڈک کا احساس ہوسکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ لکڑی ہے یا پتھر، لوہا ہے یا مٹی یعنی زیادہ سے زیادہ اس کی نوعیت کا علم ہوسکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا مشخص اور ممتاز علم نہیں ہوسکتا کہ وہ شخصی طور پر کیا ہے اور کون ہے؟

یعنی نوع کے ان عوارض سے بھی وہ کسی فرد کی تشخیص کر کے اس کی ذات کے بارے میں کوئی غیر مبہم علم حاصل نہیں کرسکتی۔ حالانکہ کسی شئے کا جسم ظاہر ترین اشیا ہے۔ جس میں کوئی خفا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اس موٹے اور نمایاں جسم کو بھی یہ قوت بغیر ٹٹولے اور بغیر اس سے لگے لپٹے اسے یا اس کے بعض عوارض کو محسوس نہیں کرسکتی۔ تو اس سے زیادہ غبی اور بلید اور کون سی قوت ہوگی۔

پس علم کی وہ حقیقت جس کا نام تمیز بین الاشیاء ہے۔ اسے بہت ہی معمولی درجہ کی نصیب ہوئی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہ قوت انسانی مدرکات میں نہایت کم رتبہ اور حقیر قوت ہے۔ جس کے علم کو نام ہی کے درجہ میں علم کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ لاعلمی اور جہل سے ہی زیادہ قریب ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ قوت لامسہ کے ذریعہ کسی چیز کو چھو کر احساس کر لینا کوئی خاص کمال نہیں، ایک غبی سے غبی اس قوت کے ذریعہ موٹے موٹے مادوں کا ادراک واحساس کرسکتا ہے۔ جس میں صلاحیت بھی نہ ہو کہ چھو کر بھی کسی شئے کو کسی حد تک معلوم کرلے۔ تو اس سے زیادہ احمق اور جاہل اور کون ہوسکتا ہے؟ اسے تو جاندار کے بجائے پتھر اور لکڑی کہا جائے گا۔ تو یہی اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔

چنانچہ قرآن کریم نے کفار کا قرآن کے ساتھ عناد اور انکار ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ منکر ایسے بلید الحس اور غبی الفہم ہیں کہ اگر وہ کتاب الٰہی کو دیکھ بھی لیں اور اسے ہاتھ سے چھو بھی دیں۔ تب بھی وہ اس کا انکار ہی کریں گے''۔ ظاہر ہے کہ کسی شے کے ظہور وشہود کا اس سے آگے اور درجہ ہی کون سا ہے کہ اسے دیکھ بھی لیا جائے اور چھو بھی دیا جائے اور پھر بھی وہ شے دماغ میں نہ اترے تو انہیں حیوان بھی نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ انسان کہا جائے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِأَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ① ''اور اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتے۔ پھر یہ لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔ تب بھی یہ کافر لوگ یہ ہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے۔ قرآن کے اس بیان تنزل سے واضح ہوا کہ اس کی نظر میں قوت لامسہ غبی ترین قوت ہے جس کا ادراک نہایت ہی گھٹیا درجے کا علم ہے۔ جو محض جسم کو نوع اور جسم کے اوپر نمایاں عوارض، طول وعرض اور عمق کے ادراک سے آگے نہیں بڑھتا اور وہ بھی ٹٹول کر جس میں پورا ابہام رہتا ہے۔ کوئی خاص تمیز حاصل نہیں ہوتی۔ تاکہ کسی نوع کے اشخاص وافراد متمیز ہو جائیں۔ اس لئے اس کے علم کو علم کہنا درحقیقت علم سے لاعلمی کا اظہار کرنا ہے۔ اور اس

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷.

لئے اس کے ذریعے ایسے مبہم علم کا حاصل کرنے والا اہلِ علم میں شمار نہیں ہوسکتا۔

6 **قوتِ ذائقہ**......دوسری قوت ذائقہ ہے جس کا محل زبان ہے۔ وہ کھٹے میٹھے کا پتہ چلالیتی ہے جو ایک باطنی خاصہ ہے۔ لیکن یہ قوت بھی اس وقت تک کسی چیز کے مزے کا ادراک نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ ذائقہ دار چیز کو زبان سے ملا نہ دیا جائے۔ اس لئے یہاں بھی وہی اِتصال تام بلکہ الصاق اور شئے کے لگ جانے کی شرط ہے جو قوتِ لامسہ میں تھی کہ یہ بھی بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے ذائقہ کا ادراک نہیں کرسکتی اور جتنا بھی کرتی ہے وہ شے کے عوارض کھٹے میٹھے تک ہی محدود ہے۔ جس سے شے کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے اسے بھی قوت لامسہ کا ایک فرد سمجھنا چاہئے۔ فرق اتنا ہوگا کہ لمس ومس کی قوت جب ہاتھ پیر اور جلد بدن کے ذریعہ اپنا کام کرتی ہے تو جسم کی سختی اور نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا احساس کرتی ہے اور جب زبان کے ذریعہ کام کرتی ہے تو ذائقے اور مزے کا احساس کرلیتی ہے بلکہ اسی کا ایک فرد قوت شہوانی بھی ہے۔ جو حقیقتاً قوتِ لامسہ ہی ہے کہ بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے لذت کا احساس نہیں کرسکتی ہے۔ پس یہی لامسہ جب اعضاء شہوت پر ظاہر ہوتی ہے تو شہوانی لذتوں کا ادراک کرلیتی ہے۔ لیکن لامسہ کی ان سب قسموں میں قدرے مشترک یہی ہے کہ وہ کسی جسم سے لگیں اور چمٹیں تب ہی ادراک کرسکیں گی بغیر اس کے یہ جسمانی خواص وعوارض ان کے احساس میں نہیں آسکتے۔ فرق اگر ہے تو قوت کا نہیں محل کا ہے۔ یعنی جس محل میں لگنا اور چھونا واقع ہوگا اسی محل کے عوارض احساس میں آجائیں گے کہیں سختی نرمی کہیں مزہ اور ذائقہ اور کہیں لذات شہوت وغیرہ البتہ ان میں سے بعض ظاہر بدن کے عوارض ہیں اور بعض باطن بدن کے اور بعض باطن بدن سے بھی گذر کر نفس کے اور اسی لحاظ سے ان میں فرق مراتب ہے کہ بعض اس سے اعلیٰ ہیں۔ جیسے مزہ اور ذائقہ کہ وہ فی الجملہ باطن جسم سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جیسے لذت شہوت کہ وہ بدن کی گہرائیوں میں نفس کے عوارض سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جو ایک باطنی کیفیت ہے مگر اس فرق کے باوجود ان سب میں قدر مشترک وہی لمس ومس (لگنا اور چھونا) ہے۔ اس لئے یہ سب قوت لامسہ ہی کے افراد شمار کئے جائیں گے۔ جنہیں کسی شے کی حقیقت وماہیئت کی دریافت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس قوت لامسہ کے لمس ومس یعنی لگنے چھونے کو بعض جگہ ذوق سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے بھی قوت لامسہ ذائقہ ہی کا ایک فرد ہے۔ چنانچہ روز قیامت عذاب نار اور عذاب سقر (جہنم) میں بدن سے مس کرے گا۔ جب ہی اس کی اذیت محسوس ہوگی۔ لیکن اس مس کو قرآن حکیم میں چکھنے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ [1] ''سقر (عذاب جہنم) کے چھونے کا مزہ چکھو''۔

جس سے لامسہ اور ذائقہ کا ایک دوسرے سے قریب ہونا معلوم ہوا یا جیسے موت ایک چھونے کی چیز ہے جس

---

[1] پارہ: ۲۷، سورۃ القمر، الآیۃ: ۴۸۔

کے لگنے سے روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لگنے ہی کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا۔ جیسے ارشاد حق ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ① ''ہر نفس کے لئے موت کا مزہ (چکھنا) ہے''۔

پس چیز چھونے کی تھی، جس کا تعلق لمس اور مس سے تھا اور اسے تعبیر کیا گیا ذائقہ سے۔ یا جیسے قرآن کریم نے جہاں ایک بستی کے کفرانِ نعمت پر جسے رزق ہر طرف سے دیا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ بد ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ ② ''اللہ نے انہیں لباس جوع وخوف کا مزہ چکھا دیا''۔

ظاہر ہے کہ عذاب مس کرنے کی چیز ہے اسی لئے تو اسے لباس فرمایا گیا کہ جیسے لباس بدن سے چپک جاتا ہے۔ ایسے ہی عذاب بھی اس بستی کے تن پر لباس کی طرح چست ہو گیا کہ نہ وہ اسے جلدی سے اتار سکتے تھے نہ اس کی اذیت سے بچ سکتے تھے۔ لیکن اس اذیت اٹھانے کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا کہ اللہ نے اس بستی کو عذاب جوع وخوف کے لباس کا ذائقہ چکھا دیا۔

جس سے واضح ہے کہ وہ لباس کا چھونا تو بدن سے لگنے اور چمٹنے کی چیز ہے، مگر چونکہ وہ تاثر کے لحاظ سے چکھنے سے اَقرب ہے۔ اس لئے اسے ذائقہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ جس سے قرآنی روشنی میں بھی کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ کہ ذائقہ کی قوت لامسہ کی قوت سے الگ نہیں بلکہ اسی کا ایک فرد ہے یہ الگ بات ہے کہ قوت ذائقہ، لامسہ کا ایک اونچا فرد ہے۔ مگر جب کہ وہ لامسہ ہی ہے اور لمس و مس ہی پر اس کے ادراک کا دارو مدار ہے تو اسے لامسہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور جو حکم لامسہ کا ہوگا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ سو لامسہ کسی شے کی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتی بلکہ صرف اس کے بعض بدنی عوارض ہی کے ادراک تک محدود ہے۔

ایسے ہی ذائقہ بھی خواہ زبان سے چکھنے کا ہو یا اعضاء شہوت سے چکھنے کا رہے گا عوارض بدن کی کے پہچان کی حد تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے قوت ذائقہ کا علم بھی ادنی ہی درجہ کا علم ثابت ہوا۔ جسے علم کی فہرست میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا جا سکتا اور اس کے مدرک و عالم کو اقلیم تن کے علماء کی فہرست میں شمار نہیں کیا جائے گا کہ یہ کوئی معتدبہ علم ہی نہیں۔

④ قوتِ شامّہ...... رہی قوت شامّہ (سونگھنے کی قوت) سو وہ بلاشبہ اپنی کار فرمائی میں بظاہر لامسہ اور ذائقہ کے طرح لمس و مس کی محتاج نہیں۔ بلکہ جسم سے ملے بغیر دور ہی سے خوشبو یا بدبو کا احساس کر لیتی ہے۔ اس لئے اس قوت کو قوت لامسہ کی طرح بلید الحس اور ضعیف الاحساس نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ذکی الحس باور کیا جائے گا، کیونکہ وہ کسی شے کی خوشبو، بد بو سونگھنے میں اس کی محتاج نہیں کہ خوشبو دار چیز کو ناک سے رگڑا جائے۔ جب ہی وہ اس کی خوشبو کا ادراک کرے۔ بلکہ وہ دور سے بھی خوشبو کو محسوس کر لیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی قوت لامسہ سے کچھ دور

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۵۷. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۱۲.

نہیں۔ کیونکہ اس میں خوشبودار شے کا ناک سے لگ جانا ضروری ہے۔ خواہ اسے ہوا ہی لا کر لگائے۔

چنانچہ پھول کہیں رکھ دیئے جائیں۔ تو سارا مکان مہک جاتا ہے اور ہر ناک اسے دور سے ہی سونگھ لیتی ہے یا کسی پھول دار درخت کے پھولوں کی خوشبو بعض اوقات بیسیوں گز دور سے محسوس کر لی جاتی ہے جو ہوا کا کرشمہ ہے گو درخت ناک کے قریب نہیں۔ لیکن اس سے سونگھنے کی قوت کی کوئی فوقیت یا لطافت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہوا کہ لطافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ناک کی قوت درخت تک نہیں جاتی بلکہ ہوا اس کی خوشبو کو ناک تک کے لے آتی ہے، اور ناک اسے جب ہی سونگھتی ہے کہ وہ خوشبو اڑ کر ناک تک آ جائے اور اسے لگ جائے۔ فرق اتنا ہے کہ لامسہ اور ذائقہ میں ذائقہ دار چیز کا مزہ اور ذائقہ زبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ خود اس چیز کو زبان سے نہ ملا دیا جائے۔ لیکن خوشبو ذائقہ اور مزہ سے اس حد تک ضرور لطیف ہے کہ اپنے محل یعنی پھول وغیرہ سے الگ ہو کر اور اڑ کر ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر ناک اسے جب ہی محسوس کرے گی کہ وہ ناک سے آ لگے پس لامسہ میں خود جسم آ کر لگتا ہے۔ تب ہی وہ احساس کرتی ہے اور شامہ میں جسم کے یہ عوارض یعنی خوشبو یا بدبو آ کر ناک کو لگتے ہیں۔ تب وہ ان کا احساس کرتی ہے۔ خواہ وہ ہوا ہی کے ذریعہ آئیں مگر مس کرنا بہر حال ضروری رہا۔ ورنہ سونگھنے کی قوت ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ اس لئے سونگھنے کی قوت بھی چھونے کے قوت سے اپنی کارکردگی میں کچھ زیادہ فائق نہیں ثابت ہوئی۔ فوقیت اگر ہے تو ان کے محسوسات میں ہے کہ ایک کا محسوس کثیف ہے اور ایک کا لطیف لیکن حاسے دونوں کے یکساں ہیں۔ پر اس میں بھی یہ چھونے اور چکھنے کی قوتیں یکساں ہی ہیں کہ شے کی حقیقت کا ادراک ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتی صرف عوراض شے کا احساس کرتی ہے۔ اس لئے گو بعض جہات سے قوت لامسہ اور ذائقہ پر کچھ فائق سہی۔ مگر شرائط ادراک اور نوعیت ادراک میں سب قریب ہی قریب ہیں۔

پھر یہ سب قوتیں صرف اجسام ہی میں اپنا کام کر سکتی ہیں نہ کہ ارواح وحقائق میں۔ چنانچہ روح نہ چھوئی جا سکتی ہے نہ ٹٹولی جا سکتی ہے اور نہ ہی چکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر سب میں وہ اتصال اور لگنے کی شرط بھی مشترک ہے کہ جب ان کا محسوس ان سے آ کر ملے جب ہی وہ ادراک کر سکتی ہیں ورنہ نہیں اور ادھر ان سب کی سب کا ادراک پھر بھی عوارض جسم ہی تک محدود ہے، ذات تک ان میں سے کسی کی بھی رسائی نہیں کہ اسے معلوم کر لیں۔ اس لئے اس سونگھنے کی قوت کا علم وادراک بھی کچھ زیادہ معتد بہ اور قابل شمار ثابت نہ ہوا۔

8 **قوتِ شامّہ کے جزوی علم پر قرآنی اِستشہاد**...... قرآن حکیم سے بھی اس کی طرف راہنمائی ملتی ہے کہ محض سونگھ لینا کوئی خاص اور امتیازی شان کا علم نہیں۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خوشبوئے یوسف سونگھ لینے کی حکایت سے جو قرآن نے کی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ ① ”میں (یعقوب علیہ السلام) یوسف کی خوشبو پاتا ہوں کہیں تم مجھے جھٹلا نہ دو“۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۹۴.

آیت میں ریح یوسف فرمایا گیا ہے محض ریح اور خوشبو نہیں کہہ دیا گیا ہے یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایک خوشبو پاتا ہوں۔ (معلوم نہیں کس کی ہے؟) بلکہ یہ فرمایا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں۔ جس میں خوشبو والے کا علم بھی شامل تھا۔ جو ایک مشخص اور واقعاتی علم ہے۔ تو انہیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ کہیں اسے جھٹلا نہ دیا جائے۔ جو ایک حقیقت واقعہ کی تکذیب ہوگی۔ ورنہ اگر مطلقاً کسی خوشبو سونگھ لینے کی بات ہوتی تو جھٹلانے کی فکر نہ ہوتی۔ کیونکہ مطلقاً کوئی خوشبو ناک میں آ جائے تو خود سونگھنے والے کو بھی تردد لاحق ہو سکتا ہے کہ یہ کس چیز کی خوشبو ہے۔ اس لئے اگر دوسروں کو بھی اس میں تردد لاحق ہو اور وہ اسے جھٹلا دیں تو جھٹلا دینے کی کوئی بھی فکر سونگھنے والے کو نہیں ہوتی، کہ وہ خود بھی کسی متمیز حیثیت تک پہنچا ہوا نہیں جھٹلانے کی یہ فکر جب ہی ہوتی ہے کہ ناک میں معین شیئے کی خوشبو آئے اور اس علاقہ کے ساتھ آئے کہ یہ فلاں کی خوشبو ہے، کسی اور کی نہیں تو یہ ایک متمیز اور معتد بہ علم ہوتا ہے جسے جھٹلانے کا کوئی واقعہ نہیں۔

پس آیتِ کریمہ سے صاف واضح ہے کہ خوشبوئے معین جس میں خوشبو والا بھی مشخص ہو علم ہے جو قابل تکذیب نہیں۔ اس کا اقتضائی نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ مطلقاً خوشبو سونگھ لینا جس میں خوشبو والا ذہن میں مشخص نہ ہو۔ کوئی معتد بہ علم نہیں اور ظاہر ہے کہ ناک کا علم اتنا ہی ہے کہ وہ خوشبو سونگھ لے نہ کہ اس کے ساتھ خوشبو والے کو بھی مشخص کرے کہ یہ ناک کا کام نہیں، ذہن کا کام ہے۔ تو قرآن سے بطور اِقتضائے نص واضح ہو گیا کہ ناک کا علم جس میں صرف خوشبو ذہن میں حاضر ہوتی ہے خوشبو والا مشخص نہیں ہوتا۔ کوئی اعلیٰ علم نہیں کیونکہ ناک بنائی ہی گئی ہے، صرف خوشبو کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ خوشبو والی اشیاء کی تشخیص کے لئے۔

قوت لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا علم کوئی معتد بہ علم نہیں ہے...... اس لئے جیسے چھونے اور چکھنے کا علم نصوص قرآنی کی روشنی میں کوئی اعلیٰ علم ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس پر دوررس نتائج و ثمرات مرتب ہوں بلکہ محض ایک جزوی علم تھا۔ ایسے ہی سونگھنے کا علم بھی اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں کوئی اونچا علم نہیں نکلتا کہ اس پر دین و دنیا کے کچھ دوررس اور اہم ثمرات مرتب ہوں۔ بلکہ ایک جزوی علم ثابت ہوتا ہے جس سے نہ کسی شے کی تمام حقیقت واضح ہوتی ہے اور نہ خود شے ہی متمیز ہوتی ہے۔ اس لئے ناک بہرحال پھر اپنے ہی جزوی علم کے مقام پر آ کر ٹھہر گئی اور اسے کوئی اصولی فوقیت ہاتھ، پاؤں اور زبان پر حاصل نہ ہو سکی، اس پر ثمرات بھی جزوی مرتب ہوں گے جو قابل شمار نہ ہوں گے۔ اب جب کہ چھونے، چکھنے، سونگھنے یعنی قوتِ ذائقہ، قوتِ شامہ اور بالفاظ دیگر ہاتھ، پیر، زبان اور ناک کا علم معتد بہ نہ رہا۔ بلکہ ایسا جزوی ثابت ہوا کہ ان پر انسان کے حق میں کچھ دوررس نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

معتد بہ علم آنکھ کان اور قلب ہی کا ہے...... اس لئے مدرک اعضاء میں اب تین ہی بنیادی اعضاء رہ جاتے ہیں کہ ان کے علم کو ان مذکورہ اعضاء کی نسبت سے معتد بہ علم کہا جائے۔ آنکھ، کان اور قلب یعنی دیکھنے کا علم، سننے کا علم اور سمجھنے کا علم جن کے علم کو علم شمار کیا جائے اور وہ اہمیت کے ساتھ قابل ذکر ہوں اور پھر ان معلومات پر دنیا و آخرت

کے دوررس نتائج مرتب ہوں سوغور کیا جائے تو یہ تینوں اعضاء اوران کی یہ علمی قوتیں حقیقتاً ایسے علم وادراکات کی حامل ہیں۔ جن کا علم بہت حد تک امتیاز وتمیز کی شان بھی ہے جو علم کی حقیقت ہے اور اسکے نتائج بھی دوررس انداز میں انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات بدن کی بقاء وترقی کا راز کچھ انہی تین اعضاء کے علم میں مضمر ہے، اور انسان سے مواخذہ اور دنیا وآخرت میں پرسش وجواب کی ذمہ داری زیادہ تر انہی تین قوتوں سمع، بصر اور فہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں جہاں انسان کے قابل ذکر اور موجب مسئولیت ومواخذہ علم و ادراک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہاں خصوصی طور پر انہی تین قوتوں سمع، بصر اور سمجھ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

سمع، بصر اور قلب کی عطا...... ایک موقع پر جہاں انسان پر علم دیئے جانے کے احسان کو جتلایا گیا ہے وہاں انہی تین قوتوں کے عطاء فرمانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ انسان میں قابل اعتناء اور قابل ذکر یہی تین علمی قوتیں ہیں۔

سمع، بصر اور قلب کا اِحساناً ذکر فرمایا گیا...... چنانچہ بطن مادر میں انسان کی ان ہی قوتوں کے رکھے جانے کا احسان ذیل کے الفاظ میں جتلایا گیا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ''پھر اس (نفس) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح ڈالی اور تمہارے لئے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں رکھیں مگر تم کم ہی شکر کرتے ہو''۔ پھر بطنِ مادر سے نکالتے ہوئے بھی انسان پر انہی تین قوتوں کی ایجاد وعطا کا احسان جتلایا گیا ہے۔ ارشاد حق ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ② ''اور اللہ نے نکالا تم کو تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو''۔

انسانی گمراہی کے ذمہ دار بھی یہی اعضاءِ ثلاثہ ہیں...... پھر آدمی کی ذمہ داری بھی انہی قوتوں کی بدراہی اور مسخ ہوجانے پر عائد ہوگئی ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرالیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بچلا دیا اسکو اللہ نے جانتا بوجھتا، اور مہر لگادی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اس کی آنکھ پر اندھیری۔

انہی اعضاء ثلاثہ کو مسئول بھی قرار دیا گیا ہے...... پھر انسانی بدراہی کے موقعہ پر انہی تین قوتوں کی بے راہ روی پر دنیوی اور اُخروی مسئولیت بھی عائد کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ ''اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی''۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۶۔

اعضاء ثلاثہ کا غلط مصرف ہی عذابِ جہنم کا سبب ہوگا...... اور آخر جب آدمی اپنی جاہلانہ اور عاصیانہ حرکتوں کے مسلسل ارتکاب سے دنیا میں حیوان صفت اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوگا۔ تو اس کی کل ذمہ داری انہیں تین عملی قوتوں پر ڈالی گئی ہے کہ جب یہ معتدبہ قسم کے تین علم تمہیں دیئے جاچکے تھے اور تم نے عواقب اور نتائج کو ان قوتوں کی بدولت سمجھ لیا تھا۔ تو پھر ان سے حق جوئی کا کام کیوں نہیں لیا؟ اور کیوں ان ناشائستہ حرکتوں میں مبتلا رہے؟ اس سے واضح ہوا کہ علمی زندگی کے بننے بگڑنے کا تعلق زیادہ تر انہی تین علوم وادراکات سے ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ① ''اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ، وہی لوگ ہیں غافل''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ② ''مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

اعضاء ثلاثہ کے علم پر ہی ثمرات دنیا و آخرت کا مدار ہے...... بہرحال ان نصوصِ کریمہ سے واضح ہے کہ ان تین اعضاء آنکھ، کان اور قلب کا علم ایک بنیادی اور اساسی علم ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کے ثمرات زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ تین علم غلط ہوجائیں۔ تو دنیا کا علم اور آخرت کا سکون کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر یہ صحیح ہیں اور اپنے صحیح آثار دکھلا رہے ہوں تو انہی سے آخرت و دنیا دونوں بن جاتی ہیں۔

اس موقعہ پر ہاتھ، پاؤں، ناک یعنی لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا علم ایسا بنیادی اور معتدبہ قسم کا نہیں۔ جو دنیا و آخرت کے بننے بگڑنے کا مدار کار ہو۔ بلکہ بہت حد تک یہ تینوں علم انہی بعد کے تینوں علموں کے تابع اور انکے زیر اثر ہیں پس اصل علم یہی تین علوم ٹھہر جاتے ہیں۔ عینی علم جو آنکھ سے حاصل ہو، سمعی علم جو کان سے حاصل ہو اور فہمی علم جو قلب سے ابھرے۔

⑨ **کثرتِ قیود و شرائط وسعتِ علم کے لئے مانع ہیں**...... لیکن باوجود ان تینوں عملی قوتوں کے معتدبہ اور قابل ذکر ہونے کے پھر بھی اسی معیار کی رو سے کہ جس علم کے لئے ادراک کی قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ علم وسیع نہیں رہتا اور جس پر قیدیں اور شرطیں کم ہوں۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

اعضائے ثلاثہ میں آنکھ کا دائرہ علم سب سے تنگ ہے...... ان تینوں علوم میں بھی تفاوت اور فرق مراتب ہے۔ جو قرآن ہی کا مقتضاء ہے مثلاً آنکھ کے علم میں چونکہ قیود و شروط بہت ہیں اور کان کے علم میں کم۔

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۔

اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ کان کی بہ نسبت تنگ اور محدود ہے۔ چنانچہ آنکھ کا علم اول تو صرف جسمانیات تک محدود ہے وہ مادیات کو تو دیکھ سکتی ہے۔ روحانیت کو نہیں۔ اس نے آج تک خود اپنی روح کو بھی باوجود انتہائی قرب کے نہیں دیکھا جس سے واضح ہے کہ معنویات اور لطائف کے ادراک سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ آنکھ سے اگر انسان کی صورت پوچھو تو بتادے گی۔ لیکن اگر اس کی حقیقت اور معنویت پوچھنے لگو تو وہ معذور رہ جائے گی۔ پھر بلحاظ زمانہ جسمانیات کے دائرہ میں بھی اسے ماضی و مستقبل کے دیکھ لینے سے کوئی واسطہ نہیں جو چیزیں جاچکی ہیں یا جو آنے والی ہیں۔ آنکھ ان کے دیدار سے محروم ہے اور ان کی صورت، شکل یا جسم کا کوئی بھی پتہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس کا دائرہ عمل صرف حال رہ جاتا ہے کہ وہ صرف موجوداتِ وقت پر نظر ڈال لے اور ماضی و مستقبل کے دیدار سے محروم رہے۔ پھر موجوداتِ وقت کے دائرہ میں بھی اس کے دیکھنے کے لئے تقابل شرط ہے کہ وہ چیز آنکھ کے سامنے ہو۔ دائیں بائیں یا پس پشت ہوئی تو وہ پھر ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ پھر تقابل میں بھی اتصال معتدل کی شرط ہے کہ قابل دید شئے آنکھ سے نہ زیادہ دور ہو نہ زیادہ نزدیک۔ بہت دور ہو تب بھی آنکھ بے کار ثابت ہوتی ہے اور بہت نزدیک ہو حتیٰ کہ آنکھ سے ملادی جائے تو پھر بھی وہ دیدار سے عاجز رہ جاتی ہے۔

پھر اس معتدل فاصلہ کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ بیچ میں کوئی حائل اور حجاب بھی نہ ہو۔ اگر ذرا سا پردہ بھی بیچ میں آجائے تو آنکھ دیدار سے معذور رہ جاتی ہے۔ پھر بلا حائل ہو کر بھی دیکھنے کی چیز کا سکون شرط ہے۔ اگر وہ متحرک ہو تو پھر بھی اس پر نگاہ نہیں جم سکتی کہ دیدار ہو جائے اور بینائی اپنا صحیح کام کر جائے۔ پھر بھی خواہ مخواہ نگاہ جمادی جائے گی تو گو دیدار ہو جائے گا۔ مگر غلط ہوگا کہ شئے کچھ سے کچھ دکھائی دینے لگے گی۔ جیسے ایک گول پہیہ حرکت کرتا ہوا دیکھا جائے تو اس کے درمیان کا قطر اور اس کی کڑیاں سب نگاہوں سے غائب ہو جائیں گی اور پہیہ بجائے درمیانی خلاؤں کو دکھانے کے متصلِ واحد ایک ٹھوس جسم دکھائی دے گا۔ جو اس کی واقعی ہیئت نہیں ہے۔

بہر حال آنکھ کی کارفرمائی میں ایک دو نہیں بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کے بغیر وہ اپنی کارفرمائی نہیں کر سکتی۔ یعنی شے کا جسمانی ہونا، مقابل ہونا، حال ہونا، متصل ہونا، بلا حائل ہونا، ساکن ہونا وغیرہ کہ ان شرطوں کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ثابت ہوا اور اس سب کے باوجود جتنا بھی علم ہوگا وہ سطحی ہوگا وہ سوائے اوپر اوپر کی صورت اور رنگ و نقش کے کچھ اور نہیں دیکھ سکے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی جسم کا جگر تک چاک کر کے اسے دکھایا جائے تب بھی اسے سطح اور رنگ ہی نظر آئے گا۔ کوئی گہری حقیقت ہرگز منکشف نہ ہوگی۔

بندگانِ عقل کا علم بصر پر غلط اعتماد...... اس لئے یہ علم اصلی ہونے کے باوجود پھر بھی سطحی اور غیر معتد یہ ثابت ہوتا ہے۔ جس پر آج دنیا میں بے حد فخر و غرور کا اظہار کیا جا رہا ہے اور عینی مشاہدہ ہی کو اصل الاصول اور یقین کی بنیاد باور کرایا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی شے کا علم جو اس کے بارے میں یقین و اطمینان کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا مشاہدہ ہے نہ کہ اوپری صورت اور نقش و نگار کا معائنہ ہے۔ پس آنکھ کے مشاہدہ کا جب کہ حقائق سے تعلق

ہی نہیں جو کسی شے کی حقیقت کے بارے میں یقین واطمینان کی بنیادیں مستحکم کر سکے۔ تو اس کے علم کو کسی درجہ میں علم حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی ہر دور کے دہریئے اپنے عینی مشاہدات ہی کو اصل سمجھ کر معنویات میں بھی عینی مشاہدہ کے طلب گار رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لطیف وخبیر خدائے برحق کے بارے میں بھی عینی مشاہدہ ہی کا مطالبہ کر کے ایمان کو اس پر معلق کر چکے ہیں یہود نے کہا تھا کہ ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ① ''(اے موسیٰ) ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں''۔ یا مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ ﴿اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا﴾ ② ''(اے پیغمبر) ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، یا لے آ، اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے''۔

لیکن ان بندگان عقل کو اس کا شعور نہ ہوا کہ آنکھ معنویات اور لطائف کے احساس کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ جیسا کہ کان صورتیں دیکھنے کے لئے اور ناک آوازیں سننے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ اس لئے جیسے کان سے صورتیں دیکھنے اور ناک سے آوازیں سننے کا مطالبہ لغو اور بے عقلی ہے۔ ایسے ہی آنکھ سے علم واخلاق، یا روح یا حق تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ بھی خلاف فطرت اور کج عقلی ہے۔ پس دیکھنے کا تعلق صرف رسوم ونقوش اور سطوح وخطوط سے ہے نہ کہ شئے کی ذات اور حقیقت سے اور یقین کی بنیادیں رسوم ونقوش پر قائم نہیں ہوتیں۔ بلکہ شے کی ذات اور اس کے حقائق کے ادراک پر قائم ہوتی ہیں۔ اس لئے آنکھ کا علم ان تینوں آلات علم آنکھ، کان قلب میں سے اپنی ذات میں قلیل ترین اور محدود ترین علم ثابت ہوتا ہے جسے آج سب سے اونچا علم ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج اس کے دوررس ہوں۔

10 کان اور قلب کا دائرہ علم آنکھ سے وسیع ہے...... بخلاف کان اور قلب کے کہ ان دونوں کا علم آنکھ سے کہیں زیادہ وسیع اور حقیقی ہے۔ وہ ٹھوس جسم کے بجائے اس کے لطیف ترین عوارض کا ادراک کر لیتے ہیں جو آنکھ کے بس کی بات نہیں پھر ان میں زمان ومکان کی بھی قید نہیں کہ کان صرف وقت پر ہی بات سنیں۔ بلکہ وہ ماضی اور مستقبل کے واقعات کا بھی ادراک کر لیتے ہیں اور زمانہ بیچ میں حائل نہیں ہوتا۔ پھر کان کے سننے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آواز سنانے والا کان کے متقابل ہو کر ہی آواز لگائے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ دائیں بائیں، آگے پیچھے جہاں سے بھی آواز آئے گی کان سن لیں گے اور دل اسے کچھ نہ کچھ سمجھ لے گا۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آواز دینے والا کان سے مل کر یا بہت قریب آ کر ہی آواز دے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ میلوں دور کی آوازیں بھی کانوں میں سما جاتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں اور دل ان کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔

پھر ان دونوں کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ درمیانی حائل ان کی سماعت میں رکاوٹ پیدا کر دے کہ بلا حائل تو آواز سنی جائے، ورنہ نہیں بلکہ پس دیوار اور مقفل مکانوں کی آوازیں بھی کانوں میں فوراً آ جاتی ہیں اور وہ ادراک کر

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۵۵۔ ② پارہ: ۱۵، سورة الاسراء، الآیة: ۹۲۔

لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کان صرف امور حاضرہ ہی کا ادراک کریں۔ بلکہ امور غائبہ اور مخفی واقعات بھی آواز کے ذریعہ کانوں کے پردوں میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے کان اور قلب یا سمع اور فہم کا علم بلاشبہ آنکھ کے علم سے کہیں زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور گہرا ثابت ہوتا ہے۔ جس میں آنکھ کی بہ نسبت قیدیں اور شرطیں آدھی بھی نہیں ہیں۔

کان اور قلب کے واقعاتِ گذشتہ کے ادراک کرنے پر قرآنی استشہاد...... چنانچہ قرآن کریم نے جہاں نگاہوں سے اوجھل اور ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے امور کا ذکر عبرت وموعظت کے لئے کیا ہے۔ وہاں آنکھ کا ذکر نہیں فرمایا وہ اس میدان میں کام کر سکتے ہیں۔ ارشادِ حق ہے ﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا﴾ ① کیا سیر نہیں کی ملک کی، جو اس کے دل ہوتے جن سے سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے سنتے۔ کیوں کہ ہزاروں برس قبل کی ماضی کی سرگذشتوں اور سرکشوں کا انجام بد آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کان ہی اسے سچی خبروں سے سن سکتے تھے اور دل ہی اسے سمجھ کر عبرت پکڑ سکتے تھے۔

چنانچہ جو لوگ حق کے بارہ میں نہ سننے سے کام لیتے تھے نہ سمجھنے سے، نہ کانوں کو متوجہ کرتے تھے نہ دلوں کو قرآن حکیم نے انہیں ڈھوروں اور ڈنگروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کے انہی دو اعضاء کان اور قلب کے بگڑ جانے کا ذکر فرمایا کہ ان دو کے معطل ہو جانے سے سارا نفسِ انسانی انسانیت سے نکل کر اور معطل ہو کر حیوانوں کی لائن میں چلا گیا فرمایا: ﴿أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ ② ''کیا آپ کو گمان ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو چوپایوں کی مانند ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہوئے ہیں''۔

اس طرح تذکیر موعظت کے موقعہ پر کانوں اور دلوں ہی کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ماضی بعید کی داستانیں کانوں سے سن کر دلوں کا ان سے نصیحت وعبرت پذیر ہونا، کان اور قلب ہی کا کام ہو سکتا تھا نہ کہ آنکھ کا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَحِيصٍ. إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ ③ ''اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ ان کی قوت زبردست تھی ان سے پھر لگے کریدنے شہروں میں۔ کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانا۔ اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہو یا لگائے کان دل لگا کر۔''

اسی لئے کفار بھی قیامت کے دن اپنی انہی دو قوتوں سے دنیا میں کام نہ لینے پر حسرت کریں گے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ ④ ''اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے، دوزخ والوں میں سے''۔

---

① پارہ: ۱۷، سورۃالحج، الآیۃ: ۴۶۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃالفرقان، الآیۃ: ۴۴۔
③ پارہ: ۲۶، سورۃق، الآیۃ: ۳۶، ۳۷۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃالملک، الآیۃ: ۱۰۔

کان کا دائرہ ادراک بھی قلب کے مقابلہ پر محدود ہے......لیکن غور کیا جائے تو کان باوجود اس وسعت علم کے جو ابھی ذکر کی گئی۔ پھر بھی بہت سی قیود اور حدود کا پابند اور محتاج ہے اور کم سے کم یہ قید تو اس پر بہر حال عائد ہے ہی کہ وہ جسمانیات سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور جسمانی دائرہ میں بھی آواز ہی کی حد تک اس کا دائرہ علم کام کرسکتا ہے، اور وہ بھی اس شرط سے کہ وہ زیادہ دور کی آواز نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بیرونی آلات اس کی مدد کر کے اسے بہت دور کی آوازیں سنوادیں۔ مگر یہ اس کی قوت کا کرشمہ نہ ہوگا بلکہ آلات کی قوت وطاقت کا مظاہرہ ہوگا۔ کان کی تو بہر حال درماندگی اور محتاجگی ہی ثابت ہوگی۔ مذکورہ شرطوں کے علاوہ آلات کی اس پوری امداد کے باوجود پھر بھی کان مادی ہی آوازیں سن سکتا ہے۔ روحانی یا غیبی آوازیں سن لینا پھر بھی اس کے بس کی بات نہیں اور پھر مادی آوازیں سن کر وہ سن لینے ہی کا کام کرسکتا ہے۔ آواز والے کو تمیز کے ساتھ پہچان لینا کان کی استعداد نہیں۔ یعنی شنوائی کے سوا اس میں کوئی شعور یا فہم اور تمیز نہیں۔ اس لئے کان کا ادراک بھی ان تینوں اہم اعضاء میں کوئی تام ادراک نہ نکلا کہ تنہا اسے کوئی اونچا علم کہہ دیا جائے۔

11 احساس بھی قلب ہی کی خصوصیت ہے...... بہر حال انسانی علوم میں ابتدائی علم یہی حواس خمسہ کا علم ہے جن کے ذریعہ سے قابل احساس جزئیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور کم از کم ان کے ظواہر صورت وشکل، رنگ، بو، یا عوارض وغیرہ کی جزئیات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جو عالم میں مختلف انواع میں بٹی ہوئی چہار طرف پھیلی پڑی ہیں۔ اس لئے گو یا یہ پانچوں علم بلحاظ باطن قابل ذکر نہ سہی کہ حواس خمسہ ادراک باطن اور حقیقت نمائی کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔ لیکن بلحاظ ظاہر درجہ بدرجہ ایک گونہ اہمیت رکھتے ہیں جن کا فرق مراتب کے ساتھ ذکر قرآن حکیم کی روشنی میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔

غور کیا جائے تو گو ظاہر نظر میں ان محسوسات کا ادراک اعضاء حواس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ احساسات قلب کے ہیں آنکھ، ناک، کان کے نہیں بظاہر آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن حقیقت میں آنکھ نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہی حال سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کا بھی ہے کہ بظاہر یہ احساس کان، ناک، زبان اور ہاتھ پاؤں کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سارے ادراکات قلب کے ہیں، ان اعضاء کے نہیں پس انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ٹھہر جاتا ہے۔

اور یہ تمام مختلف اعضاء ادراک اپنے اپنے ادراکات میں اس کے خدام ہیں۔ اس نے اپنے ظاہری علم کی حد تک یہ ہرکارے، اور جاسوس عالم حسیات میں اس لئے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ مختلف قسم کے محسوسات اور معلومات لا لا کر اس کے سامنے رکھتے رہیں اور وہ اس علم کی روشنی میں کائنات بدن کی تدبیر کرتا رہے۔ اس لئے ان محسوسات کا کوئی شعور خود ان اعضاء حواس کو نہیں ہوتا، آنکھ کچھ سوچ سمجھ کر نہیں دیکھتی کان کچھ غور وفکر کر کے نہیں سنتے اس کی نہ ان میں صلاحیت ہے نہ وہ اس کام کے لئے بنائے گئے ہیں۔ وہ محض دیکھ اور سن لیتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ اس

احساس کے مبادی واغراض کو سمجھنا صرف اسی صنوبری مضغہ گوشت کا کام ہے۔ جس کا نام دل ہے۔ پس احساس کی پالیسی دل بناتا ہے اور اس باشعور پالیسی کے تحت مزدوروں کی طرح احساس کا ظاہری فعل یہ اعضاء حواس انجام دیتے ہیں۔ پس احساس ظاہر نظر میں ان کا ہے اور شعور احساس دل کا ہے۔

حقیقتاً اعضاء کا احساس بھی قلب ہی کا فیض ہے......مزید غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ احساس بھی در حقیقت یہ اعضاء نہیں کرتے۔ بلکہ وہ بھی تنہا قلب ہی کرتا ہے جب کہ ان عضاء کا یہ ظاہری احساس صرف اسی کی توجہ پر موقوف ہے۔ بغیر اس کی توجہ کے یہ سب اعضاء احساس بھی معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بازار کے ہنگامے، شوروشغب، باجے گاجوں کی نوع بنوع آوازیں کان ہی میں نہیں آتیں۔ اگر دل کا دھیان ادھر نہ ہوں، خوش منظر چیزیں، بلڈنگوں کے دیدہ زیب رنگ و روغن اور ان کی فلک پیا بلندی و رفعت کچھ بھی نگاہوں میں نہیں سماتی۔ اگر دل کا دھیان دوسری طرف ہو۔ بدن پر چوٹیں آجائیں اور زخم لگ جائیں اور لمس ومس کی ساری ضربیں بدن پر پڑتی رہیں۔ لیکن اگر قلب کی توجہ ادھر نہ ہو تو ذرہ برابر ان مصائب کا اثر آدمی کو محسوس نہیں ہوسکتا۔ ہزار خوشبوئیں ہوا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ لیکن قلب اگر اپنے کسی اور غم میں منہمک ہو تو وہ ناک میں پہنچ کر بھی محسوس نہ ہوں گی۔ چہ جائیکہ کسی فرحت کا اثر پیدا کریں۔

بے تحاشا لذیذ کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں۔ لیکن قلب کسی اور فکر میں مستغرق ہو تو کسی ایک چیز کا ذائقہ بھی زبان پر نہ آئے گا۔ خواہ آدمی کا پیٹ ناک تک بھی بھر جائے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا، کان، آنکھ، ہاتھ، ناک اور زبان کا کام نہیں بلکہ دل کا کام ہے۔

اگر یہ احساسات بذاتِ خود ان اعضاء کے ہوتے تو آنکھ، ناک، کان میں آئے ہوئے محسوسات کے یہ نقشے بھی انہیں کے گوشت پوست میں سمائے ہوئے ہوتے، لیکن بجائے اس کے کہ اعضاء ان محسوسات کو اپنے اندر محفوظ رکھیں۔ یہ کام بھی قلب ہی کا ہے کہ وہی ان کی حفاظت کا خزانہ بھی ہے۔ اس لئے اگر آنکھ، ناک، کان بند بھی ہو جائیں۔ تب بھی ان محسوسات کے سارے نقشے، آوازیں اور ذائقے وغیرہ قلب ہی میں ہمہ وقت حاضر ملیں گے۔ نہ کہ ان اعضاء میں دل جب چاہے اور تصور میں لائے جب ہی فوراً بلا آنکھ، ناک، کان کے واسطہ کے ان سب کو عیاناً دیکھ اور سن سکتا ہے آنکھ، ناک، کان ہرگز ان نقشوں کو دیکھ، سن نہ سکیں گے کہ ان محسوسات کے نقشے ان میں محفوظ ہی نہیں۔

آدمی کہا کرتا ہے کہ میں نے فلاں وقت ایسا کھانا کھایا تھا کہ آج تک اس کا ذائقہ میرے منہ میں ہے۔ حالانکہ یہ مزہ اس کے منہ یا زبان میں نہیں ہے ورنہ ہر نئی کھائی ہوئی چیز کا ذائقہ اس پہلے ذائقہ سے خلط ملط ہو کر کبھی بھی خالص نہ رہتا اور کھانوں کے خالص مزے اس اختلاط سے ختم ہو جاتے، بلکہ یہ سارے مزے دل کے ظرف میں محفوظ رہتے ہیں اور دل جب بھی چاہتا ہے ان گذشتہ ذائقوں کو اپنے تصور میں لے آتا ہے اور ان کے ادراک سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو اس کی واضح دلیل ہے کہ ان اعضاء کے یہ احساسات خود اپنے نہیں بلکہ صرف

دل کے ہیں۔اس لئے محفوظ بھی دل ہی میں ہیں ان میں نہیں بنا بریں تن انسانی میں حقیقی مدرک اور عالم صرف قلب ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ اعضاء صرف آلات ہی آلات باقی رہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص آنکھ پر چشمہ لگا کر دیکھے تو کیا یہ بینائی کی عملی قوت چشمہ میں مانی جائے گی یا آنکھ میں اور یہ دیکھنا آنکھ کا کام ہوگا یا چشمہ کا؟ سب جانتے ہیں کہ یہ بینش (دیکھنا) کا عمل آنکھ کا کام ہوگا نہ کہ چشمہ کا کہ اس میں یہ قوت بینائی سرے سے ہے ہی نہیں ورنہ آنکھ سے اتار کر بھی چشمہ اشیاء کو دیکھ سکتا۔ یا مثلاً کسی شخص نے کان پر آلہ لگا کر سنا تو کیا یہ شنوائی کا عمل اس آلہ کا ہوگا؟ ہر گز نہیں بلکہ کان کا ہوگا۔ ورنہ کان سے الگ رہ کر بھی اس آلہ سے سن سکتے اور ادھر یہ صورت ہے کہ اگر آنکھ سے چشمہ اتار دیا جائے تو وہ بلا اس کے بھی دیکھ سکے گی۔ بشرطیکہ بیمار نہ ہو اور کان سے آلہ جدا کر دیا جائے۔ تب بھی کان سے سنے گا اگر مبتلائے مرض نہ ہو۔ کیونکہ قوت بینائی وشنوائی آنکھ اور کان میں ہے، آلہ میں نہیں ہے۔ٹھیک اسی طرح یہ آنکھ دل کا ایک چشمہ ہے اور کان دل کا ایک آلہ سماع ہے۔اس لئے حقیقتاً قوت بینائی وشنوائی آنکھ کان میں نہیں بلکہ قلب میں ہے۔اس لئے آنکھ تو قلب سے جدا ہو کر نہیں دیکھ سکتی۔ مگر دل آنکھ سے جدا ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ آلہ اصل کا محتاج ہوتا ہے اصل آلات کی محتاج نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ وہ اصل پر رہے اور بیمار اور ضعیف نہ ہو جائے۔ بہر حال جب کہ یہ چشم وگوش آلات دل ہیں اور دل اصل ہے تو قوت بینائی اور قوت شنوائی اسی کی ہوگی نہ کہ آنکھ کان کی۔

قلب جیسے بحالت نوم مدرک ہے ایسے ہی بعد الموت بھی رہتا ہے......یہی وجہ ہے کہ آدمی نیند میں جو موت کی چھوٹی بہن ہے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے۔ جو بیداری میں آنکھ کان سے دیکھتا سنتا ہے حالانکہ اس وقت آنکھ کان سوئے ہوئے اور معطل ہوتے ہیں جس سے صاف نمایاں ہے کہ دیدار کی قوت دل میں ہے آنکھ میں نہیں ہے۔

اس لئے اگر ہم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیں۔ بلکہ عقیدہ رکھیں کہ حقیقی موت کے بعد جب کہ آنکھ، ناک، کان کے اعضاء سرے سے باقی نہ رہیں گے پھر بھی آدمی اپنے اس لطیفہ قلب سے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ جو آنکھ کان سے دیکھتا سنتا تھا اور عالم برزخ کے وہ تمام عجائبات اس کی قوت بینائی اور قوت شنوائی پر منکشف ہوتے رہیں گے جن کو صاحب شریعت نے کھول کھول کر بیان فرما دیا ہے۔تو اس میں بھی کسی انکار واستعجاب کا موقعہ نہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ نیند ایک عارضی اور ہنگامی موت ہے جس میں روح حیات بدن سے کلیتہً جدا نہیں ہوتی۔ صرف اعضاء حواس معطل ہو جاتے ہیں مگر قلب بیدار رہتا ہے، ورنہ خواب کے عجائبات کیسے منکشف ہوتے اور موت اصلی موت ہے جس میں روح بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اعضائے بدن سرے سے ہی باقی نہیں رہتے۔ مگر قلب پھر بھی بیدار رہتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا ہے۔ جو عالم برزخ میں سامنے آئے گا۔

پس جیسے وہ خواب میں بلا آنکھ کان کے سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا۔ ایسے ہی برزخ میں بھی بلا اس ظاہری آنکھ، کان کے سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ اعضاء حواس درحقیقت خود مخزن احساس نہیں اور

نہ ہی یہ خود احساس کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ساری کارگزاریاں درحقیقت صرف قلب ہی کی ہیں۔ جو نیند اور موت میں بلا اعضائے ظاہری کے یکساں حساس رہتا ہے۔ بہرحال واضح ہوگیا کہ احساس بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعضائے حواس کا نہیں وہ اپنا احساس نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف دل کے احساس کو ظاہر بینوں کے سامنے نمایاں کر دیتے ہیں۔

محسوسات سے تاثر پذیر بھی قلب ہی ہوتا ہے اعضائے اِحساس نہیں...... اس سے بھی آگے کی ایک بات یہ بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان محسوسات سے کسی اچھی بری کیفیت کا اثر لینا اور ان کیفیات سے بلحاظ حظ و کرب شعور کے ساتھ متاثر ہونا بھی ان اعضائے حواس کا کام نہیں کہ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ تن تنہا دل ہی کا کام ہے۔ اگر کوئی دردناک بات کان میں پڑ جائے تو درد آشنا دل ہوگا نہ کہ کان اور اگر کوئی خوش منظر چیز آنکھوں میں آ جائے تو متفرح قلب ہوگا نہ کہ آنکھ جس سے واضح ہے کہ یہ اعضاء صرف ان محسوسات کے رطب و یابس کو بٹورنے کے ذمہ دار ہیں اور وہ بھی قلب ہی کی توجہ اور تصرف سے اس کی خاصیات و آثار کو سمجھنے اور ان سے اثر لینے کے ذمہ دار نہیں۔ اس لئے قلب نہ صرف ان محسوسات کا تن تنہا مدرک ہی ہے۔ بلکہ ان کے طبعی آثار و خواص اور کیفیات سے با کیف بھی وہی تن تنہا ہوتا ہے یہ اعضاء اس بارے میں کسی درجہ میں بھی اس کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لئے ان کی حیثیت آلات و وسائل احساس سے زیادہ کچھ نہیں جس سے کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ قلب دیکھنے سننے میں بھی ان اعضاء حواس کا محتاج نہیں اور کیفیات احوال کا اثر لینے میں بھی حواس کا دست نگر نہیں۔ جو اس کے حقیقی عالم و مدرک اور حقیقی با کیف اور صاحب حال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

قلب اپنی قوت تصوریہ کے ذریعہ ایک حد تک موجد محسوسات بھی ہے...... پھر یہی نہیں کہ وہ محسوسات میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جو پہلے سے موجود ہوں۔ جیسا کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ صرف انہی چیزوں کو محسوس کر سکتی ہیں جو خارج میں موجود ہوں۔ خواہ وہ صورتیں شکلیں ہوں یا آوازیں اور خوشبوئیں وغیرہ۔ لیکن قلب اپنے احساسات میں اس کا بھی محتاج نہیں کہ صرف انہی اشیاء کا ادراک کر لیا کرے جو پہلے سے موجود ہوں بلکہ وہ اپنے تصور کی طاقت سے غیر موجود اشیاء کو ذہن میں خود وجود دے کر بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ پس وہ محسوسات کا مدرک ہی نہیں بلکہ ایک حد تک موجد بھی ہے کہ جب چاہے خود ہی عالم تصور میں شہر کے شہر اور باغ کے باغ بنا لے اور پھر اپنے ہی اندر ان کی سیر بھی کرتا رہے، لطف بھی اٹھاتا رہے اور آنکھ، ناک، کان کو خبر بھی نہ ہو۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ ۔۔۔ تو زغنچہ کم نہ میدۂ دردل کشا بہ چمن درآ

اعضائے احساس کے بالمقابل قلب کی جلالتِ قدر...... پس قلب نہ صرف یہ کہ احساس میں ان اعضائے حواس کا محتاج نہیں بلکہ محسوسات کے کسی سابق وجود خارجی کا بھی محتاج نہیں۔ جس سے قلب کی علمی عظمت و جلالت اور ان اعضاء حواس کی بے مائیگی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ادراک و

احساس بھی قلب ہی کا کام ہے اور محسوسات کی ایجاد و اختراع بھی اس کا حوصلہ ہے۔

فرق اتنا ہے کہ کہیں وہ ان اعضاء ظاہری کی وساطت سے ادراک کرتا ہے اور کہیں ان کے توسط کے بغیر اور کبھی وہ خارجی موجودات کو محسوس کرتا ہے، اور کبھی اپنے اندر تصوری موجودات بنا کر انہیں محسوس کرنے لگتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کا علم تابع معلوم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں معلوم تابع علم نیز پہلی صورت میں علم انطباعی ہوتا ہے کہ باہر کی صورتیں شکلیں اس میں آکر چھپ جاتی ہیں اور وہ انہیں دیکھتا رہتا ہے، اور دوسری صورت میں علم ایجادی ہوتا ہے کہ صورتیں بھی اندر ہی بنتی ہیں اور محسوس بھی اندر ہی ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ آفاقی محسوسات ہوں یا انفسی، امام علم بہرحال قلب ہی رہتا ہے اور اسی کے احساس کے صحت وسقم پر اس کائنات بدن کا سارا صحت وسقم موقوف ہے۔ اندریں صورت اگر احساس میں غلطی ہوئی تو اس میں ان اعضاء حواس کا براہ راست قصور نہ ہوگا کہ یہ محض آلاتِ کار تھے۔ بلکہ جرم وقصور فی الاصل دل ہی کا ثابت ہوگا کہ اس احساس وادراک میں وہی اصل تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان احساسات اور حواس کے علم میں قلب ہی کو اصل قرار دیتے ہوئے ان لوگوں کو جو حق بینی سے آنکھ پھیر لیں یا حق نیوشی کی سمجھ کو غیر کام پر لگا کر کبھی بھی نصیحت وعبرت قبول نہ کریں۔ آنکھ اور عقل کا اندھا نہیں بتلایا بلکہ دل کا اندھا کہا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ ① ''کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں (کہ آنکھوں سے دیکھ کر) ان کے دل (حق کو) سمجھتے یا کانوں سے (کوئی سچی بات) سن لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل ہی اندھے ہیں''۔

بہرحال قرآن حکیم کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اعضاء احساس اپنے اپنے احساس وادراک میں اصل نہیں۔ بلکہ دل اصل ہے اور نہ ہی ان کا یہ تنہا علم کوئی مستقل اور معتد بہ علم ہے اور اگر آنکھ، کان اور دماغ کا علم کچھ معتد بہ اور کسی حد تک بنیادی اور نتائج وآثار کا حامل بھی ہے۔ تو ان میں بھی باہم فرق قوت وضعف کے ساتھ انجام کار علم صرف قلب ہی کا رہ جاتا ہے۔ جس پر کائنات انسانی کے صلاح وفلاح اور عدل کا دارومدار ہے۔ بمصداق ارشاد سید الاولین والآخرین صلوات اللہ علیہ وعلی الانبیاء جمیع اخوانہ من المرسلین۔ ''وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَۃٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ'' ② ''بدن انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور جب وہ فاسد ہوتا ہے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے''۔

حسیاتی علوم کی طرح دماغی علوم بھی حقیقتاً قلب ہی کا فیضان ہیں...... انسانی علوم کا ان پانچ ہی حواس

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرء لدینہ، ج: ۱، ص: ۹۰۔

میں انحصار نہیں۔ بلکہ ایک اہم اور دور رس قسم کا علم اور بھی ہے۔ جو بلحاظ باطن بھی ایک حد تک علم کہلائے جانے کا مستحق ہے اور رتبہ بھی ان پانچوں حسیاتی علوم سے اونچا ہے۔ یہ علم قوائے دماغ سے سرزد ہوتا ہے جہاں آنکھ، ناک، کان بے کار رہ جاتے ہیں۔ صرف دماغ اور اس کی ابتدائی قوت ہی کام کرتی ہے۔

نیز یہ علم حواس کے جزئیاتی علم سے زیادہ وسیع اور گہرا بھی ہے۔ جو اشیاء کی صورتوں شکلوں سے گزر کر ان کی کلی اور اصولی بنیادوں تک کا بھی پتہ چلا لیتا ہے اور ایک ایسی امتیازی شان لئے ہوئے ہے۔ جو اعضاء احساس میں سے کسی کو میسر نہیں کیونکہ یہ اعضائے حواس محسوسات کی صورتوں، آوازوں وغیرہ کا ادراک تو ضرور کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی شعور کے ساتھ نہیں کرتے۔ لیکن دماغ اپنے خاص قوائے ادراک کی وجہ سے اپنے احساس میں باشعور بھی ہے کہ یہ محسوسات کیا ہیں؟ اور انکے اندرون میں کیا کیا کلی نوعیتیں کھپی ہوئی ہیں۔ جس سے اس محسوس کو وجود مل رہا ہے۔ پس اس کا ادراک محسوسات کی صورتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے مفہوم و مراد اور معنوی خصوصیات تک کو بھی جوں کا توں قبول کر کے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ جس سے ذہن میں شئے محسوس کی صورت و سیرت اور ہیئت و معنویت دونوں ہی کا نقشہ پورے کا پورا اتر آتا ہے۔ جو شعور کا ابتدائی مقام ہے اور دماغ کو حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے اس شعوری جوہر کو فقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہاں فہم معنویت کے ہیں۔

تفقہ بھی درحقیقت قلب ہی کا وصف ہے..... غور کیا جائے تو حواس خمسہ کے علم کی طرح یہ فہم و بصیرت کا علم بھی درحقیقت قلب ہی سے نکلتا ہے۔ جو قلب کے سامنے بواسطہ دماغ ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کفار کے سمع و بصر وغیرہ کو جو کان، آنکھ سے ہوتا ہے۔ قرآن نے بے ثمر بتلاتے ہوئے ان کے قلوب سے فقہ و فہم کی نفی فرمائی ہے نہ کہ دماغ سے کہ جب ان میں دل کی سمجھ ہی نہیں اور وہ صرف ظاہری ہیئت یا سطحی معنویت ہی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اندر کی بات ان کے دلوں میں نہیں اترتی تو ان کا یہ دیکھنا سننا سب بیکار اور عبث ہے چنانچہ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ ① ''ان کے دل ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے''۔ یہاں منکروں کے دیکھنے سننے کی نفی سے جو اس آیت کے شروع میں کی گئی ہے۔ درحقیقت دل کے فہم و فقہ کی نفی مقصود ہے۔ جس سے واضح ہے کہ قلب کی اصلی صفت محض دیکھنا سننا نہیں، بلکہ سمجھنا ہے جس کا شرعی لقب فقہ ہے۔ جو قلب کا ایک طبعی جوہر ہے اور عام اعضاء کے طبعی وظائف کی طرح اس میں ودیعت کیا گیا ہے۔

قلب کا وصف امتیازی تعقل ہے..... لیکن اس طبعی احساس و شعور سے اوپر قلب کی ایک خاص شان اور بھی ہے۔ جس میں اور کوئی عضو اس کا کسی درجہ میں بھی سہیم و شریک نہیں اور وہ یہ کہ قلب نہ صرف محسوسات کی صورت معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کے تجزیہ بھی کرتا ہے اور بات سے بات پیدا کر کے اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے بھی اپنے اوپر کھول لیتا ہے یعنی وہ اس

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹.

ایک محسوس جزئی کی معنویت سے آگے بڑھ کراس میں سے اس کی علت نکال کرایک کلیہ بھی بنالیتا ہے، جس سے ہزاروں جزئیات کا فیصلہ اسی ایک محسوس جزئی سے کردیتا ہے۔ جو شعور وفہم سے آگے کا مقام ہے۔ قرآن حکیم نے قلب کی اس خاص صفت کا نام تعقل یا عقل ارشاد فرمایا ہے۔ جس کے معنی طبعی عقل کے نہیں بلکہ حقیقی عقل کے ہیں۔ جو اشیاء کی حقیقت تک جا پہنچتی ہے اور شئے کی جزئی صورت سے اس کی معنویت سے کلی نوعیت کا پتہ چلالیتی ہے۔ جو بلاشبہ قلب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن نے اسے بھی قلب ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا﴾ ① ''کیا سیر نہیں کی ملک کی، جوان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ ان منکروں نے زمین کی سیاحت بھی کی ہوگی اور اس کے عجائبات بھی دیکھے ہوں گے جن کی صورتیں اور معنویتیں ان کے دلوں میں اتری ہوں گی جس سے وہ بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن سمجھ کر جب انہوں نے عقل سے کام نہ لیا، نہ ان عجائبات کے منشاء اور انجام کو سوچا نہ کوئی عبرت وموعظت اس سے حاصل کی اور نہ ہی اپنے مالک حقیقی کو پہچان کراس کی طاعت وذکر کا کوئی جذبہ ان میں ابھرا۔ تو یہ سمجھنا، بوجھنا سب بے کار اور اکارت ہے۔

ادراکِ قلب کی دو نوعیتیں...... اس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے قلب کے ادراک کی دو نوعیتیں بیان فرمائیں۔ ایک قوت فقہ وفہم جو ایک انفعالی قوت ہے کہ بات کواس کی صورت ومعنویت سمیت جوں کا توں ظرف قلب میں اتار لیتی ہے اور ایک قوت عقل وکیاست کہ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں فاعلانہ تصرف کر کے انہیں آگے بڑھا دیتی ہے۔ مجمل کو مفصل، مشکل کو مفسر اور خفی کو ظاہر کر کے من بھر علم کو ہزار من کر دکھاتی ہے اور پھر اس میں سے جامع علت نکال کراس کی جزئیت کواس جامع علت سے کلیہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس سے علم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ پس قلب کی سب سے بڑی اور امتیازی قوت یہی قوت عاقلہ یا صفت عقل ہے۔ جو اپنی ابتدائی بنیاد اور وضع خلقت کے لحاظ سے تو دماغ سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے عمل میں آخری حکم اور منشاء کے لحاظ سے بالآخر قلب سے متعلق ہے۔ کیونکہ قلب ہی انجام کار تمام اعضائے بدن پر جن میں دماغ بھی شامل ہے یکہ وتنہا حکمران ہے اور اسی کے اشاروں پر دماغ سمیت اعضاء کی یہ کائنات چل رہی ہے۔

قدیم وجدید اربابِ دماغ کا منتہائے فکر...... عام طور پر ارباب دماغ یا فلاسفہ زیادہ تر عقل ہی کے بندے بنے رہے ہیں اور ان کی آخری پرواز عقل ہی کی عقیدت پر آ کر رک گئی ہے۔ چنانچہ فلاسفہ قدیم نے تو اسے خدائی کا درجہ اور تخلیق عالم تک میں اسے حصہ دار بنا دیا۔ افلاک کی تخلیق ان کے زعم میں عقلوں میں آئی جن میں سب سے بڑی تخلیق کنندہ عقل فعال ہے جسے عقل اول بھی کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ حال جن پر سائنس کا روغن بھی چڑھا ہوا ہے اسے کھلے لفظوں میں خدا تو نہیں مانتے اور اس لئے نہیں مانتے کہ ان میں سے اکثر سرے سے خدا ہی کو نہیں

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶.

مانتے۔لیکن وہ اسے مدبر کائنات پھر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عالم کے تغیرات کا تعلق زیادہ تر عقلوں ہی سے ہے۔حتیٰ کہ وہ تکوینیات سے گزر کر وحی الٰہی تک کے اوپر عقل کو حکمران بنا دینے کے منصوبے باندھے ہوئے بیٹھے ہیں،اور شرعی امور میں بھی اپنی انہی جزوی اور ناتمام عقلوں کو حکم کا درجہ دیئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہماری عقلوں کے حلق میں اتر جائے وہی قابل تسلیم ہے ورنہ نہیں۔

عقل کے بارے میں اہل دل کا نقطۂ نظر......لیکن جہاں تک ارباب قلوب کا تعلق ہے وہ ان خرافات سے الگ رہتے ہوئے اس سے بہرحال انکار نہیں کرتے کہ عقل ایک شریف ترین آلۂ شعور وادراک ضرور ہے۔جس سے بڑی بڑی پیچیدہ علمی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔اور وہ ایسے نازک نظری مقام پر کام کرتی ہے جہاں تک حواس کی رسائی نہیں۔اس لئے دین و دنیا میں اس کا استعمال ضروری ہے۔بشرطیکہ اسے اسی کی حدود میں رکھا جائے۔ شریعت نے بھی عقل کی فضیلت اور برتری کو ترقی دنیا و آخرت کے لئے تسلیم کیا ہے۔جس سے کتاب وسنت کی نصوص اور حکمائے اسلام کے حکیمانہ مقالات بھرے ہوئے ہیں۔

عقل کے حقیقی مرتبہ ومقام کی تعیین......لیکن جہاں تک اس کی کارگزاری کی نوعیت کا تعلق ہے۔اس کے لحاظ سے وہ کسی مستقل حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔حتیٰ کہ وہ اپنے ادراک وشعور میں بھی مستقل نہیں ہے جب تک کہ علم اس کی مدد نہ کرے۔بغیر علم کے وہ اپنے ادراک وشعور کا بھی وظیفہ ادا نہیں کرسکتی۔اس لئے نہ وہ مستقل بالادراک ہے نہ مستقل بالحجیت حتیٰ کہ ایک حد تک حواس خمسہ کے احساسات سے بھی اس کے ادراک وشعور کی نوعیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ حواس خمسہ تو اپنے ادراک میں اشیاء کے موجود ہونے ہی کی محتاج تھے۔جہاں کوئی شئے موجود ہوئی اور اس کے مناسب حال کسی حاسہ کی گرفت میں آ گئی۔تو وہ فوراً ہی محسوس ہو جاتی تھی۔نگاہ کی بن آئی تو اس کی صورت محسوس ہوگئی،کانوں کی بن آئی تو اس کی آوازیں محسوس ہوگئیں اور ناک کی چلی گئی تو اس کی خوشبو،بدبو کا احساس ہوگیا۔

بہرحال حواس کو ادراک کرنے میں صرف اشیاء کے وجود اور موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ معدوم اشیاء میں ان کا احساس کام نہیں کرسکتا۔لیکن عقل کے ادراک کے لئے کسی چیز کا محض موجود ہو جانا کافی نہیں۔جب تک کہ حواس وغیرہ کے ذریعہ اس موجود کا علم بھی ذہن میں نہ آ جائے۔کیونکہ عقل معلومات اور محسوسات ہی میں اپنے تصرفات دکھلاسکتی ہے۔مجہولات میں نہیں حتیٰ کہ اگر وہ کسی مجہول چیز کو بھی حاصل کرنا چاہے تو معلومات ہی سے حاصل کرسکتی ہے نہ کہ مجہولات سے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا کام فکر ونظر ہے۔جو ایک ذہنی کام ہے اور ذہن کے اندر ہی کیا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن کے چھوٹے سے ظرف میں کائنات کے بھاری بھاری اجسام اپنے مادی طول وعرض کے ساتھ نہیں سماسکتے۔بلکہ ان اجسام کی صرف علمی صورتیں ہی ذہن میں آسکتی ہیں۔جو مادی طول وعرض سے خالی ہوں۔تب

ہی فکری حرکت ان میں کام کرسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن میں ان آئی ہوئی ذہنی صورتوں ہی کا نام علم ہے۔ جو حواس کے ذریعہ آ کر ذہن میں منتقش ہوجاتی ہیں۔ اشیاء کی ان صورتوں کو ذہن میں لے آنے ہی کا نام احساس و ادراک ہے۔ عقل ان ہی محسوسات یا معلومات کے علمی نقشوں میں ترتیب نظر وفکر اور تصرفات کر کے ان سے بطور نتائج کچھ جدید معلومات پیدا کر لیتی ہے۔ خواہ اس طرح کہ ان جزوی صورتوں کے استقراء وتتبع سے کوئی کلیہ بنالے اور اس سے جدید جزئیات پیدا کرلے، یا کسی جامع علت کی بناء پر ایک جزئی پر دوسری جزئی کو قیاس کر کے ایک کا حکم دوسری جزئیات تک پہنچادے، اور اس طرح کئی اور جزئیات پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کردیں یا اس جزئی میں سے علمی نکات ولطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کا اضافہ کردے۔ مگر عقل کے یہ سب علمی اور نظری کام ذہن ہی میں ہوتے ہیں جس میں اجسام خود نہیں اتر سکتے۔ بلکہ ان کی علمی صورتیں اترتی ہیں اور انہی میں حرکت فکری اندرون ذہن کام کرتی ہے جس سے نئی معلومات پیدا ہوتی ہیں۔

عقل نہ مستقل بالِا دراک ہے اور نہ مستقل بالحجیت ...... جس سے واضح ہے کہ عقل موجودات اجسام میں اس وقت تک کام نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ وہ علمی صورتیں اختیار کر کے ذہن کے خزانے میں نہ پہنچ جائے اور ان صورتوں کا علمی انداز سے ذہن میں پہنچانا حواسِ خمسہ کا کام ہے۔ اس لئے عقل اپنے ادراک وعمل میں حواسِ خمسہ کی محتاج نکلی، بخلاف حواسِ خمسہ کے کہ وہ اپنے ادراک میں عقل کے محتاج نہیں، جانور بھی صورتوں، شکلوں اور آوازوں وغیرہ کا ادراک کر لیتے ہیں حالانکہ ان میں عقل نہیں۔

نیز انسان بھی جب صورتوں، آوازوں وغیرہ کا آنکھ، کان سے ادراک واحساس کرتا ہے تو کسی عقلی استدلال یا ترتیب مقدمات سے نہیں کرتا۔ بلکہ بلاشعور بھی اگر آنکھ کسی صورت پر پڑ جاتی ہے تو وہ بلاسوچے سمجھے اسے فوراً ہی محسوس کر لیتی ہے اسے کسی عقلی دلیل کی اس احساس میں حاجت نہیں پڑتی۔

پس عقل کا علم کتنا بھی بڑا اور شریف ہو۔ مگر موقوف ہے حواس اور ان کے محسوسات پر اور حواس کی علم کتنا بھی عقلی علم سے کم مرتبہ ہو۔ مگر وہ عقل اور عقلی استدلال پر موقوف نہیں اور نہ اس کا محتاج اس لئے عقل ہی اپنے کام میں حواس کا محتاج نکلتی ہے۔ حواس اپنے کام میں عقل کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عقل اپنے کام میں علم کی محتاج ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عقل مستقل بالادراک نہیں کہ بلاعلم کے خود سے اپنا کام کرجائے۔ بلکہ اس میں دو محتاجگیاں ثابت ہوئیں۔ ایک اشیاء کی خارج میں موجودگی کی کہ معدومات میں عقل بیکار ہے اور ایک ذہن میں ان کے معلوم ہونے کی کہ مجہولات میں بھی وہ بے کار ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ خود تنہا عقل جیسے بالادراک نہیں۔ ایسے ہی مستقل بالحجیۃ بھی نہیں۔ اس لئے حواس کا علم بہ نسبت عقل کے علم کے زیادہ آزاد اور بے قید ثابت ہوا، اور عقل کا علم بہ نسبت حواس کے علم کے تنگ ثابت ہوا کہ حواس کے بغیر عقل کو اپنے کام کا میدان ہی نہیں ملتا۔

اس لئے اس سابقہ اصول کے تحت کہ جس کے علم وادراک میں قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوں گی۔ اس کے علم

کا دائرہ تنگ ہوگا۔ عقل کا علمی دائرہ کچھ زیادہ وسیع ثابت نہ ہوا۔ اس لئے عام تمدنی اموراور بالخصوص دینیات میں عقل کو امام مطلق ماننے والے کافی کمزور بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جو قطعاً پائیدار نہیں۔

پھر اس عقل کی بدولت فلاسفہ کی جہاں تک رسائی بھی ہوئی۔ تو وہ صرف محسوسات ہی محسوسات ہیں جو حواسِ خمسہ ہی کے ادراک کا دائرہ ہے اور انتہائی طور پر محدود ہے۔ باقی بڑے بڑے جہان سب آگے رہ جاتے ہیں جہاں عقل کے پر بھی نہیں جم سکتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

عقل خدائی صفت نہیں ہے...... دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ عقل کچھ ہو بہر حال وہ کوئی خدائی صفت نہیں بلکہ انسان کی اندرون ایک طبعی خلقت ہے۔ جو خدائے برتر کی تخلیق سے اس میں ولادت کے وقت پیدا ہوتی ہے اور موت کی وقت موت کے نذر ہو جاتی ہے چنانچہ اس کی مخلوقیت کا دعویٰ شریعت میں صریح موجود ہے۔ ارشادِ نبوی ہے "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ. " "پہلی چیز جو (انسان کی خلقی قوتوں میں) اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ عقل مخلوق اور جب مخلوق ہے تو محدود بھی ہے۔ کیونکہ مخلوق ہونا ہی حد بندی ہے کہ نیز یہ کہ وہ عارضی ہے۔ کیونکہ مخلوق کہتے ہیں اس کو ہی جس کا وجود اپنا نہ ہو، عارضی ہو اور ساتھ ہی یہ کہ وہ ضعیف بھی ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق اپنے خالق کے سامنے ضعیف اور ناتواں ہی ہے۔ اس لئے اس کا علم کس طرح ایسا قوی ہوسکتا ہے جیسا اسے فلاسفہ نے قوی کہا ہے۔ اس لئے اس کے کلیات سے ثابت شدہ بات ظنی ہوتی ہے نہ کہ قطعی جو موجب تعیین ہو اور جب حسیات میں اس کا یہ حال ہے تو اسے دینیات میں کیسے مدار کار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ جس کی بنیاد یقین پر ہے۔

علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صفت ہے...... ادھر علم کو دیکھا جائے تو وہ انسان کی صفت نہیں اور نہ ہی اس کی ذات میں موجود ہے۔ انسان میں اگر پیدائشی طور پر کچھ ہے تو وہ علم کی استعداد ہے علم نہیں۔ اسی لئے جب وہ دنیا میں آتا ہے، تو علم سے کورا آتا ہے۔ جیسا قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ ،بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ "اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کسی چیز کا بھی علم نہیں رکھتے تھے"۔

اور جب دنیا سے جاتا ہے تو علم سے پھر کورا ہو کر ہی چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ "پھر (بوقت موت انسان) لوٹا دیا جاتا ہے ارذلِ عمر کی طرف کہ جاننے کے بعد انجام یہ ہو جاتا ہے (کہ کسی شئے کا بھی اسے علم نہیں رہتا)"۔

پس علم کا انسان کے اول و آخر نہ ہونا اور درمیان میں آمد وشد کے درمیان ہونا کہ آیا چلا گیا۔ اس کی واضح دلیل ہے کہ علم انسان کی کوئی ذاتی صفت نہیں۔ جس طرح کہ عقل ذاتی خلقت تھی بلکہ علم خدا کی ذاتی صفت ہے۔ جس کا پرتو عارضی اور وقتی طور پر انسان پر پڑ جاتا ہے اور وہ عالم کہلانے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے حق تعالیٰ ہی کو ذاتی طور پر عالم کہا ہے۔ جس کا علم اَزلی، اَبدی اور لم یزل و لایزال ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ "اور

وہ علیم خبیر ہے"۔اور فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ "اور وہی ہے سینوں (کی چھپی ہوئی کو) جاننے والا"۔اور فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ﴾ "اور وہی جانتا ہے (ان کے) سامنے اور پیچھے کی باتیں اور لوگ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے"۔اور فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ "اور کیا وہ نہ جانے گا اسے جسے اس نے پیدا کیا۔جب کہ لطیف وخبیر وہی ہے، وغیرہ وغیرہ"۔

مخلوق (عقلِ انسانی) غیر مخلوق (علم الٰہی) پر حاکم نہیں ہو سکتی......پس عقل کا مخلوق ہو کر انسان کی صفت ہونا اور علم کا غیر مخلوق ہو کر خدا کی صفت ہونا۔اس کے سوا اور کسی چیز کا مقتضی ہے کہ انسان میں علم خدا ہی کی طرف سے آ سکتا ہے خود سے نہیں ہو سکتا۔اس کا قدرتی ثمرہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ جب خالق کی طرف سے کوئی علم آ جائے تو پھر عقل کے لئے چوں وچرا کی گنجائش نہ ہو۔چہ جائیکہ اسے علمِ الٰہی کے سامنے ایک متوازی حاکم کی حیثیت سے لاکر کھڑا کر دیا جائے یا علم پر عقل کو حکمران تسلیم کر لیا جائے۔ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خالق پر مخلوق حاکم ہو جائے یا غنی پر محتاج حکم چلائے اور طاقتور پر ضعیف وناتواں کا اقتدار قائم ہو جائے جو بداہتہ خلاف عقل ہی نہیں حماقت وجہالت بھی ہے جسے کم سے کم یہ عارف امت تو نہیں برداشت کر سکتی۔جو علم الٰہی پر ایمان لائی ہوئی ہے کوئی جاہل یا بے قید امت مانے تو مانے۔بنا بریں عقل کا کام اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ علم الٰہی اور کلام ربانی آ جانے کے بعد اسے سمجھ لے مان لے اور مان کر اسے اس کے دائرہ میں محدود رکھ کر اس میں غور وتدبر کر لے اور استنباط واجتہاد کے ذریعہ اس کے چھپے ہوئے علمی خزانوں کو واشگاف کر دے اور ساتھ مخلوق کو خالق حکمران بنانے والوں کا انجام بد دیکھ کر عبرت وموعظت حاصل کرے۔

عقل کا سرچشمہ قلب ہی ہے......اور جب یہ عقل بنصِ قرآنی قلب ہی کا ایک آلہ ادراک ہے۔جیسے حواس خمسہ بھی اس کے آلات ادراک تھے۔تو ظاہر ہے کہ حقائق میں یہ عقلی تدبر اور اجتہاد واستنباط بھی قلب سلیم ہی کا کام نکلتا ہے۔جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ عقل کا سرچشمہ بھی آخر کار قلب ہی ہے۔جیسا کہ حس کا سرچشمہ بھی قلب ہی تھا پس جیسے حسیاتی علوم قلب کے تھے۔ایسے ہی عقلیاتی علوم بھی قلب ہی کے علوم ثابت ہوئے۔گو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حس اور عقل کی قوتیں دماغ میں ہیں، قلب میں نہیں جیسا کہ ظاہری طور پر ایسا ہی محسوس بھی ہوتا ہے بلکہ انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ یہی یقین رکھتا ہے کہ عقلی اور حواسی قوتوں کا مرکز دماغ ہے۔لیکن یہ ان قرآنی دعوؤں کے منافی نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ حسی اور عقلی قوتیں دماغ میں ہوں اور دماغ کی باگ ڈور دل کے ہاتھوں میں ہو۔جو قلب کے اشاروں پر چلتا ہو۔اس لئے ان قویٰ کو دماغی مان کر بھی انہیں قلب کی حکومت کے نیچے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔جب کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عقلی قوتیں بھی جب ہی کچھ سوچ سکتی ہیں۔جب دل ٹھکانے ہو اگر قلب میں تشویش اور اضطراب وبے چینی ہو یا وہ کسی دوسرے مشغلہ میں منہمک ہو تو عقل سوچنے پر بھی قادر نہیں ہوتی۔چہ جائیکہ کچھ

نتائج برآمد کر سکے۔ اس سے واضح ہے کہ دماغ اور اس کی عقل دل کے تابع ہے دل جمعی کے ساتھ دل کا اشارہ ہوتا ہے تو عقل اور دماغ بتعمیل قلب سوچ بچار میں لگ جاتے ہیں۔ ورنہ معطل رہ جاتے ہیں۔

حقائق اشیاء تک عقل کی بھی رسائی نہیں ہے......اس بحث سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عقلی علوم بھی کلیتہً باطن شئے اور حقیقت اشیاء تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ عقل کا ادراک حواس اور محسوسات کے تابع ہے اور محسوسات اپنی ذات سے ظاہری چیزیں ہیں۔ جن کا یہ ظاہر ہی حواس سے علم میں آتا ہے۔ حقیقت نہیں کھلتی تو عقل بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ گو اس کے علوم کلیاتی ہونے کی وجہ سے ایک حد تک باطنی ہوں۔ مگر اپنے منشاء کے لحاظ سے وہ بھی ظاہری ہی کہلائیں گے جنہیں حقیقتہ الامر سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسی لئے فلاسفہ روزگار عقل کو امام مطلق ماننے کے باوجود آج تک کسی ایک چیز کی بھی حقیقت نہیں بتلا سکے۔ بقول لسان العصر اکبر مرحوم کے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ۔۔۔ ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پس قلب کے یہ تمام علوم جو حواسِ خمسہ یا عقل کے واسطے سے اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ اس لئے ان عقلی علوم کو بھی تمام علم اور کامل علم نہیں کہا جائے گا جس کی حقیقت تمیز بین الاشیاء ہیں۔

پس قلب ان آلات حس و عقل سے جو کچھ بھی دیکھتا سنتا ہے۔ وہ اسی ظاہری عالم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس جہان سے متعلق اس کی یہ معلومات بھی ظاہری ہی کہلائیں گی۔ خواہ وہ حسی ہوں یا عقلی جن کا حقائق اصلیہ سے تعلق نہ ہوگا۔ پس قلب کا یہ بالواسطہ علم خواہ حسی یا عقلی، علم ظاہر کے سوا کچھ نہیں۔ محسوسات کا ظاہری ہونا تو کھلا مشاہدہ ہے اور معقولات کا ظاہر ہونا اس سے نمایاں ہے کہ عقل کی دوڑ دھوپ کا دائرہ یہی حسیات ہیں۔ اس لئے اس کے معقولات کو بھی ظواہر ہی کا علم کہا جائے گا نہ کہ علم باطن، اس لئے وہ تمام علم یا مطلقاً علم نافع نہ ہوگا کہ اسے دارین کے بنیادی نتائج و آثار کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے کہ اس سے ساری غیبی حقیقتیں کھل جائیں اس لئے جیسے اعضاء حواس کو حقیقی معنی میں عالم مدرک نہیں کہا جائے گا۔ ایسے ہی اعضاء دماغ اور اس میں بھری ہوئی عقل محض کو بھی حقیقی مدرک نہیں مانا جائے گا جبکہ وہ بغیر اس ظاہری علم کی مدد کے اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔

[12] **حقیقی علم وادراک صرف قلب کی خصوصیت ہے**......اس لئے اب آخری علم وہ رہ جاتا ہے جو براہ راست اور بلا واسطہ قلب ہی سے متعلق ہو۔ جس میں کسی بھی کھلے یا چھپے عضو کا واسطہ نہ ہو۔ بلکہ قلب ہی اپنے اندرونی قوت سے اس کا ادراک کرتا ہو اور ایک ایسے چھپے ہوئے جہان کی چیزوں کا ادراک کرتا ہو کہ وہ حواس اور عقل کی گرفت سے باہر ہو تو قدرۃً وہاں حس و عقل کام ہی نہیں دے سکتیں۔

سو اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واضح ہوگا۔ قلب کا واسطہ اسباب علم، ان تمام ادراکات حواس و عقل سے بدرجہا بالاتر اور گہرا علم ہے۔ جس کی کرشمہ سازیاں اور شعور و ادراک کی رعنائیاں محیّر العقول ہیں۔ نہ اس کے علم و ادراک میں وہ قیدیں اور شرطیں ہیں۔ جو ان اعضاء حواس اور اعضاء دماغ کے علوم میں تھیں اور نہ ہی وہ اپنے

افادہ واستفادہ میں وہ محتاجگی اور پابستگی لئے ہوئے ہے۔ سو اسی مذکورہ اصول کو سامنے رکھ کر کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود وشروط زیادہ نہ ہوں گی۔ اسی حد تک اس کا علم وسیع، ہمہ گیر اور کمال تمیز کا حامل ہوگا۔

اگر ہم غور کریں تو واضح ہوگا کہ قلب کا علم ان تمام رسمی قیود سے آزاد ہے۔ جو بدن کے دوسرے اعضاء پر عائد تھی۔ قلب کے علم میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، نہ جسم کی شرط ہے نہ روح کی، نہ حسیات کی پابندی ہے نہ معنویات کی، نہ قرب کی حد بندی ہے نہ بعد کی، نہ تقابل کی ہے نہ جہات اور سمتوں کی، نہ اتصال کی ہے نہ انفصال کی۔ بلکہ اس کے علم کے سوتے شش جہات میں بہتے ہیں اور وہ اگر کسی چیز کے ادراک کرنے پر آ جائے تو اس کی صورت سے لے کر مادہ تک اور مادہ سے لے کر حقیقت تک اور حقیقت سے لے کر اس کی وجودی نسبت تک ہر ہر چیز کی حقیقت کھول کر دیتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ہے۔

وہ محسوسات کا ادراک تو بواسطہ حواس کرتا ہے اور معقولات کا ادراک بواسطہ عقل اور وجدانیات کا ادراک بتوسّطِ وحی خداوندی۔ البتہ محسوس ومعقول میں حس اور عقل کے واسطہ بن جانے کے سبب یہ محسوسات اور معقولات حواس اور عقل کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ وہ قلب ہی کے ادراکات ہیں اور وہی صحیح معنی میں قوت حاسہ اور قوت عاقلہ ہے۔

بہر حال یہ سب دلائل اسی کے ہیں۔ جیسے محسوسات کا علم حقیقتاً حواس کا علم نہ تھا، بلکہ دل کا تھا۔ اسی طرح معقولات کا علم بھی دماغ یا عقل کا نہیں، بلکہ دل ہی کا ہے۔ وہ ان کے واسطوں سے اس سطحی اور ظاہری جہان کو دیکھتا ہے۔ اس میں جزئی اور اصولی طور پر غور کرتا ہے اور اقلیم بدن کی تدبیر کرتا ہے۔ جس سے یہ جسمانی زندگی استوار ہو جاتی ہے اور اس کے تمام وسائل بواسطہ حواس وعقل دور بین مہیا کر کے تمدن کی بنیادیں ہموار کر لیتے ہیں، تاکہ نفس انسانی دینوی زندگی براحت بسر کر سکے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کا منتہا خوبصورت سامان ہیں خوش سیرت انسان نہیں...... لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان ظاہری علوم سے خواہ وہ حواسِ خمسہ کے ہوں یا عقل کے ظاہر آرائی ہی قوت مل سکتی ہے۔ صورت صورت ہی کو جنم دے سکتی ہے نہ کہ حقیقت کو۔ مادہ مادیات ہی کو نمایاں کر سکتا ہے نہ کہ روحانیات کو اور معقول معقول ہی کو سامنے لا سکتا ہے نہ کہ وجدان اور ضمیر کو۔ اس لئے تجربات ومشاہدات اور اصول کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ حواس خمسہ کی صورت آرائیوں کا یہ علم جو سائنس کے مرکب پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دماغی عقلیات کا یہ علم جو فلسفہ کے کاندھوں پر چڑھ کر آتا ہے۔ بلاشبہ اچھے اچھے خوب صورت سامان تو پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اچھے اور خوش سیرت انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ حسیاتی علم وضع ہی کیا گیا ہے، صورت آرائی کے لئے نہ کہ حقیقت نمائی کے لئے، اس سے حقیقت نمائی یا سیرت سازی کی توقع باندھنا خلاف موضوع ہے۔ نیز ایسے ہی یہ عقلیاتی علم بنایا گیا ہے تمدنی نظریات قائم کرنے کے لئے نہ کہ حقائق غیبیہ اور یقینیات کو ضمیر میں جمانے کے لئے پس اس سے غیبی اور بنیادی

حقیقتیں کھول دینے کی توقع باندھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے چیونٹی سے پہاڑ اٹھا لینے کی امید رکھنا۔

ان ظاہری علوم سے جب ہروقت اجسام اور ان کی نت نئی صورتیں اور ان ہی کے عوارض رنگ و بو اور جسمانی لذات سامنے آتی رہیں گی۔ تو دل میں رنگینیوں ہی کے جذبات بھی قائم ہوں گے۔ صورتوں کی رنگینی، گوش نواز نغموں کی افراط، رنگ روپ کے چمکدار نمائشی سامان اور اسباب تعیش و آسائش ہی کے جذبات دلوں میں سماسکیں گے، نہ کہ سادگی و بے تکلفی اور قناعت و کفایت کے اخلاق و دواعی ابھریں گے۔

ادھر بھی حواس خمسہ کی ظاہر نمائی کا یہ علم جب دماغ کی ناتربیت یافتہ عقل کی سان پر چڑھتا ہے اور عقل انہی حسیاتی چیزوں کو استدلالی رنگ دینے پر اتر آتی ہے، تو طرح طرح کے طبعیاتی فلسفے نظریاتی ازم اور نمائشی فارمولے کیمونزم، کیپٹل ازم، سوشل ازم وغیرہ وغیرہ دنیا کے دماغوں پر چھاتے ہیں۔ جس سے نمائشی تمدن نظری طور پر ایک معقول انداز کا فلسفہ نظر آنے لگتا ہے۔ خواہ اس کی حقیقت میں معقولیت کا نشان تک نہ ہو۔ جس سے اس مادی قسم کی معاشرت کو علمی رنگ کی تقویت بھی مل جاتی ہے۔ کیونکہ ان مادیاتی سامانوں کو اگر ایک غیر فلسفی محض اپنی صنعتی مہارت سے بناتا رہے۔ تو وہ زیادہ سے زیادہ صناع اور سامان سازی کا ایک کاریگر کہلا سکے گا۔

لیکن انہی چیزوں کو جب فلسفیانہ نظریات کی آب دے کر کوئی بنانے والا بنائے گا۔ تو اسے ڈاکٹر کا لقب ملے گا اور اب وہ مزدوروں یا صنعت کاروں کی لائن سے اوپر ہو کر فلسفیوں کی موقر لائن میں آ جائے گا۔ جس کی بدولت بظاہر دلائل کی قوت سے ایک ایسی ظاہرداری کا روکھا تمدن اور نمائشی معاشرہ دنیا میں ابھرے گا۔ جس میں تصنع، بناوٹ، نمائش اور گندم نمائی، جو فروشی کے جذبات کام کریں گے۔ جس سے مرنا، جینا اور رہنا، سہنا حتی کہ سامان خورد و نوش اور ضروریات لباس و پوشاک تک سب بناوٹی بن جائے گا اور ان ظاہری علوم سے ساری زندگی ہی ظاہرداری کی ہو کر رہ جائے گی۔ جس میں حقیقی اخلاق، فاضلانہ ملکات، صدق و اخلاص، انسانی اخوت، باہمی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے جذبات و عزائم ابھر ہی نہ سکیں گے، جس سے تمدن میں خلوص اور محبانہ تعاون و تناصر پیدا ہو جو تمدن کی حقیقت ہے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کے طبعی نتائج بد...... اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ان حسیاتی اور عقلیاتی فنون کی بنائی ہوئی صورتیں حقیقتوں اور معنوی قدروں سے خالی ہوں گی۔ جن کے لئے یہ فنون وضع ہی نہیں کئے گئے۔ تو وہ بے جان لاشوں کی مانند ہوں گی اور سب جانتے ہیں کہ بے جان لاشہ کا انجام گلنے، سڑنے، پھولنے، پھٹنے اور عفونت پھیلانے کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ جس سے دنیا کا دماغ پراگندہ ہو کر ہزاروں ظاہری اور باطنی مہلک بیماریاں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جس میں سب کچھ ہوگا۔ مگر سکون و اطمینان ہی نہ ہوگا۔

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج کی دنیا کے خوش منظر اور نظر فریب سامانوں اور ان کی نئے نئے ڈیزائنوں سے اسباب راحت کی بہتات ہے۔ لیکن راحت مفقود ہے۔ اسباب عیش کی کمی نہیں۔ لیکن عیش عنقا ہے، امن وسکون

کے نام پر ہزاروں خوشنما سامان نئے نئے اسباب معیشت، نئے نئے ڈیزائنوں اور نئے نئے روپوں میں مہیا ہیں۔ لیکن امن وسکون ہی ندارد ہے۔ بلکہ عیش کی جگہ تنگ حالی، امن کی جگہ مار دھاڑ، اور چین واطمینان کی جگہ ہمہ وقتی تشویش اور بے چینیوں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ قلبی راحت وطمانیت اور ضمیر و وجدان کے سکون کا تعلق اخلاقی بلندیوں اور سچے کردار سے ہے۔ نہ کہ صورتوں کی چمک دمک اور سامانوں کی کثرت سے۔

اسی لئے آج کا انسان صورتاً تو یقیناً انسان ہے اور بہت چمکیلا انسان لیکن سیرت وکردار کے لحاظ سے سانپ، بچھو اور گیدڑ، بھیڑیے سے کم نہیں بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ''سَيَخْرُجُ اَقْوَامٌ حُدَثَاءَ الْاَسْنَانِ سُفَهَاءَ الْاَحْلَامِ يَقُوْلُوْنَ بِقَوْلِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَايُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ الذِّئَابُ...... '' ''عنقریب کچھ قومیں ابھریں گی نوخیز، بدعقل، باتیں بڑی اصول رنگ کی بگھاریں گے، قرآن کا نام بھی زبانوں پر ہوگا۔ لیکن وہ ہنسلیوں سے نیچے اترا ہوا نہ ہوگا۔ ان کی زبانیں تو عربوں جیسی فصیح وشائستہ ہوں گی۔ لیکن دل ان کے بھیڑیوں کے سے ہوں گے''۔

اور جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد میں اعلیٰ لباسوں میں سجے ہوئے انسانوں کی بابت بڑی حسرت سے فرمایا تھا کہ ''كَانَ النَّاسُ وَرَقًا لَاشَوْكَ فِيْهِ فَصَارُوْا شَوْكًا لَاوَرَقَ فِيْهِ.'' ''لوگ ہرے بھرے پتے تھے جن میں کانٹے کا نشان نہ تھا۔ لیکن ہوگئے ایسے کانٹے، جن میں پتے کا نشان نہیں''۔

چنانچہ آج نہ اس صورت پسند انسان سے انسان کو چین ملتا ہے، نہ غیر انسان کو، انسان ہی نہیں کائنات کی کسی بھی چیز کو امن میسر نہیں۔ عباد اور بلاد دونوں تباہ حال ہیں، ملک ملکوں کے لئے، شہر شہروں کے لئے، دریا دریاؤں کے لئے اور فضاء وخلاء ساری فضاؤں کے لئے آفات ومصائب کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی تصویر قرآن حکیم نے اس طرح کھینچ دی ہے کہ: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تا کہ وہ باز آ جاویں''۔ اس سارے مہمل کہ کی بنیاد ان حیاتی اور مادیاتی علم کی بنائی ہوئی تمدنی صورتوں کا اخلاقی قدروں سے خالی ہونا اور ان کے صناعوں اور اس نمائش کے علمبرداروں کا مصدر اخلاق ومصدر کمالات حضرت حق جل مجدہ کے تعلق اور اس کی یاد سے یکسر غافل ہو جانا ہے۔

جو اخلاقی قدروں کی جڑ بنیاد ہے قرآن حکیم نے انہی دعویداران علم اور ان کی فلسفیانہ مبلغ علم کی قلعی ان الفاظ میں کھول دی ہے ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاo ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى﴾ ''سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا۔ بس یہیں تک پہنچی ان کی سمجھ۔ تحقیق تیرا رب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے اور وہ خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا''۔

نیز اس لئے قرآن حکیم نے اس صورت سازی اور صورت بازی کے علم کو ظاہری علم فرما کر اشارہ فرما دیا ہے۔ کہ اس ظاہری علم میں کوئی باطنی حقیقت نہیں۔ جو اس علم کو جاندار بناتی، اس لئے یہ رسمی اور نمائشی علم خواہ سائنس کا ہو یا ریاضی کا، مساحت کا ہو یا فلسفہ کا، جب بھی اخلاقی قدروں سے خالی ہوگا۔ تو وہ انجام میں غفلتوں ہی کا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ''جانتے ہیں اوپرا دپر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے''۔

قلبی ادراک کے دو علمی رخ...... پس اس اصول پر کہ صورت بغیر حقیقت کے لاشہ اور گندگی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس قلب انسانی کو جہاں یہ علمی رخ عطا فرمایا کہ وہ اس ظاہری علم سے جو حواس و عقل کے راستہ سے اس میں نمایاں ہوتا ہے اور اس سے مادی زندگی کی دل فریب نقشے اور رنگین تمدن کی رنگین صورتیں اور ڈیزائین بنتے ہیں۔ جس میں آنکھ کے لئے دیدہ زیب مناظر، کانوں کے لئے سمع نواز آوازیں، ناک کے لئے پاکیزہ خوشبوئیں، زبان کے لئے خوش ذائقہ غذائیں، ہاتھ پاؤں کے لئے نرم و گداز بدن، چھونے اور پکڑنے کے لئے خوش گوار چیزیں، تن خاکی کے لئے راحت دہ بلڈنگیں ہوں۔ تاکہ نفسِ انسانی کے لئے ان معلومات اور ان محسوسات سے تسکین نفس اور لذت بدن کا سامان میسر آ جائے۔ وہیں اس انسانی قلب کو حق تعالیٰ نے ایک دوسرا علمی، رخ بھی بخشا ہے۔ جس کی بدولت قلب کے لئے بلا واسطہ حواس و عقل دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور سمجھنے کے کچھ معنوی سامان مہیا ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس مجموعہ عجائبات (قلب انسانی) میں ایک دریچہ اگر اس کی سمت اسفل میں کھولا تھا۔ جس سے وہ بتوسّط حواس و عقل اسی حسّی اور نمائشی جہان کو دیکھتا تھا تاکہ اس کائنات بدن کے لیے اپنے اسی ظاہری علم سے بدنی اور جسمانی سامان فراہم کرے۔ تو دوسرا دریچہ اس کی سمت بالا میں کھولا ہے۔ جس سے وہ اس غیبی جہان کو دیکھتا ہے۔ جہاں معارف الٰہیہ، اخلاق ربانی، لذات روحانی اور مقامات باطن مثل محبت والفت، انس و موانست، ہمدردی و خدا ترسی، اطاعت الٰہی اور بندگی حق کے ذخیرے جمع ہیں۔ تاکہ قلب اپنے اس باطن علم سے بلاتوسط حواس و عقل بالہام ربانی اپنی اخلاقی قدریں درست کرے۔ جس سے دنیا میں امن سکون کی فضا ہموار ہو اور یہ کائنات اطمینان و چین کی زندگی بسر کر سکے۔

قلبؔ کی مادی اور روحانی ادراکات میں مشابہت...... پس یہاں اگر علم ظاہر کا واسطہ حواس، اور عقل ہیں۔ جن کے راستہ سے یہ حسی علم قلب میں آتا ہے اور اس سے وہ کائنات بدنی کی تدبیر کرتا ہے تو وہاں اس علم باطنی کا واسطہ وحی والہام ربانی ہے۔ جس کے ذریعہ یہ الہیاتی علوم قلب کے وجدان پر مترشح ہوتے ہیں۔ جن سے یہ قلب اپنی کائنات روحانی کی تدبیر کرتا ہے۔ یہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا چہرے کی آنکھ، کان، ناک سے ہوتا ہے اور وہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا دل کی اندرونی آنکھ، ناک و کان سے ہوتا ہے۔ یہاں سونگھنے سے چکھنے سے تن و جان کو قوت ملتی ہے اور وہاں کے مشاہدہ و سماع سے روح و رواں اور معرفت وایمان کو قوت میسر آتی ہے

یہاں صورتوں کی نمائش ہوتی ہے اور وہاں سیرتوں کی آرائش۔

اگر بدنی زبان کھانے کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی مادی غذا ہے تو یہاں دل و جان کی زبان معرفت و ایمان کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی معنوی غذا ہے۔ ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا'' ''ایمان کا مزہ چکھ لیا اور اس شخص نے جو اللہ سے راضی ہو گیا بلحاظ اس کے رب ہونے کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو گیا بحیثیت رسول ہونے کے اور اسلام سے راضی ہو گیا بلحاظ دین ہونے کے''۔

اگر یہ مادی زبان حلوہ سے مٹھاس کا مزہ چکھ لیتی ہے تو دل کا وجدان ایمان و عرفان کی مٹھاس محسوس کرتا ہے ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلًا لِّرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.'' ''جس کو ایمانی مٹھاس سے لطف اندوزی کا شوق ہوا سے چاہئے کہ اپنے رب کے سامنے اپنی ذلت کے اظہار کے لئے موٹا معمولی لباس پہنے''۔ اگر جسمانی معدہ لذیذ غذاؤں سے سیر ہوتا ہے تو روحانی بطن غیبی لطیف غذاؤں سے سیر ہوتا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا افطار پے درپے روزے رکھنے پر فرمایا: ''اَيُّكُمْ مِثْلِيْ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ.'' ''تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے''۔ اگر پیشانی کی آنکھ خوشنما چہرے، اور اقلیموں کے جمیل مناظر دیکھتی ہے تو دل کی آنکھ رجال غیب (ملائکہ علیہم السلام) کے روشن چہرے اور عجائبات سماوی دیکھتی ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف شمس کے موقعہ پر جنت و دوزخ کو عیانا دیکھا اور جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں ملاحظہ فرمایا اور شب معراج ایک انتہائی رفیع منزلہ پر پہنچ کر اپنے پروردگار کے جمال کا بھی مشاہدہ فرمایا۔ اگر یہ سر کے کان اس جہان کے حسی نغموں اور آوازوں کو سنتے ہیں۔ تو دل کے باطنی کان اسی جہان غیب کی آوازیں اور روح نواز نغمے سنتے ہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائکہ آ کر باتیں کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے یا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کا دور کر کے سنتے سناتے تھے اور بعض اوقات آسمان کے دروازہ کھلنے کا تراقہ بھی سنتے۔

اگر منہ کی ناک ہواؤں کے طفیل پاکیزہ خوشبوئیں سونگھتی ہے تو دل کی اندرونی ناک اس عالم کے روح و ریحان کی خوشبوؤں کا ادراک کرتی ہے۔ جیسے حدیث نبوی میں جھوٹ کی بدبو اور سچ کی خوشبو کا ذکر کر کے فرمایا گیا کہ جھوٹ کی بدبو سے ملائکہ کاتبین عمل دور تک بھاگے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جیسے مرنے کے بعد مومن کی روح میں سے مشک کی خوشبو کا مہکنا اور ملائکہ کا اسے سونگھنا بتلایا گیا اور جیسا کہ جان نکالنے کے وقت ملائکہ موت کا مرنے والے کے ہاتھ پاؤں کو سونگھنا کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا وہاں بھی ہے اور یہاں بھی، وہاں حواس سے ہے اور یہاں وجدان

سے، وہاں مادیت سے ہے اور یہاں روحانیت سے، وہاں قلب کے نچلے دریچہ سے اس جہان رنگ و بو کی صورتیں محسوس ہوتی ہیں اور یہاں قلب کے اوپر کے جھروکہ سے اس جہان کی اخلاقی اور روحانی قدریں مشاہدہ ہوتی ہیں، وہاں احساس ہے اور یہاں الہام، وہاں قوائے حساسہ اور عاقلہ ہیں اور یہاں قوائے وجدانیہ، وہ حسیات وعقلیات ہیں اور یہ معنویات، وہاں سائنس اور فلسفہ کی کارگزاری ہے اور یہاں حکمت الٰہی اور وحی ربانی کی۔

حس اور علم کا فرق...... اس سے یہ بھی کھل جاتا ہے کہ فلسفہ وسائنس یا حواس سے جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے اسے حس کہا جائے گا، علم نہیں کہا جائے گا اور یہاں غیبیات کی خبروں سے جو کچھ کھلے گا، اسے علم کہا جائے گا، حس نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ علم کہتے ہی ہیں کسی مخفی اور نگاہوں سے اوجھل چیز کے جان لینے کو، خواہ وہ غیبی اشخاص ہوں یا معنوی امور، علمی جزئیات ہوں یا اصول کلیہ کہ وہ حس سے محسوس نہیں ہوتے۔ اس لئے علم جب بھی ہوگا، مغیبات ہی کا ہوگا نہ کہ حسیات کا اور حس جب بھی ہوگی مشاہدات کی ہوگی خواہ وہ مشاہدہ صورت کا ہو یا مشاہدہ آواز واصوات ہو یا مشاہدہ خوشبو وغیرہ۔ گو توسعاً کبھی حس کو علم یا علم کے احساس سے تعبیر کر دیا جائے۔ بہر حال علم وہی ہے جو حواس سے غائب اور مخفی امور کا ہو اور آلات حس سے اس کا ادراک نہ ہوتا ہو۔ یہ علم جو حقیقی علم ہے اپنی پوری اصلیت اور قطعیت کے ساتھ انبیاء معصومین علیہم السلام پر اترتا ہے اور بطور ظل وفرع کے ان کے اتباع وخدام، اولیاء کرام اور علماء آخرت پر وارد ہوتا ہے

حسیاتی علوم کا سرچشمہ مادہ ہے اور الہامی علوم کا منبع ذات وصفات خداوندی ہے...... بہر حال ظاہری علوم یعنی احساسات اگر مادے کی ذات وصفات سے تعلق رکھتے ہیں کہ مادہ بھی ظواہر میں سے ہے اور یہ علم بھی ظواہر کا ہے۔ تو یہ الہامی علم خدا کی ذات وصفات اور افعال سے متعلق ہے کہ وہی غیب مطلق اور غیب حقیقی ہے اور یہ علم بھی غیب ہی کا ہے۔ پس اگر علم کا شرف معلوم کرے تو جیسے خدا کی ذات وصفات، شرف وعظمت میں سب سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ ایسے ہی اس کا علم بھی اور تمام علوم سے اعلیٰ فائق تر اور اشرف تر ہوگا اور جس طرح مادہ کے علم سے مادہ ہی کی ذات وصفات اور اس کے تقاضے کھلتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات وصفات کے علم سے اسی کے اوصاف وکمالات اور انکے تقاضے منکشف ہوں گے۔ اس غیبی علم کے سلسلہ میں چونکہ ذات بابرکات حق کا تعارف حاصل ہوتا ہے جو سارے کمالات وبرکات کا سرچشمہ اور تمام خیرات وحسنات کا منبع ہے اور آدمی مرتے دم تک ذوق وشوق اور محبت الٰہی سے اسی کی طرف دوڑتا اور بڑھتا رہتا ہے اور اسی کی ذات وصفات میں سراپا شوق بن کر گھستا رہتا ہے۔ تو طبعی طور پر اسی کی صفات وکمالات کا اسے انکشاف اور علم یقین بھی حاصل ہوتا رہتا ہے کہ وہ واحد مطلق، علیم وخبیر، حکیم وکریم، رؤف ورحیم، محسن ومنعم، رزاق وفتاح، ہادی برحق اور معلم مطلق ہے۔ تو اس سے قدرتی طور پر انسان میں خدائی اخلاق کے پرتو نمایاں ہوتے ہیں۔ یعنی رحمدلی، سخاوکرم، حیاء وعفت، غیرت وحمیت، جود وعطا، عدل وانصاف، ناداروں کی خبر گیری، مفلسوں کی حاجت برآری، مظلوموں کی دادرسی یتیموں اور بیواؤں کی خدمت گزاری، غریب

الوطنوں کی پشت پناہی، کمزوروں کو قوت رسانی اور عام مخلوق خدا کی خیر خواہی کے ہی اخلاق و جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے عالم میں چین، ملکوں میں اطمینان، شہروں میں سکون، گھروں میں عافیت، دلوں میں بشاشت اور معاملات میں فرحت و مسرت کے آثار پھیل جاتے ہیں۔ جس سے یہ ظلمت کدہ دنیا جنت نظیر بن جاتا ہے۔ زندگیاں بڑھ جاتی ہے اور آدمی فرشتہ بن کر پردہ دنیا پر نمودار ہوتا ہے۔ جس پر ہمہ وقت رحمت کی بارشیں برستی ہیں اور وہ لوگ بھی اس سے محروم نہیں رہتے، جو اپنی تنگ نظری سے ان بھلوں کو بھی برا بناتے رہتے ہیں۔

ادیم زمیں سفرہ عام اوست بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

مادی اور الہامی علوم کے جُدا جُدا آثار وثمرات..... پھر نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کو بھی سکھ میسر آتا ہے۔ جس سے وہ اس قسم کے ربانیوں اور حقانیوں کی محبت وعقیدت میں سرشار ہو کر ان کے دعا گو بن جاتے ہیں۔ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں، مچھلیاں اپنے دریاؤں میں اور پرند اپنی فضاؤں میں ایسے انسانوں کی عمر درازی اور اقبال مندی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ملائکہ جیسی مقدس مخلوق ان کے قدموں کے نیچے پر بچھانے لگتی ہے۔

جس کی بنیاد یہ ہے کہ اس علم حقیقی کا پہلا اثر آدمی کے اخلاق میں نمایاں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ مادہ پرستوں مین مادہ کی ذات وصفات کو رات دن کریدتے رہنے اور اس میں ہمہ وقت گھسے رہنے سے مادیت اور مادی جذبات واخلاق ہی چھاتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے اس امارۃ بالسوء نفس کو قوت ملتی ہے اور وہ اس مادی قوت کے غرور اور وقتی وسائل زندگی کی کثرت کے گھمنڈ میں انجام سے بے خبر ہو کر نفس پروری، خود غرضی، بے حمیتی، طمع نفس، توقیر نفس، تحقیر غیر، نفاق انگیزی، ظلم پروری، قساوتِ قلبی، بے حیائی، دنیا طلبی، تلبیس آمیز آئینی انداز کی چوری، قانونی رنگ کی ڈکیتی اور اپنی حقیر حقیر قسم کی اغراض وخواہشات کی تکمیل کے لئے ہزاروں انسانوں کے جان ومال سے کھیلنے ہی میں لطف محسوس کرتا ہے۔ جس سے دنیا میں بے چینی، بے اطمینانی، باہمی بے اعتمادی، مایوسی، توہم پرستی اور تعصب پسندی کی فضاء بن جاتی ہے۔ جس سے نہ عباد کو چین ملتی ہے، نہ بلاد کو۔ ایسے ہی خدا کی ذات وصفات اور کمالات کی معرفت اور اس میں رات دن گھسنے اور دوڑنے سے اسی کے کمالات کے آثار نفس میں پیوست ہوتے ہیں۔ جس سے وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اس میں خدائی اخلاق رحمت ومحبت، ایثار وغنا، خدمت خلق اللہ، دستگیری ضعفاء اور محبت آخرت وغیرہ کے اخلاق واعمال رونما ہوتے ہیں۔

پھر اسی غیبی علم کے سلسلہ میں ذات وصفات کے علم کے بعد اس کا اہم ترین حصہ اللہ رب العزت کے قانون کے علم کا ہے۔ جس سے اس کی مرضی ونامرضی کا پتہ چلتا ہے اور ان مذکور اخلاق وملکات کو عمل میں لانے کے لئے عمل کے طریقے سامنے آتے ہیں۔ حلال وحرام، جائز ناجائز، روا وناروا کی تمیز پیدا ہوتی ہے اس کے اوامر ونواہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اور اس کے مخلوق کے حقوق ادا کرنے کے ڈھنگ نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے وہ پختہ اور تیر بہدف کے نمونے اور پیغمبری اسوے نمودار ہوتے ہیں، جن سے انسان کی سعادت دنیا اور نجات آخرت رونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

علم ربانی کی ساتھ علم نفس بھی ضروری ہے...... مگر اسی علم اعلیٰ کا تتمہ ایک اور علم بھی ہے کہ جس کے بغیر آدمی اعلیٰ علم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ خود اپنے نفس کے نشیب و فراز کا علم ہے۔ جس سے نفس کی اصلیت اور اس کی جبلت کے گوشے واشگاف ہوں۔ کیونکہ نفس کی اونچ نیچ کا علم ہو جانے سے واشگاف ہوتا ہے کہ وہ تمام شرور ونقائص اور عیوب و ذنوب کا منبع ہے۔ برائیاں اسی سے ابھرتی ہیں اور دینائے اخلاق کو تہہ و بالا کر ڈالتی ہیں۔

چنانچہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کھول دیا ہے کہ انسانی نفس کی ذات میں نہ کوئی کمال ہے نہ ہنر۔ کمال و ہنر کی دو ہی بنیادیں ہیں علم اور اخلاق۔ قرآنی روشنی میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ نہ اس کے اول میں علم ہے نہ آخر میں اور درمیان میں جتنا ہے وہ عارضی ہے۔ جو اس کی دلیل ہے کہ اس میں پیدائشی طور پر کوئی علمی کمال موجود نہیں۔ پھر جہاں تک اخلاقی کمال کا تعلق ہے۔ جس سے پاکیزہ اعمال اور خیر و برکت کی حرکات وسکنات کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں نہیں، بلکہ ہے تو فتنہ وفساد کے جذبات اور برائیوں کے دواعی جاگزیں ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام کو جب انسان کی خلافت ارضی کا علم ہوا تو انہوں نے جناب باری میں عرض کیا تھا کہ: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ ''کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور خون بہائے''۔

اِدھر یوسف علیہ السلام کا مقولہ حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ﴾ ''بے شک نفس (امارہ) جو تو سکھلاتا ہے برائی، مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے''۔ جس سے صاف واضح ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے جیسے علم لے کر نہیں آیا۔ ایسے ہی کوئی اخلاقی کمال لے کر بھی نہیں آیا۔ ورنہ اسے تعلیم و تربیت کی ضرورت نہ پڑتی اور ظاہر ہے کہ جب اس کے جذبات اس جہل و ناتوانی اور بداخلاقی و بدتہذیبی کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ تو وہ سوائے فتنہ وفساد کے اور کیا ہوں گے اور ادھر کمالات علم اور کمالات اخلاق کا سرچشمہ درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کی ذات بابرکات ہے۔ جس کے آثار دنیا میں امن وامان اور دیانت وایمان پھیلاتے ہیں۔ جس سے دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے تو ضروری تھا کہ جہاں علم خداوندی انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہیں خود اپنے نفس کا علم بھی بتعلیم حق ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے جبلی شر وفساد کو فطرت الٰہیہ کی خیر و برکت زائل کر سکے اور اس طرح دنیا بھی اس کے شر سے محفوظ رہ سکے اور وہ خود بھی حفاظت کے دائرہ میں آجائے۔

علم کی دو بنیادی اقسام علم النفس اور علم الرّب...... اس لئے قدرتی طور پر دو علم بنیادی طور پر ضروری ٹھہر جاتے ہیں۔ جو انسان کی صلاح وفلاح کے لئے ناگزیر ہیں۔ ایک علم النفس اور ایک علم الرب پھر دونوں علم جہاں اپنی اپنی خاصیتوں اور تاثیروں کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ وہیں اس وجہ سے بھی فطری ہیں کہ طبعاً انسان سب سے پہلے اپنے قرب کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے اور پھر بعید اور دور کی چیزوں کا۔

اور ظاہر ہے کہ انسان کا نفس جس قدر انسان سے قریب ہے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ سو اگر کسی کو اتنے قرب اپنا بھی علم نہ ہو تو اس سے زیادہ جاہل اور کون ہو سکتا ہے اور ادھر اس سے بھی زیادہ قریب تر اس کا رب ہے کہ خود

نفس بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں۔ تو اس غیر معمولی قرب پر بھی اگر انسان کو اپنے رب کا علم نہ ہو تو اس سے زیادہ اجہل اور کون ہوسکتا ہے؟

اس لئے قرب و بعد کے لحاظ سے بھی یہ دونوں علم انسان کے حق میں ضروری اور واجب ٹھہر جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان دونوں علموں کی ضرورت کی بنیادیں بھی قائم فرمادی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ﴾ ''ہم دکھلا دیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں ہی، یہاں تک کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے۔ کیا تیرا رب تھوڑا ہے اس چیز پر گواہ ہونے کے لئے خبر دار وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے، خبر دار وہ گھیرے ہوئے ہے ہر چیز''۔ ظاہر ہے کہ یہ ارائت آیات (نشانیاں دکھلانا) ہی علم پہنچانا ہے اور وہ علم نفس کے اندر کا بھی ہوگا اور باہر کا بھی جس سے علم النفس اور علم آفاق کی تحصیل کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے۔

پھر اس علم پر تبین حق مرتب کیا گیا ہے اور تبین کے معنی کھول دینے کے ہیں ظاہر ہے کہ ذہن پر یا قلب حق کا کھل جانا ہی علم ہے۔ جس سے علم الرب کی طرف اشارہ ہے اور ساتھ ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علم النفس یا نفس کے اندر آیات الٰہیہ کا دکھلایا جانا، ہی حق کے دکھلا دئے جانے کے مبادی میں سے ہے تو اس کا صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معرفت نفس ہی سے معرفت رب کا دروازہ کھل سکتا ہے، جسے عرفاء اسلام نے بلیغ ترین انداز سے اس حکیمانہ مقولہ سے مزید کھول دیا ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ......'' ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔

علم الرب کی عملی تفاصیل کا نام فقہ ہے اور علم النفس کی تفاصیل کا نام تصوف ہے۔..... علم حق اور اس کے احکام کے لئے فقہ ہے۔ جس میں احکام مکلفین کو کتاب وسنت سے اخذ کر کے جمع کر دیا گیا ہے اور علم النفس اور اس کے جبلی دواعی کے لئے فن تصوف ہے جس میں نفس کے تمام مکائد اور اس کی بداخلاقیوں کے اصول اور پھر ان رذائل کو فضائل سے بدلنے کی تدابیر کتاب وسنت سے جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جب تک اپنے نفس کی جبلتوں کا علم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک حق کی فطرتوں سے استفادہ مشکل ہے۔ اس لئے جہاں علم الرب ضروری ہے۔ وہیں علم النفس بھی ضروری ہے، تا کہ ایک طرف شرور و نقائص کی فہرست سامنے آجائے اور ایک طرف کمالات ومبرات کی تفصیل نمایاں ہو جائے اور اس طرح دنیا فتنہ وفساد سے بچ سکے۔

یہی دو علم ہیں جن سے انسان فرض شناس بنتا ہے، خوشی اور غمی میں اپنے حقیقی فرائض کو نہیں بھولتا دنیا کو چند روزہ اور اس کی لذتوں کو فانی لذت سمجھ کر اپنے ہر کام اور عمل میں آخرت ہی کو سامنے رکھتا ہے۔ اور اسی کو مقصد زندگی اور اپنی حیات مستعار کا نصب العین قرار دے لیتا ہے اور اس طرح تعظیم حق اور خدمت خلق کو اپنا جو ہر نفس بنا

کر خاک ناپاک سے جو ہر پاک بن جاتا ہے اعمال صالحہ اس سے اولاً بتکلف اور آخر کار بے تکلف سرزد ہونے لگتے ہیں جس سے مخلوق بھی اس پر اعتماد کرتی ہے اور خالق کی رضاء وخوشنودی بھی میسر آتی ہے اور اس طرح دارین کی فلاح و بہبود اس کا نقد زندگی بن جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اسی علم الرب کے پہنچانے کے لئے آتے ہیں...... یہی وہ قلب کا بلاواسطہ علم ہے۔ جس کے پہنچانے کے لئے فلسفی اور سائنس دان نہیں، بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے۔ اسی علم کو بطون غیب سے اس عالم ظاہر میں اتارنے کے لئے ملائکہ معصومین علیہم السلام آسمانوں سے زمین پر اتارے گئے اور اسی کے عملی نمونے دکھلانے کے لئے پیغمبروں اور ان کے مخلص خدام، آئمہ ہدایت، علماء ربانی اور درویشان حقانی کو مامور فرمایا گیا یہی وہ علم ہے جس کا تعلق مادہ اور صورت سے نہیں بلکہ حقیقۃ الحقائق ذات بابرکات حق سبحانہ وتعالیٰ سے ہے اور جب کہ حسیاتی اور عقلیاتی علم کا آخری منتہا قلب تھا۔ جو بذریعہ حواس خمسہ اور بذریعہ عقل معاش اسے نظریاتی ازموں کمیون ازم، کیپٹل ازم، سوشل ازم وغیرہ اور مشینی عملوں کی صورت سے اس دنیا میں نمایاں کرتا رہا ہے۔ تو اس معنوی اخلاقی اور شرعی علم کا منتہا تو قلب کے سوا دوسرا عضو ہی ہو نہیں سکتا۔

پس یہ علم بطریق اولیٰ قلب ہی کا ہے جو بلا واسطہ حس و عقل محض وحی الٰہی سے ملتا ہے۔ ان رسمیاتی علوم سے اگر نظریاتی فلسفے نمایاں ہوتے تھے۔ جن سے آدمی مادہ کی گہرائیوں تک پہنچ کر مادیات ہی میں گم ہو جاتا تھا۔ تو س خدائی علم سے دینی حکمتیں، فقہی مسالک اور وصول الی اللہ کے طرق نمایاں ہوتے ہیں جن سے آدمی حق کی گہرائیوں میں پہنچ کر فانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ جو دوامی بقاء ہے وہاں اگر مشینی عملوں کی صورتیں نمودار ہوتی تھیں تو یہاں قلبی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ جن سے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کی بدولت آدمی بلاتوسط اسباب بڑے بڑے بیبی جہانوں حتیٰ کہ چاند تک ہی نہیں، فوق سماوات تک جا پہنچتا ہے۔

اور جیسے ان نظریاتی ازموں کے علم وعمل سے دنیا میں ہمیشہ فتنہ وفساد اور اخلاقی گراوٹیں سامنے آتی رہیں اور اُرہی ہیں اور انسان انسانیت چھوڑ کر حیوانیت کے گڑھے میں گرتا رہا ہے۔ ایسے ہی ان فقہی اور خدائی مسلکوں کے ملم وعمل سے ہمیشہ دنیا میں امن وسلامتی، اخلاقی بلندی اور پاکیزہ عزائم واعمال کے نمونے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن سے انسان انسانیت سے بھی بالا ہو کر ملکیت کے آسمانوں پر پہنچتا رہا ہے اور اب بھی سعادت مند قلوب برابر پہنچ رہے ہیں۔ مادی قسم کے نظریات اور فارمولوں سے ہمیشہ فرعون وہامان پیدا ہوئے اور ان روحانی قسم کے فکار و اعمال سے صدیق رضی اللہ عنہ وفاروق رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

حسیاتی علوم کی طرح ربانی علوم کا ظرف بھی قلب ہی ہے..... قرآن حکیم نے جیسے حسیاتی اور نظریاتی علوم کو قلب ہی کا علم کہا ہے۔ مگر بواسطہ حواس و عقل جس کی تفصیل گزر چکی ہے ایسے ہی خدائی علم کا ظرف بھی قلب ہی کو بتلایا ہے۔ جو اس اقلیم تن میں حقیقی مدرک اور عالم ہے اور وہی اس حسی خول میں ایک لطیفہ ربانی ہے جو اس علم کو اپنے

اندر جذب کرتا ہے کہ اس کی اصلی غذا یہی علم ومعرفت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ o عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ o بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ﴾ ”اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر، تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنادینے والا کھلی عربی زبان میں“۔

پس جیسے علوم حواس کا سرچشمہ مادہ اور صورت ہے۔ اسلئے اس علم سے مادہ صورت ہی کو قوت ملتی ہے۔ کھانے پینے اور بارام رہنے سہنے سے بدن اور بدنی قوتیں ہی زور پکڑتی ہیں اور اس سے پھر مزید نمائشی صورتوں اور اسباب تعیش کے نئے نئے ڈیزائنوں کی بجائے حقیقی اور سیرت وکردار کے نئے نئے پاکیزہ نقشے سامنے آتے ہیں۔ جن سے درجہ بدرجہ روحانیت کے مقامات ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔

اب اگر یہ حقیقی علم اور اس کی یہ اخلاقی قدریں اس نمائشی علم اور اس کی حسی صورتوں کے ساتھ لگ کر اسی میں روح کی طرح سما جائیں۔ تو پھر تمدن کے یہ نمائشی نقشے بے جان باقی نہیں رہ سکتے۔ بلکہ زندہ وپائندہ بن جاتے ہیں۔ جس سے دنیا کو حیات ملتی ہے نہ کہ تباہی وہلاکت، دنیا میں امن وسکون پھیلتا ہے۔ نہ تشویش واضطراب اور بے چینی جیسا کہ خلفاء راشدین اور آئمہ عدل وحق نے دنیا کے نقشوں کو مٹائے بغیر انہیں اخلاقی قوتوں سے جاندار بنا دیا تھا اور دنیا کے پردوں میں دینی زندگی بھر کر اس دنیا کو بھی زندہ جاوید دکھایا تھا۔

ربانی اور حسی علوم کے لوازم اور خاصیات...... جس کا راز یہ ہے کہ اس علم الٰہی کے لوازم میں سے پہلی چیز خشیت اللہ اور خوف خداوندی ہے جس کا طبعی اثر نافرمانی اور بغاوت حق سے گریز اور معصیت سے پرہیز ہے۔

پس عالم دین وہی شمار ہوگا جس میں علم کی یہ خاصیتیں سمائی ہوئی ہوں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل حسی اور فلسفیانہ علم کا خاصہ خوف خداوندی کے بجائے، منافع بدنی کے فوت ہونے کا خوف اور فرمانبرداری حق کے بجائے فرمانبرداری نفس ہے۔ جس کا طبعی اثر معصیت، حق تلفی اور طغیان وسرکشی ہے۔ جس سے عالم میں فتنے، فسادات اور ہنگامے پھیلتے ہیں۔ پس ایک مادی اور طبعی علم کا عالم وہی سمجھا جائے گا۔ جو سب سے زیادہ آزاد فکری، بے باکی اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ حلال وحرام کے فرق سے بے نیاز ہو اور اپنے منافع کی خاطر ایک دنیا کی دنیا کو تباہی کے گھاٹ اتار دینے سے بھی دریغ نہ رکھتا ہو۔ کسی عربی کے شاعر نے خوب کہا ہے۔

رَضِیْعَا لَبَانٍ حِکْمَةٌ وَّتُقًی　　　وَسَاکِنَا وَطَنٍ مَالٌ وَّطُغْیَانٌ

”ایک ہی چھاتی کا دودھ پیا ہے علم اور خشیت الٰہی نے کہ ایک سے دوسرا جدا نہیں ہوسکتا۔ جہاں علم ہوگا۔ وہاں خوف خداوندی ضرور ہوگا (بشرطیکہ تربیت صحیح ہو) اور ایک ہی وطن کے باشندے ہیں مال (وسائل عیش) اور سرکشی کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ وسائل دنیا ہاتھ میں آجائیں گے تو تمرد وبغاوت لازمی طور پر آئے گی (جبکہ تربیت صحیح نہ ہو)“۔

چنانچہ اس علم الٰہی کے آثار خشیت وخوف کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ

عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ''اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے''۔ اور پھر اسی ربانی علم کے علماء کا مقابلہ غیر علماء سے کرتے ہوئے قرآن نے ان کا فرق مراتب اور عدم مساوات ارشاد فرمایا ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ ، اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ''کیا جو لوگ (اللہ اور اس کے احکام کو) جانتے ہیں وہ برابر ہو جائیں گے ان لوگوں کے جو جاہل ہیں بلاشبہ ذکر و نصیحت پکڑنا عقل والوں ہی کا کام ہے''۔ اور پھر اسی علم کے حاملین کے روز بروز بڑھنے والے درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا: کہ : ﴿وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور جنہیں علم عطا ہوا ہے ان کے درجات ہیں''۔

علم نافع کی حقیقت و وسعت...... یہی وہ مراتب و درجات والا علم ہے۔ جس کا لقب علم نافع ہے اور جس کا نفع کسی حد پر آ کر نہیں رکتا بلاشبہ دنیا کے تمام علوم وفنون خواہ حیاتی ہوں یا نظریاتی، نفع سے خالی نہیں، سائنس ہو یا فلسفہ، ریاضی ہو یا مساحت، معاشیات ہوں یا اقتصادیات اور تمام علوم وفنون کے نافع ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ان کی بدولت ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ رہائشی مکانات کی تعمیر، ظروف اور اثاث البیت کی تیاری، لباس اور تن پوشی کے سامان خورد ونوش کے ذرائع، نقل و حمل کے وسائل۔ پھر تجارت وصنعت کے اسباب و موادانہی کے ذریعہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو یقیناً نافع ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا نفع علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ ایک حد تک محدود ہے جو قبر کے کنارہ سے آگے نہیں گزرتا۔

آپ ہوائی جہاز سے لندن اور برلن منٹوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن عرش کرسی اور جنت تک یہ سواریاں آپ کو نہیں پہنچا سکتیں۔ آپ ان فنون کی ساختہ پرداختہ غذاؤں سے دنیا میں پیٹ بھر سکتے ہیں لیکن قبر میں شکم سیری کے لئے یہ کارآمد نہیں ہیں۔ آپ نرم گدیلوں اور تکیوں سے یہاں بدن کو آرام پہنچا سکتے ہیں لیکن قبر وحشر میں یہ گدے، تکیے بے کار ہیں۔ اس لئے ان علوم وفنون کا نفع اسی زندگی کے آخری سانس تک محدود ہے۔

لیکن علم شرائع جو سامان بنانے کے لئے نہیں بلکہ انسان بنانے کے لئے آیا ہے اور صحیح الانسانیت انسان کی گزرگاہ محض دنیا ہی نہیں۔ بلکہ برزخ اور حشر بھی ہے۔ اس لئے اس علم کا تیار کردہ انسان جو انسانی کمالات سے بھرپور ہو اور اس کی راحت وطمانیت خود اس کے اندر ہی مہیا کر دی گئی ہو۔ دنیا میں بھی اس علم سے آرام پاسکتا ہے اور وہاں بھی کیونکہ اس کا راحت و آرام مادی وسائل کے تابع نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی راحت اس علم کی بدولت اس کے قلب میں ہوتی ہے۔ جسے کسی بھی جہان کی کوئی چیز زائل نہیں کر سکتی۔ اس لئے نافع مطلق یہی علم ہوسکتا ہے جو انسان میں غناء وطمانیت پیدا کر کے دنیا و آخرت کی تمام راحتیں خود اسی کے اندر مہیا کر دیتا ہے۔ اس لئے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کا سکھ اور چین کبھی زائل نہیں ہوتا۔

پس علی الاطلاق جب بھی علم نافع کا لفظ بولا جائے گا۔ تو اس سے یہی علم شرائع اور علم حقائق مراد ہوگا۔ صرف یہ کہ وہ مکدر عیش اور کدورت آمیز زندگی کا سبب بنیں گے، بلکہ تمدن کے وہی بے جان ڈھانچے اور لاشے پیدا

کریں گے، جن میں تعفن اور بد بو ہوگی اور دل و دماغ پراگندہ ہو کر ہلاکتوں کا شکار بن جائیں گے۔ پھر یہی وہ علم ہے جو قلب کے حقیقی فرائض میں ہے۔ جیسے دیکھنا، سننا کان آنکھ کے فرائض میں سے ہے اور جب قلب علم کا وہی وظیفہ ادا کرے گا، جو قدرت نے اسکے سپرد کیا ہے اور اس علم سے وہ اپنی اقلیم تن کا نظام چلائے گا۔ تو بھی کائنات انسانی کا وہ عدل ہوگا۔ جو حرمان وخسران سے بری ہوگا اور کفران کے عذاب سے انسانوں کو محفوظ رکھ سکے گا۔

اگر قلب کو اس کے اس اصلی علم سے ہٹا کر ظاہر داریوں کے علم میں ہمہ تن پھانس دیا جائے گا تو یہی وہ خسران ہے جس کا ذکر ابتدائی اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں اور اگر اسے ان سب سے معطل رکھ کر جہالت کے قعر میں گرا دیا جائے تو یہی وہ حرمان ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پھر یہی قلب کا وہ علم ہے جسے علم قطعی کہیں گے جس میں شک وشبہ اور تردد و تذبذب کی گنجائش نہ ہوگی۔ کیونکہ حواس خمسہ یا عقلیات جو معلومات اس دنیا سے بٹور کر لاتے ہیں۔ ان میں شک، وہم، تردد اور تذبذب کی آمیزش ہوتی ہے جو جہل کی اقسام میں سے ہے۔ اس لئے یہ دنیوی علوم جہل آمیز ہوتے ہیں، خالص علم نہیں ہوتے کہ ان میں قطعیت ہو۔

لیکن خدائے برتر کا نازل کردہ علم جو انسانی ضمیر پر بلا واسطہ حواس وعقل اترتا ہے، وہ سر چشمہ فطرت سے نازل ہونے کے سبب کمال قطعیت لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں کسی شک وشبہ یا وہم وتردد کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ مورث یقین واطمینان ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی بشاشت وطمانیت رو بہ ترقی رہتی ہے اور اس میں حقیقی چین اور سکھ پیدا کرتی ہے۔

بہر حال اخلاقی قدریں علم الٰہی کے خواص و آثار میں سے ہیں اور بد اخلاقی کی قدریں ان صورتوں شکلوں اور نمائشی ڈیزائنوں کے حسی علم کے خواص و آثار میں سے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں علم اپنی نوعیت اور اپنی خاصیت کے لحاظ سے گو بالکل جدا جدا ہیں۔ لیکن اگر ان ظاہری علوم کا مقصد اس حقیقی علم کو ٹھہرا کر آگے بڑھایا جائے اور ان نمائشی نقشوں کو ان حقیقی قدروں سے بھر دیا جائے۔ تو دنیا کے یہ خوشنما نمونے آخرت میں کام دے سکتے ہیں۔

عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے..... آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر مفقود ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علم الٰہی ہے، ختم کیا جا رہا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کا سر چشمہ ہے اور اگر بد اخلاقیاں دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو بالاستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جا رہا ہے۔ جس میں سوائے ظاہر داری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔

چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور افراط ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات ومنافع کے لئے حلال وحرام سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جا رہے ہیں۔ جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہ اتار پھینکنے ہی کو سب سے بڑی معراج ترقی سمجھ چکا ہے۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاقی دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں۔ تو یہ

ان کی اپنی سلامتی، فطرت یا گھریلو ماحول یا دیندار ماں باپ کی تربیت کا اثر ہوسکتا ہے نہ کہ خالص اس مادی تعلیم کا۔

ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وجود کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے لادینی ماحول اور مادہ پرستانہ اخلاقی تربیت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ لادینی اور اخلاقی انار کی محض کالج اور یونیورسٹی یا محض کسی کتاب کے نوشتوں کا اثر نہیں۔ بلکہ معلموں کی ناتربیتی اور اور پست اخلاقیوں کے ماحول کا اثر ہے اور پھر اس تعلیمی ماحول کے بگڑنے ہی سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ ورنہ آج مدارس دینیہ میں بھی فلسفہ اور مبادی سائنس پڑھائے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ قلب و اخلاق اور اعتقاد پر کوئی مضر اثر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ پڑھانے والوں کا قلب، دیانت و امانت کا ظرف بنا ہوا ہوتا ہے اور نیک ماحول کا وجود قائم شدہ رہتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں مضر نہیں، بلکہ ان کا ماحول مضر ہے۔ اگر انہی یونیورسٹیوں میں مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کے دواعی پیدا ہو جائیں اور مادی ڈھانچوں میں روحانی قدروں کا رنگ بھر دیا جائے۔ تو یہی مادہ ایک صالح تمدن کا جنم دہند بن سکتا ہے۔ پس ضرورت کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مٹانے کی نہیں بلکہ ان کا نظام اور ماحول بدلنے کی ہے۔

مدارسِ دینیہ کے قیام کی ضرورت اور غرض و غایت ...... لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پھر دوسری مستقل صورت اس کے سوا اور نہیں ہوسکتی کہ الگ سے ایک صحیح اور مستقل خدا پرستانہ ماحول قائم ہو۔ جس میں علوم خداوندی کی تعلیم اور اس کے تحت اخلاقی تربیت پر پورا زور صرف کیا جائے اور دینی مدارس ملک میں زیادہ سے زیادہ پھیلا دیئے جائیں۔ جو بالآخر اپنے کردار وعمل سے ان دوسرے ماحولوں پر بھی موثر ہوں اور ادھر ان دینی اداروں میں ایسے افراد کی بھرتی کی خاص گنجائش رکھی جائے۔ جو سائنس و فلسفہ زدہ ہونے کی وجہ سے مایوس العلاج مریضوں کی صف میں آ چکے ہوں مگر اپنا معالجہ چاہتے ہوں۔ کیونکہ آج کی صورت پرستانہ تمدن کی رنگین صورتوں میں اگر اخلاقی قدریں بھری جاسکتی ہیں اور تمدنی جزئیات کی ان خوب صورت مگر مردہ لاشوں کو روح اخلاق سے زندہ کیا جاسکتا ہے، تو وہ صرف اسی علم سے جو پاک قلوب پر بلاتوسط اسباب غیب سے اتارا گیا ہے۔ جس کا مقصد ہی انسان کو انسان بنانا ہے۔ نہ کہ سامان تیار کرنا، اس لئے اگر ایک طرف قوم کو نئی تعلیم کے ذریعہ زندگی کے ڈھانچے بنانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ تو دوسری صرف انہیں اس دین کی قدیم تعلیم کے ذریعہ ان ڈھانچوں میں روح ڈالنے کے لیئے بھی تیار کیا جائے۔ ورنہ یہ تمدنی صورتوں کی مردہ لاشیں ایک نہ ایک دن دنیا کے دماغ کو پراگندہ کر کے رہیں گی اور پھر ان گلے سڑے ڈھانچوں میں روح آنے کی صلاحیت بھی نہ رہ جائے گی۔ اس لئے اگر اج حواس خمسہ کے سائنسی علوم اور عقل معاش کے فلسفیانہ علوم کی ضرورت ہے تو اس سے کہیں زیادہ قلوب کے اس عرفانی علم کی بھی ضرورت ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے اپنی روح فرما کر اسی کو جہانوں کا زندہ کنندہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ صِرَاطِ

اللہِ الَّذِیْ لَہٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ط اَلَآ اِلَی اللہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ﴾ ”اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی، اس سے سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک تو سمجھاتا ہے سیدھی راہ اللہ کی۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام“۔

دورِ حاضر کی بیمار دنیا کا واحد علاج...... بہرحال اگر آج کی دنیا کا گہرا مرض یہی ہے کہ اس کے نمائشی تمدن میں اخلاقی قوتیں باقی نہ رہیں اور اگر دنیا کی عمومی بیماری یہی ہے کہ اسے سب کچھ ملنے کے باوجود جو چیز نہیں مل سکی، وہ سکونِ قلب اور روحی چین واطمینان ہے۔ تو اس کا واحد علاج یہی اور صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اسے سرچشمہ طمانیت وبشاشت علمِ دین اور علمِ اخلاق یا بالفاظ مختصر ”مذہبی تعلیم“ سے روشناس کرایا جائے اور دین ومذہب کے بنائے ہوئے علمی اور اخلاقی نقشوں پر ان کی تربیت کی جائے۔ جس کا مکمل اور مستند سرچشمہ آج کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اور دوسرا نہیں۔ اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَاصَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا“ ”اس امت کے آخر حصہ کی اصلاح اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس سے امت کے اول حصہ کی اطلاح ہوئی تھی“۔ اور وہ وسیلہ اصلاح یہی روحِ الٰہی قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات اور تشریحات ہیں۔ جو حدیث اور فقہ میں منضبط اور مدون ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... میرا مقصد علمِ عصریہ سے کلیۃً ہٹانا ان سے نفرت دلا کر کلیۃً بے زار بنانا نہیں۔ کیونکہ جب انسان میں روح کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے تو روحانی قدروں کے ساتھ بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ جس میں خورد ونوش، بود وباش، نقل وحمل وغیرہ کے اسباب، نیز تجارت، زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ کے تمام وسائل داخل ہیں۔ جنہیں سائنس وفلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے جب تک روح کا بدن سے انقطاع کلی نہیں ہو جاتا ان وسائل واسباب اور ان کی تعلیم سے بھی کلی یکسوئی ممکن نہیں۔ لیکن جب کہ اسی طرح بدن کے ساتھ روح بھی لگی ہوئی ہے۔ تو اس کے تقاضوں سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی بالخصوص جب کہ ایک نہ ایک دن نفسِ انسانی کا اس بدن سے انقطاع ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس وقت جو چیز انسان میں باقی رہے گی، وہ روح ہی روح ہوگی۔ اس لئے اس کی ضروریات کی فراہمی بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی زیادہ ضروری اور ناگزیر ہے۔ بلکہ جب بدن اور بدنی زندگی عارضی ہے اور روح اور روحانی زندگی دوامی ہے۔ تو بدنی ضروریات اور ان کے مہیا کرنے والے علوم وفنون اور ان کے منافع بھی بہرحال عارضی ہی ہوسکتے ہیں اور عقلی قاعدہ ہے کہ عارضی ضرورتوں کی فراہمی بقدرِ ضرورت ہی ہوتی ہے۔ عوارض میں مقاصد کے انداز کا انہاک نہیں ہوتا۔ اس لئے ان عصری فنون سے نہ کلیہ قطع نظر ہی کی جاسکتی ہے اور نہ انہیں مقاصدِ زندگی بنا کر انہیں ترقی کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اصولی بات یہی ہوگی کہ انہیں کسی حد تک باقی رکھ کر ان سے معاش پیدا کی جائے۔ لیکن ہمہ وقتی فکر

مقصد زندگی کا رکھا جائے اور وہ دین ہے جو دنیا میں انسان کو انسانیت سکھلانے کے لئے بھیجا گیا ہے اور جس کے حصول کا واحد ذریعہ یہی دینی اور شرعی تعلیم ہے۔

علم دین ترقی کے لئے اور علم دنیا حصول ضروریات کے لئے ہے......اس طرز فکر کا قدرتی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے علم دین ترقی کے لئے رہ جائے اور علم دنیا وقتی ضروریات کے حصول کے لئے اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا'' ''دنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے''۔ اس لئے آج شدید ضرورت ہے کہ مسلمان علم دین کو مقصدی حیثیت دے کر آگے بڑھیں اور اپنی نسلوں کو دین اور تعلیم کے فروغ دینے کے لئے تیار کریں۔ اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں اولین درجہ تعلیم دین ہی کو دیا ہے ارشاد فرمایا کہ: ﴿کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ ''جیسا کہ بھیجا ہم نے تم ہی میں سے رسول جو پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تمکو اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اولین......اور اس لئے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا اولین مقصد تعلیم دین کو ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''

بعثت کا مقصد ثانی......اس تعلیم کا طبعی اثر اصلاح عمل ہے۔ جس کی اصلاح اور پاکیزگی ہے بغیر علم بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا وبال جان بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دوسری اہم غرض و غایت اسوہ حسنہ بتلائی گئی ہے۔ جسے قرآن نے تعلیم حکمت سے تعبیر فرمایا ہے اور تیسری غرض تکمیل اخلاق ہے کہ اس کے بغیر عمل صالح کے وجود پذیر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو تزکیہ سے تعبیر فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کر دوں'' فرما کر خلق عظیم کا وہ نمونہ پیش فرمایا کہ دنیا مسخر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر جھکنے کے لے مجبور ہوگئی۔ علم محض کی عظمت و وقعت ضرور کی جاتی ہے۔ لیکن سر نیاز اخلاق و عمل ہی کے آگے جھکایا جاتا ہے۔ پس اخلاق بمنزلہ تخم کے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والی شاخیں اعمال صالحہ ہیں۔

بعثت کا مقصد ثالث......پھر اگر کسی تخم پر برگ و بار نہ آئیں تو یہ اس کے سوخت ہو جانے کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے دینی زندگی کا تیسرا بنیادی اور اہم شعبہ تربیت اخلاق نکلتا ہے۔ جس سے اعمال شاخوں کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں اور آدمی اس کے بغیر معیاری انسان نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا میں کون ہے جو اپنے قول اور بیان کو خوش نما بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جس کا عمل اس کے قول کے موافق

پڑ جائے، تو ٹھیک ہے ورنہ محض قول سے وہ کھینچ کھینچ کر اپنے نفس کو خواہ مخواہ ہلاک کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا: ''هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ فَإِنْ اَجَابَ وَإِلَّا ارْتَحَلَ'' ''علم نے عمل کو پکارا (کہ میرے ساتھ چل) اگر اس نے قبول کر لیا (یعنی اگر وہ ساتھ ہولیا تو یہ علم عمل کی سواری پر سوار ہو کر اپنے عامل کو عرش تک پہنچا دے گا) ورنہ (یعنی اگر عمل ساتھ نہ ہوا) تو علم کوچ کر جاتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ پھر میں بھی نہیں ٹھہرتا)''۔

علم وعمل کی باہمی وابستگی...... اس سے واضح ہے کہ جب تک انسانی زندگی علم واخلاق اور عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہو کہ انسان اس میں بند جائے۔ اس وقت تک اس کی زندگی معیاری نہیں بن سکتی کہ لوگ اسے نمونہ سمجھ کر اپنی زندگیاں اس کے حوالہ کر سکیں اور اس کے قول وعمل سے اپنی زندگیاں بنائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور تعلیم حکمت کو جس کا دوسرا نام تربیت اور ذہن سازی ہے۔ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے قائم فرمایا اور اپنے رسول کے بنیادی فرائض میں انہیں شمار فرمایا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت ہی بحیثیت مجموعی نبی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کا یہ فریضہ تعلیم وتربیت اب امت ہی پر عائد ہے۔ امت جب تک اس بنیادی فریضہ کو صحیح طور پر نہیں سنبھالے گی، اس وقت تک وہ صحیح معنی میں امت کہلائے جانے کے قابل نہ بنے گی۔ جس کے لئے وہ کتاب وسنت کی رو سے مامور کی گئی ہے۔

ان صریح احکام قرآن وحدیث کے بعد جس کی تائید عقل وفطرت بھی کر رہی ہیں، آخر امت کو اب اور کسی دلیل کا انتظار ہے؟ اور وہ اس کے سوا آخر کون سی حجت چاہتی ہے۔ جو معاذ اللہ کلام خداوندی سے بھی آگے کی ہو۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ''کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے، طے ہو جاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام''۔

مسلمانہ زندگی کے تین بنیادی شعبے...... بہرحال ایک مسلمان کی دینی زندگی کے تین بنیادی شعبے نکل آتے ہیں۔ علم، اخلاق اور عمل، علم نہ ہو تو راستہ ہی نہیں مل سکتا کہ راہ روی ممکن ہو۔ اخلاق نہ ہوں تو عمل کی قوت میسر نہیں آسکتی کہ آدمی راہ مستقیم پر رواں دواں ہو اور عمل نہ ہو تو معطل قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا کہ وہ عزت سے دنیا میں باقی رہے۔

قومی بربادی کے تین اسباب...... اس سے طبعی طور پر کسی قوم کی تباہی اور بربادی کے بھی تین ہی بنیادی اصول نکل آتے ہیں۔ جن سے ایک قوم قعر مذلت میں گر کر دم توڑ دیتی ہے۔ ایک جہالت کہ راستہ ہی دکھائی نہ دے، ایک بدخلقی کہ تہذیب وشائستگی کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جائے اور انسان کی بجائے حیوان بن جائے اور ایک بےعملی کہ ست اقوام کا نتیجہ ہمیشہ ذلت، خواری اور پستی وغلامی نکلا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی ہلاک ہوئی ہے وہ ان ہی تین بنیادی بیماریوں سے ہلاک ہوئی ہے۔

قومی ترقی کے تین وسائل......اس لئے اس کے بالمقابل یہی مذکورہ تین بنیادی اصول ہمیشہ قوموں کے عروج وارتقاء کا راستہ ثابت ہوئے ہیں۔ایک علم نافع جس سے دارین کی ترقی اور سرخروئی کی راہیں نظر آئیں، دوسرے اخلاق حسنہ جن سے ان راہوں پر چلنے کی قوت ملے اور تیسرے عمل صالح جس سے زندگی کی برتری اور عزت ممکن ہو۔اس لئے مسلمان غور کریں کہ وہ ان تین بنیادی معیاروں کے لحاظ سے آج کس مقام پر ہیں؟ وہ قوم جس کے اسلاف میں بزمانہ خلافت فاروقی تجارت تک کا لائسنس بھی اس وقت تک نہیں ملتا تھا۔ جب تک کہ تاجر بیع وشراء کے پورے مسائل اور فقہ دروني سے واقف نہ ہو جائے، چہ جائیکہ عبادات ومعاملات۔

دور حاضر اور ملت اسلامیہ......اسی قوم کے افراد آج پہچانے ہی جاتے ہیں، جہل ونادانی سے انا اللہ آج علاقے کے علاقے اور بستیوں کی بستیاں ہیں، جن میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی آبادی ہے۔لیکن عالم دین کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔اسی لئے جگہ جگہ وہ بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی جہالت سے انہی رسوم ورواج کو دین باور کر کے اپنی دنیا وآخرت خراب کررہے ہیں۔نہ ان میں قابل ذکر طریقہ پر دینی شعور ہے، نہ دنیوی احساس، تمدنی لائنوں میں صنعتی، تجارتی، سیاسی اور اقتصادی شعور سے بھی عامہ بے بہرہ ہیں۔کیونکہ یہ ساری بنیادیں علم سے قائم ہوتی ہیں۔جب علم ہی صفر کے درجہ میں ہو تو یہ بنیادیں کہاں قائم ہوسکتی ہیں اور جب بنیادیں نہ ہوں تو تعمیر اٹھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقوام کی تباہی کی طبعی ترتیب......عملی زندگی میں عامہ منکرات اور فواحش دلوں پر مسلط ہیں۔عمل کی خود ساختہ صورتیں مرغوب ہوگئی ہیں اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی غیر مرغوب۔گویا مرض جہالت کا بحران اس حد پر آچکا ہے کہ ذہن کا ذائقہ ہی بدل چکا ہے، کڑوی چیزیں شیریں محسوس ہونے لگی ہیں اور شیریں چیزیں تلخ، جو نتیجہ ہے پیہم بدعملی کی مشق کا اور جب برے افعال عادت ثانیہ بن جاتے ہیں تو قدرتاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جاتا ہے اور جب اس ترک نصیحت کی بھی عادت جزو نفس ہو جاتی ہے، تو نصیحت بھی پھر برائیوں کی ہونے لگتی ہے اور بھلائیوں سے روکا جانے لگتا ہے اور اس کا قدرتی انجام یہی ہوتا ہے کہ بھلائی برائی نظر آنے لگتے اور برائی بھلائی دکھلانے لگے۔العیاذ باللہ جس سے فہم اور ذوق ہی بدل جاتا ہے اور ایک خاص مزاج اور مخصوص ذوق کی قوم ذوق کے تبدیل ہو جانے پر گو نام کے لحاظ سے وہی پرانی قوم کہلائی جاتی رہے۔لیکن حقیقتاً وہ قوم نہیں رہتی بلکہ کوئی دوسری قوم بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے آج یہی منظر سامنے ہے۔

اور میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام اعضاء بدن کے علمی وعملی فرائض کے ساتھ قلب کو جو فریضہ بخشا گیا ہے۔وہ علم نافع، اخلاق فاضلہ اور افکار صادقہ ہیں۔اگر وہ ان فرائض کو سرے سے ترک کر دیتا ہے تو یہ حرمان ہے اور اگر کچھ دوسرے مصنوعی فرائض اپنے سر لگا لیتا ہے، جس سے اصل فرائض رہ جائیں تو یہ خسران ہے۔آج اگر دیکھا تو دنیا حرمان وخسران دونوں ہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔قلب آج نہ صرف اپنے حقیقی علم کے فرائض سے

محروم ہی ہو چکے ہیں بلکہ علم کے نام سے ایسے معنوی فلسفوں اور ازموں کو انہوں نے اپنے اندر بھر لیا جو علم نما جہل ہیں اور جن سے انسان نہ جاہل ہی رہتا ہے اور نہ عالم ہی بنتا ہے۔ بلکہ جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔

پس آج کا انسان جب کہ اپنے تن خاکی کی حکومت اور اس کے عملہ کو قانون الٰہی سے ہٹ کر لاقانونیت کے ساتھ چلا رہا ہے اور علم کی نعمت کو جہالت سے تبدیل کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو بلاشبہ وہ اپنے کو دارالبوار (جہنم) کا مستحق بناتا جا رہا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ''تو نے نہ دیکھا کہ جنہوں نے بدلا اللہ کے احسان کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جو دوزخ ہے، داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے''۔ ان حالات میں دینی مدارس کا قیام جس طرح اہم واجبات میں سے ہے ایسے ہی ان حضرات کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی بھی اہم فرائض میں سے ہے جو اس دور فتن والحاد میں دینی مدارس لئے بیٹھے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ بھوجپور اس سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے۔ جس کے بانیوں، مدرسوں اور منتظموں نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس علمی درسگاہ کو پھر سے زندہ کیا اور اسے بام عروج پر پہنچانے کی سچی تڑپ اور آرزو لئے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اسی آرزو اور تڑپ کا اثر ہے کہ آج جامعہ اشرفیہ ایک نئی روح کے ساتھ سامنے ہے اور اس میں ارباب کمال جمع ہیں اور اسی قلب کے علم کو اور اس علم سے قلب کو پھر سے زندہ و پائندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ حضرات درحقیقت انہی اسلاف کے اخلاف ہیں۔ جنہوں نے انگریزی تسلط و اقتدار کے وقت جب کہ برطانوی حکومت نے اسلامی علوم وفنون کے سوتے ہر طرف سے بند کر دیئے تھے۔ ان بزرگوں نے اپنی نگاہ دوربین سے مستقبل کا صحیح اندازہ لگا کر آزاد دینی مدارس کا ایک جال ہندوستان میں بچھا دیا تھا، اور اس طرح ناسازگار ماحول میں دین کی ہزاروں شمعیں روشن کر دی تھیں۔ جن کا چاندنا آج تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے آج کتنا بھی ناسازگار ماحول کیوں نہ ہو۔ ان کے اخلاف عزائم اور ہمتیں ہارنے والے نہیں ہیں اور توقع ہے کہ یہ حضرات اسی طرح اسلامی علوم وفنون، اور اسلامی معاشرہ کو جوں کا توں باقی رکھیں گے۔ جس طرح ان کے بزرگوں نے اسے باقی رکھا تھا۔

اگر اب بھی جامعہ اشرفیہ سے فیض و برکات کا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور دوسرے مریضوں کو بھی اس کا راستہ نہ دکھایا جائے تو انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان حضرات کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اس درس گاہ کو علوم قلب کی آبیاری کا وسیلہ ثابت فرمائے۔ علوم نبوت اس سے زندہ ہوں اور سرشاران عمل افراد اس سے ابھر ابھر کر دین کے مناد بنیں اور قوم میں دینی انقلاب آئے اور انجام بخیر ہو۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم ‏‏ روز گارے دریں بسر بردیم

گر نیاید بگوش رغبت کس ‏‏ بر رسولاں بلاغ باشد بس

''وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.''